إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ

"انسان نے کیا سوچا؟" کا دوسرا حصہ
خُدا نے کیا کہا؟
یعنی وہ

جو خدا کی طرف سے نوعِ انسان کے لئے بطورِ نظامِ زندگی عطا ہوا تھا
اور جس سے کاروانِ انسانیت نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور

نام کتاب ——— اسلام کیا ہے؟

مصنف ——— پرویز

شائع کردہ ——— طلوعِ اسلام ٹرسٹ

——— B-25 گلبرگ II لاہور-54660

——— email: trust@toluislam.com

——— web: www.toluislam.com

ایڈیشن اول ——— 1964ء

ایڈیشن ہفتم ——— اپریل 2002ء

طابع ——— دوست ایسوسی ایٹس

مطبع ——— عالمین پریس لاہور

ISBN 969-8164-03-0

طلوعِ اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

فہرست ابواب

اسلام کیا ہے؟

باب	عنوان	صفحہ
۱	دین کی بنیاد	۱
۲	انسانی ذات	۲۱
۳	سرچشمۂ ہدایت	۳۹
۴	عقل اور دین	۵۴
۵	قانون کی کارفرمائی	۸۱
۶	مکافاتِ عمل	۹۱
۷	نجات	۱۰۱
۸	حیاتِ جاوداں	۱۱۰
۹	انسانی ذات کی نشوونما کا اصول	۱۱۷
۱۰	نظامِ ربوبیت	۱۲۷
۱۱	نظامِ ربوبیت کے عقلی دلائل	۱۳۹
۱۲	دین۔ بہ حیثیت سیاسی نظام	۱۴۹
۱۳	قوموں کے عروج وزوال کے ابدی قوانین (تقدیرِ اُمم)	۱۷۷
۱۴	انسان اور خارجی کائنات	۱۹۴
۱۵	مستقل اقدارِ حیات	۲۰۸
۱۶	عورت	۲۳۰

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

(پہلا ایڈیشن)

کچھ عرصہ ہوا، اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں پیش کرنے کے لئے میں نے ایک تصنیفی اسکیم سوچی تھی۔ اور وہ یہ کہ پہلے نہایت غیر جانبدارانہ طور پر بتایا جائے کہ زندگی کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے میں تنہا عقلِ انسانی نے (وحی کی مدد کے بغیر) آج تک کیا کچھ کیا ہے اور کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکی ہے؟ اگر اس نے ان مسائلِ حیات کا اطمینان بخش حل دریافت کر لیا ہو تو پھر کسی اور (فوق العقل) ذریعۂ علم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ لیکن اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی ہو تو پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ فوق العقل سرچشمۂ علم (یعنی وحیٔ خداوندی) نے، جو اب اپنی حقیقی شکل میں قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے، ان مسائل کا حل کیا بتایا ہے۔ چنانچہ اس اسکیم کے تحت اس سلسلہ کی پہلی کڑی "انسان نے کیا سوچا" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی جس میں حکمائے یونان سے لے کر عصرِ حاضر کے مفکرین، مؤرخین اور سائنس دانوں کی تحقیقات پیش کر کے، یہ دکھایا گیا تھا کہ اس قدر کدّ و کاوش کے باوجود وہ کس طرح اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ زندگی کے اہم مسائل کا حل دریافت کر لینا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی اگلی کڑی سامنے آنی تھی جس کا نام ——— "خدا نے کیا کہا" تجویز کیا گیا تھا۔ اس دوران میں، اکثر احباب کی طرف سے کہا گیا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک خود مکتفی کتاب میں یہ بتایا جائے کہ اسلام ہے کیا، کیونکہ اس باب میں متعیّن طور پر کہیں سے کچھ نہیں ملتا، اور (غیر مسلم تو ایک طرف) خود مسلمانوں کے سامنے بھی دین کا واضح تصوّر نہیں ہے۔ اس قسم کی کتاب کا خود مجھے بھی شدت سے

احساس تھا اور میرا خیال تھا کہ اس سلسلہ سے فارغ ہونے کے بعد' اس جدید کتاب کی طرف توجہ دوں گا لیکن جب میں نے "خدا نے کیا کہا" کو ترتیب دینا شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو یہ وہی تصنیف بن سکتی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے. چنانچہ میں نے اس کتاب کی ترتیب پر از سرِ نو غور کیا اور اسے اس انداز سے لکھنا شروع کیا جس سے یہ ایک طرف "انسان نے کیا سوچا" کی دوسری کڑی قرار پا جائے اور دوسری طرف خود مکتفی کتاب بن جائے جسے یہ کہہ کر پیش کیا جا سکے کہ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ــــــــــ اسلام کیا ہے. چنانچہ یہ کتاب پیشِ خدمت ہے. اس میں بعض مقامات پر مغربی مفکرین کے ان اقوال کا پیش کرنا ضروری سمجھا گیا جنہیں "انسان نے کیا سوچا" میں درج کیا گیا ہے. ان مقامات پر بجائے اس کے کہ یہ کہہ دیا جاتا کہ ان اقتباسات کو اس کتاب میں دیکھا جائے' انہیں پورے کا پورا درج کر دیا گیا ہے تاکہ زیرِ نظر موضوع فی ذاتہٖ مکمل ہو جائے.

ہمارا یہ دعوٰی ہے (اور یہ دعوٰی ہمارے ایمان پر مبنی ہے) کہ اسلام' خدا کی طرف سے عطا شدہ' آخری اور مکمل دین ہے جو نوعِ انسان کی تمام مشکلات' یعنی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے لیکن جب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ اسلام کیا ہے' تو اس کے جواب میں مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں اور جب ان آوازوں کو یکجا کیا جائے تو ان کا ماحصل نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا. اب ظاہر ہے کہ جس اسلام کا تصور صرف اس قدر ہو' وہ (تمام نوعِ انسان' کی مشکلات تو ایک طرف' خود) مسلمانوں کی مشکلات کا حل بھی پیش نہیں کر سکتا. اسلام ایک نظامِ زندگی ہے' جس کی بنیادیں چند محکم اور غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں. جب تک یہ بنیادی تصورات' واضح' غیر مبہم اور متعین طور پر سامنے نہ آئیں' یہ سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ وہ نظامِ زندگی ہے کیا جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو زندگی کے اہم مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے. زیرِ نظر کتاب میں' میں نے انہی تصورات کو پیش کیا ہے.

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان تصورات کی' جنہیں اسلام کی بنیاد کہہ کر پیش کیا گیا ہے' سند کیا ہے؟ اس سوال کا جواب آسان ہے. قرآنِ کریم' اسلام کا ضابطۂ قوانین ہے. دین اس کے اندر مکمل اور محفوظ کر دیا گیا ہے. لہٰذا' اسلامی تصورات وہ ہیں جن کی سند قرآنِ کریم سے مل جائے. میں نے ان تصورات کو اپنی بصیرت کے مطابق' قرآن ہی سے اخذ کیا ہے اور انہیں قرآنی سندات کے ساتھ پیش کیا ہے. یہ ہو سکتا

ہے کہ قرآن کریم کے کسی مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے میں میری بصیرت غلطی کر گئی ہو، (اس لئے کہ یہ بہرحال ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا امکان ہے) لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ میں نے کسی غیر قرآنی تصور کو دانستہ قرآنی کہہ کر پیش کر دیا ہو۔ ایسا کرنا میرے نزدیک شرک ہے جس سے بڑا جرم خدا کی عدالت میں اور کوئی نہیں۔

جیسا کہ میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آ رہا ہوں' اسلام' دین ہے، مذہب نہیں۔ اور دین اور مذہب میں جو بنیادی فرق ہے اسے میں نے مختلف مواقع پر بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس مقام پر اس قدر سمجھ لینا کافی ہو گا کہ خدا کے رسول، دین کو اس کی اصلی شکل میں وحی کے ذریعے پیش کرتے تھے۔ ان کے بعد' ان کے نام لیوا' اس دین میں تحریف کر دیتے تھے ـــــ اکثر' اپنی مفاد پرستیوں کے لئے' دیدہ دانستہ۔ لیکن بعض نادانستہ طور پر بھی ـــــ دین کی اس محرّف صورت کو مذہب کہا جاتا ہے۔ انبیائے سابقہ کی طرف سے پیش کردہ دین کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا اور اسے بھی اس کے نام لیواؤں نے' رفتہ رفتہ دین کی بلند سطح سے نیچے اتار کر مذہب بنا دیا۔ مذہب بن کر' اسلام ایک جیتے جاگتے' متحرک' اور کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والے نظامِ حیات کے بجائے چند بے جان عقائد اور بے روح رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہی نہیں ہوا کہ اس مذہب کی پرستار قوم' زندگی کی تمام خوشگواریوں سے محروم ہو گئی' بلکہ خود انسانیت کا کارواں صحیح راستے پر نہ چل سکا (جب دین کی مشعل ہی اس کے سامنے نہ آئی تو وہ صحیح راستے پر چل کیسے سکتا تھا)۔ یہ وجہ ہے کہ آج تمام اقوامِ عالم' اضطراب انگیز اور سکون سوز جہنم کے عذاب میں مبتلا ہیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا۔

اگرچہ اسلام کو اس کے نام لیواؤں نے (دانستہ یا نادانستہ) مذہب میں تبدیل کر دیا لیکن اس میں اور مذاہبِ عالم میں ایک بنیادی فرق ہے ـــــ اور یہی وہ فرق ہے جس سے کاروانِ انسانیت کو صحیح راستہ مل جانے کی امید ہو سکتی ہے۔ بلکہ یقینی ہے ـــــ وہ فرق یہ ہے کہ دینِ اسلام کا ضابطۂ قوانین ـــــ قرآن کریم ـــــ اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں انسان کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا' یہ جب چاہیں اس مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

میری حقیر سی کوشش یہی رہی ہے (جس میں' میں گذشتہ پچیس تیس برس سے مسلسل مصروف ہوں) کہ دینِ خداوندی سے غیر قرآنی عناصر کو الگ کر کے' اسے پھر اس کی حقیقی اور منزّہ شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر سکوں' تاکہ اس سے خود امتِ مسلمہ اپنا کھویا ہوا مقام از سرِ نو حاصل کر سکے اور کاروانِ انسانیت زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہو سکے۔ زیرِ نظر کتاب بھی میری اسی کوششِ ناتمام کی ایک کڑی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس کتاب کو' ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ (مذہب گزیدہ) طبقہ کے ہاتھوں میں دے دیا جائے تو وہ' دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ' علیٰ وجہ البصیرت

اسلام کے گرویدہ ہوسکتے ہیں۔ نیز اگر اسے غیر مسلموں تک پہنچا دیا جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دُور ہوسکتی ہیں. جہاں تک ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تعلق ہے، انہیں ہم ایک طرف آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت، ہیگل کا فلسفۂ تاریخ، فرائڈ کا علم النفس اور دہائٹ ہیڈ کی فلاسفی پڑھاتے ہیں، اور دوسری طرف، اسلامیات میں انہیں وہی توہم پرستی پر مبنی پارینہ داستانیں، بے مقصد رسوم اور بے روح عقائد کی تعلیم دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے انہیں دین کی حقانیت کا قائل کر دیا اور یہ پکے مسلمان بن جائیں گے. اس سے وہ "پکے مسلمان" تو بننے سے رہے، البتہ اسلام کے متعلق ان کے شکوک و شبہات ضرور پکے ہو جاتے ہیں. ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں پیش کر کے انہیں بتایا جائے کہ جس مقام تک پہنچ کر انسانی فکر رُک جاتی ہے، دین انہیں اس مقام سے کس طرح آگے لے جاتا ہے.

جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے، اسلام کے متعلق ان کا علم، ہماری اُن قدیم کتابوں پر مبنی ہوتا ہے جن میں ہر قسم کی رطب ویابس روایات اور بعید از علم و عقل خرافات درج ہوتی ہیں. چونکہ ہم نے ان کتابوں کو تقدیس کا درجہ دے رکھا ہے اس لئے وہ اسلام کے لئے سند قرار پا چکی ہیں. ان کتابوں سے حاصل شدہ اسلام یقیناً ایسا ہوگا جس سے ہر صاحبِ فکرِ سلیم دُور رہے گا. ان لوگوں کے سامنے، قرآن کریم کا عطا کردہ اسلام پیش کیجئے اور پھر دیکھئے وہ کس طرح اس کے سامنے سر جھکا دینے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں. میں نے اس کا تجربہ کر کے دیکھا ہے.

مجھے امید ہے کہ میری یہ کوشش اس مقصد کو پورا کرنے میں کامیاب ثابت ہوگی. آخر میں میں ان الفاظ کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں جو میں نے ـــــ "انسان نے کیا سوچا" ـــــ کے اخیر میں لکھے تھے، کہ

> اگر میری ان کوششوں سے چند نفوس بھی ایسے پیدا ہو گئے جن کے دل میں قرآن کی راہ نمائی کا یقین علیٰ وجہ البصیرت اُبھر آیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزیوں اور جگر سوزیوں کا صلہ مل گیا۔

پرویز

۲۵، بی، گلبرگ ۲۔ لاہور.

(ستمبر ۱۹۶۴ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بابِ اوّل
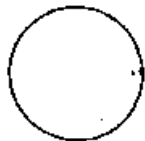
دین کی بنیاد

آپ تاریخِ انسانی کے کسی دَور سے گزریئے اور دنیا کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو ہر مقام، ہر قوم اور ہر زمانے میں بطور قدرِ مشترک ملے گی۔ یعنی لوگوں نے کوئی نہ کوئی ہستی (کوئی محسوس چیز یا غیر مرئی و غیر محسوس تصوّراتی قوّت) ایسی تجویز کر رکھی ہوگی جس کے سامنے وہ جھکتے ہوں۔ جس کی پرستش کرتے ہوں۔ جس کے غصّے اور ناراضگی سے ڈرتے ہوں اور جس کی خوشنودی کو اپنے لئے وجہِ برکت و سعادت سمجھتے ہوں۔ متمدّن اقوام اور مہذب ممالک تو ایک طرف، اگر آپ کسی ایسے جزیرے میں چلے جائیں جہاں اس سے پہلے (تاریخ کی یادداشت میں) کسی باہر کے آدمی نے قدم تک نہ رکھا ہو، تو وہاں کی آبادی، دیگر امور میں خواہ دوسرے انسانوں سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہو، اس قدرِ مشترک میں وہ بھی

مذہب کی عالمگیریّت

ان کی برابر کی شریک ہوگی۔ مشہور یونانی مؤرّخ پلوٹارک (م سنہ ۱۰۲ء) نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

> زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں۔ ایسے بھی جہاں نہ محلّات ہیں نہ خزانے۔ نہ ورزش گاہیں ہیں نہ تھیٹر۔ لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں۔ جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں۔ جہاں منّتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ جہاں پیشگوئیاں نہ کی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

انسان کی اسی ذہنیت یا روش کو جس میں اس نے اپنے لئے کسی "شے" (یا قوّت) کو پرستیدہ (OBJECT OF

(WORSHIP کی حیثیت دے رکھی ہو' عام طور پر مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن مذہبی جذبہ یا تصوّر کی اس عالمگیریت کے باوجود یہ حقیقت کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ آج تک یہ متعیّن نہیں ہو سکا کہ مذہب کسے کہتے ہیں۔ عوام تو درکنار' دنیا کے بڑے بڑے مفکرّین' مؤرّخین اور مصنّفین نے مذہب کی تعریف (DEFINITION) متعیّن کرنے میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے' لیکن ان میں سے کسی کی بیان کردہ تعریف نہ تو کسی دوسرے کی تعریف سے ملتی ہے اور نہ ہی کوئی ایسی جامع تعریف وضع کی جا سکتی ہے جو مذہب کے تمام متنوّع تصوّرات کو پوری طرح محیط ہو۔

مذہب کی تعریف

مثلاً کانٹ کے نزدیک "ہر فریضہ کو خدائی حکم سمجھنا" مذہب ہے FRIEDRICH SCHIELERMAEHER کے خیال میں "ہر انفرادی شے کو ایک عظیم کل کا جزو سمجھنا اور ہر محدود شے کو لامحدود کا نمایندہ قرار دینا" مذہب ہے۔ (HOFFDING) کے نزدیک مذہب "اقدار کی مداومت" کا نام ہے۔ ولیم جیمز کہتا ہے کہ انفرادی اشخاص کے عالمِ تنہائی کے وہ جذبات' اعمال اور تجربات جن کی بابت وہ سمجھیں کہ ان کا رشتہ اس شے سے ہے جسے وہ اپنی دانست میں خدا کہتے ہیں' مذہب کہلاتے ہیں۔ کے نزدیک "انسان نے اس قوت کا نام مذہب رکھ لیا ہے جس کے متعلق اس نے یہ عقیدہ پیدا کر لیا ہے کہ اس کے زور سے وہ کائنات کو مسخر کرلے گا"۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ A.N. WHITEHEAD نے مذہب کے متعلق مختلف مقامات پر مختلف تصریحات کی ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "انسان جو کچھ اپنی ذات کی تنہائی سے کرتا ہے مذہب ہے۔" دوسری جگہ کہتا ہے کہ "مذہب عقیدہ کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان کو اندرونی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے"۔ ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ "مذہب عالمگیر وفاشعاری WORLD-LOYALTY کا نام ہے"۔ وہ اپنی تصنیف (SCIENCE AND THE MODERN WORLD) میں مذہب سے متعلق تصوّر کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتا ہے جہاں وہ لکھتا ہے کہ

> مذہب اُس شے کا تصوّر ہے جو انسان کے آگے پیچھے اور اس کے اندر ہے۔ وہ شے جو ہر سامنے کی چیز میں سے گزر رہی ہے۔ وہ شے جو حقیقت ہے لیکن حقیقت بننے کے لئے منتظر بھی ہے۔ وہ شے جو ایک بعید سا امکان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے پیشِ نظر حقائق میں سب سے عظیم حقیقت بھی۔ وہ شے جو ہر چیز میں مفہوم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہ اس کا احاطہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شے جس کا پالینا زندگی کا آخری مقصود ہے لیکن جسے ہر کوئی پا نہیں سکتا۔ وہ شے جو آخری مطمحِ نگاہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کوشش ناکام بھی۔

ڈاکٹر گیلووے (GEORGE GALLOWAY) اپنی کتاب (THE PHILOSOPHY OF RELIGION) میں لکھتا ہے۔

جب ہم مذہبی شعور کے نفسیاتی عناصر، اور جس انداز سے وہ عمل پیرا ہوتے ہیں، اس کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "مذہب" کی بعض تعریفیں ناتمام بھی ہیں اور یک طرفہ بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب کے کسی ایک درجہ پر تو ان کا اطلاق ہوسکتا ہے لیکن دیگر مدارج پر نہیں ہوسکتا۔ یا یہ کہ وہ مذہب کے بعض اہم گوشوں کو نظرانداز کر دیتی ہیں۔ میکس مُلر نے مذہب کے متعلق کہا ہے کہ "یہ ایک ایسی ذہنی صلاحیت ہے جس سے انسان غیر محدود (قوت) کا ادراک کرسکتا ہے"۔ لیکن ظاہر ہے کہ مذہب کی یہ تعریف، قدیم زمانے کے مذاہب پر راست نہیں آئے گی۔ دوسری طرف نشوونما یافتہ مذاہب کی کتنی ہی باتیں ہیں جن کو یہ محیط نہیں۔ پروفیسر ٹیلر نے مذہب کی تعریف ان مختصر الفاظ میں بیان کی ہے۔ یعنی "روحانی ہستیوں پر ایمان"۔ یہ تعریف اگرچہ مذہب کے بہت سے گوشوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ لیکن پھر بھی بہت کچھ اس دائرے باہر رہ جاتا ہے۔ پروفیسر مینزیز کی تعریف اس سے زیادہ جامع ہے۔ یعنی "احتیاج کے احساس سے روحانی ہستیوں کی پرستش"۔ اس کے برعکس جب ہافڈنگ کہتا ہے کہ مذہب سے مراد "اقدار کے تحفظ وارتکاز پر ایمان" ہے، تو اس سے مذہب کی غایت کے متعلق ایک فلسفیانہ تصور سامنے آتا ہے۔ عملی زندگی سے اس کا کیا تعلق ہے اس کی بابت کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ (صفحہ ۱۸۰)

اس کے بعد وہ، اپنی (DEFINITION) ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"انسان کا ایک ایسی قوت پر ایمان جو اس سے خارج میں اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے جذباتی تقاضوں کی تسکین اور زندگی کا استحکام چاہتا ہے۔ اور وہ اپنے اِس ایمان کا مظاہرہ پرستش وغیرہ کی رو سے کرتا ہے۔"

ان چند مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ مذہب کے متعلق مختلف تعریفیں ایک دوسرے نہیں ملتیں، کوئی ایک تعریف بھی نہ ایسی جامع ہے جو اس ضمن میں مختلف تصورات اپنے آغوش میں لئے ہو اور نہ ایسی واضح کہ جس سے بات سمجھ میں آسکے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہور روسی مفکر اوسپنسکی (P.D. OUSPENSKY) نے (اپنے استاد، روس کے صوفی، گرجیف) (G. GERDJIEFF) کی زبان سے کہا ہے کہ

مذہب ایک انسانی تصور ہے۔ جس قسم کی انسان کی اپنی سطح ہوگی اسی قسم کا اس کا مذہب ہوگا۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کا مذہب دوسرے آدمی کے لئے قطعاً موزوں نہ ہو۔

مذہب کے متعلق ان مختلف تصوّرات کو یکجا کیا جائے تو بہ ہیئتِ مجموعی ان میں ایک ایسا تصوّر نکل آئے گا جسے قدرِ مشترک قرار دیا جاسکے یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت کا تصور (جسے عام طور پر "خدا" کہا جاتا ہے) اگرچہ ایسے مذاہب بھی ہیں جو خدا کے بھی قائل نہیں۔

قدرِ مشترک

لیکن جو دشواری مذہب کی تعریف کے متعلق پیش آتی ہے اس سے کہیں زیادہ دشواری خدا کی تعریف (DEFINITION) کے سلسلے میں سامنے آتی ہے۔ اس باب میں بھی کسی مفکر کا تصور دوسرے سے نہیں ملتا۔ مثلاً کانٹ کے نزدیک "خدا وہ ہے جو انسانوں کو اخلاقی ضابطہ دیتا ہے"، ولیم جیمز خدا کو "کائنات کا حصّہ اعلیٰ" قرار دیتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ "خدا اس قوت کا نام ہے جو خیر کا سبب ہے"۔ سر جیمس جینز کے نزدیک "خدا سب سے بڑا ریاضی دان ہے"۔ برگساں کے نزدیک (اس کے ابتدائی ایام میں) خدا سے مفہوم "تخلیقی توانائی" تھا۔ لیکن آخر میں اس پر باطنیت (MYSTICISM) غالب آگئی تو اس نے کہا کہ "خدا محبت ہے اور محبوب"۔ ان چند مثالوں سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ (مذہب کی طرح) "خدا" کے صحیح تصور کے متعلق بھی مفکرین کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ان میں سے ہر ایک کا تصوّر الگ اور تعریف (DEFINITION) جداگانہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جب یہ لوگ خدا کے متعلق بات کرتے ہیں تو یہ بات خدا کے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس تصور کے متعلق ہوتی ہے جو یہ خدا کے متعلق اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کے ذہن کا تراشیدہ تصوّر الگ ہوتا ہے اس لئے ایک کا تصور دوسرے سے نہیں مل سکتا۔ آئن سٹائن کے الفاظ میں "ایک فرد اور دوسرے فرد کا خدا جداگانہ ہوگا۔ حتّٰی کہ ایک فرد کے احساسات و جذبات کی مختلف حالتوں میں بھی اس کا خدا مختلف ہوگا۔ ہر انسان اپنے جذبات کے تعمیر کردہ مندر کا پجاری ہے"۔

خُدا کا تصوّر

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا (یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت) کا خیال پیدا کیسے ہوا، مغرب کے علمائے عمرانیات کا (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک) یہ خیال تھا (اور اب بھی وہاں اس خیال کے مؤید لوگ ملتے ہیں کہ) جب ابتدائی دَور کے انسان نے (جب اس کا شعور ہنوز عہدِ طفولیت میں تھا) یہ دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں جن کے علل و اسباب کا اسے کوئی پتہ نہیں چلتا (مثلاً بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، طوفانِ باد و باراں، زلزلے، وبائی امراض وغیرہ) تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو ان حوادث کے پیچھے کوئی بڑی بڑی قوتیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ اس سے اس کے ذہن میں "خدا" (دیوی، دیوتاؤں) کا تصوّر پیدا ہوا۔ یہ تصوّر مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے احوال و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اور انسانی ذہن میں پختگی آتی گئی اس تصوّر میں بھی جِلا اور لطافت پیدا ہوتی گئی۔ اس طرح بتدریج "خدا"

ارتقائی "خدا"

کا وہ تصور وجود میں آگیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو "خدا کا ارتقائی تصور" کہا جاتا ہے۔ تفصیل (مثلاً) گرانٹ ایلن (GRANT ALLEN) کی کتاب THE EVOLUTION OF THE IDEA OF GOD یا فریزر (SIR JAMES GEORGE FRAZER) کی (GOLDEN BOUGH) وغیرہ میں ملے گی۔

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا غیر محل نہیں ہوگا کہ بعد کے محققین نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے اور کہا ہے کہ خدا کا جو تصور بلند مذاہب میں پایا جاتا ہے وہ ارتقائی طریق سے BY PROCESS OF EVOLUTION اس مقام تک نہیں پہنچا، وہ شروع سے ایسا ہی تھا۔[1] چنانچہ عصرِ حاضر کا مشہور مؤرخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی (DR. ARNOLD TOYNBEE) اس بارے میں لکھتا ہے:

> پروفیسر شمٹ کی تحقیق یہ ہے کہ خدا کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے انہوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مذہب یہی تھا جس کا احیار بلند مذاہب نے کیا ہے۔

پروفیسر پادری شمٹ SCHMIDT کی جس کتاب سے ڈاکٹر ٹوئن بی نے مذکورہ صدر نتیجہ پیش کیا ہے وہ اس موضوع پر مستند تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس میں اُس نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے کہ انسان کے ابتدائی تمدن میں جس بلند ہستی کا تصور پایا جاتا ہے وہ وہی تصور تھا جو توحید کے علمبردار مذاہب کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ نسلِ انسانی کے قدیم ترین قبائل میں سے اکثر کی نسبت یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خدا کے متعلق ان کا یہی تصور تھا۔ لہٰذا ارتقائی مذہب کا تصور اب عمرانیات کے میدان میں دیوالیہ ہو چکا ہے۔

بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ (علمائے عمرانیات کے خیال کے مطابق) ذہنِ انسانی میں "خدا" کا خیال ان وقائع و حوادث کی بنا پر پیدا ہوا جن کی کوئی علت یا سبب ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس دَور کے انسان کو ان واقعات و حوادث کی تباہ انگیزیوں کا اکثر و بیشتر سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اور (چونکہ ابھی اس نے اشیائے فطرت کی تسخیر کا علم حاصل نہیں کیا تھا اس لئے) وہ ان حوادث کے سامنے اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتا تھا۔ ان کے نقصانات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں اس کے سوا کچھ آ نہیں سکتا تھا کہ وہ ان کے حضور گڑگڑائے۔ ان کے سامنے جھکے۔ انہیں سجدہ کرے

عہدِ پرستش

اور یوں ان کے غصے کو خوشنودی سے بدلنے کی کوشش کرے۔ اسی کو "پرستش" کہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پہلا دَور (ان علماء کے خیال کے مطابق) عہدِ پرستش AGE OF WORSHIP تھا۔ اس کے

---

[1] جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خدا کا جو تصور وحی کی رُو سے دیا گیا تھا وہ شروع سے اخیر تک ایک ہی تھا۔ جب وحی میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو گئی تو خدا کے تصور میں بھی تبدیلی آگئی۔ اب خدا کا صحیح تصور صرف وہاں سے مل سکے گا جہاں وحی میں انسانی خیالات کی آمیزش نہ ہوئی ہو یعنی قرآن سے۔

بعد جب ان میں کچھ "سیانے" پیدا ہو گئے (انہی سے پیشوائیت یا PRIESTCRAFT کی INSTITUTION کا آغاز ہوتا ہے)، تو انہوں نے کہا کہ ان بپھری ہوئی قوتوں کے جوشِ غضب سے بچنے کا طریق ان کے سامنے جھکنا اور گڑگڑانا نہیں۔

عہدِ سحر

ہم تمہیں ایسے "عمل" بتاتے ہیں جن سے یہ قوتیں مجبور ہو کر تمہارے حسبِ منشا کام کرنے لگ جائیں چنانچہ اس طرح ان منتروں جنتروں کا وجود عمل میں آیا جنہیں سحر یا جادو کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ علماء اس دَور کو AGE OF MAGIC کہتے ہیں۔[1]

اس سے آگے بڑھیے تو انسانی تمدّن نے بادشاہت کا ادارہ وضع کیا۔ اس کی رُو سے ایک شخص اتنی بڑی قوتوں

دَورِ ملوکیت

کا مالک بن جاتا (یا اسے ایسی قوتوں کا حامل سمجھ لیا جاتا) کہ اس کا ہر حکم اٹل اور ہر فیصلہ ناطق قرار پاتا۔ وہ غصّے میں آتا تو بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر دیتا۔ خوش ہوتا تو گاؤں کے گاؤں انعام میں بخش دیتا۔ نہ اس کے خوش ہونے کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر تھا[2] نہ ناراض ہونے کے لئے کوئی سبب اور علت۔ سعدیؔ کے الفاظ میں بادشاہوں کی کیفیت یہ تھی کہ "گاہ بہ سلامے برنجند و گاہ بہ دشنامے خلعت بہ بخشند"۔ انہیں خوش کرنے (اور خوش رکھنے) کے لئے ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے۔ ان کے حضور سجدے کئے جاتے۔ نذرانے پیش کئے جاتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صاحبِ قوّت و جبروت ہستی تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی بارگاہ تک پہنچنے کی راہ میں سینکڑوں حاجب و دربان ایستادہ رہتے۔ لہٰذا عوام ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتے اور سفارشیں ڈھونڈتے۔ اس کے لئے کبھی ان کے دربانوں کی منتیں کرنی پڑتیں۔ کبھی ان کے مقرّبین کو رشوتیں دے کر آمادہ کیا جاتا کہ وہ کسی مناسب موقع پر (جب بادشاہ سلامت کا مزاج MOOD اچھا ہو) ان کی درخواست ان کے حضور پیش کر دیں۔ بادشاہ کی ان بے پناہ قوّتوں کے پیشِ نظر بعض لوگ خود اسے ہی "خدا" تسلیم کر لیتے۔ لیکن بعض کہتے کہ خدا ان تمام تضمنات و لوازمات کے ساتھ اسی ہیئت میں آسمانوں کے اوپر بیٹھا ہے۔ اور بادشاہ زمین پر اس کا سایہ ہے۔ اس طرح ذہنِ انسانی

مارکس کا نظریہ

میں خدا کا تصوّر ایک مطلق العنان، مستبد حاکم (راجہ یا سلطان یا بادشاہ) کے تصوّر کے مطابق قائم ہو گیا۔ مارکس وغیرہ کا خیال ہے کہ عوام کے ذہن میں خدا کا یہ تصوّر از خود قائم ہو گیا بلکہ اس طبقے نے جس نے دولت اور اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا پیشوائیت کی مدد سے اس تصوّر کو عوام کے ذہن میں خاص

---

[1] دیکھئے FRAZER کی کتاب GOLDEN BOUGH جو MAGIC AND RELIGION کا ایک حصہ ہے۔

[2] اس دَور کا انسان ابھی قانون LAWS کے تصوّر سے آشنا نہیں تھا۔ نہ اسے کائناتی قوانین کا علم تھا نہ انسانی دنیا میں قانون کا تصوّر اس کے ذہن میں آ سکتا تھا۔

طور پر راسخ کیا تاکہ ان کی مفاد پرستیوں VESTED INTERESTS کو الوہیاتی سند DIVINE AUTHORITY حاصل ہو جائے۔ اور اس طرح محنت کش طبقہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائے۔ بہرحال حقیقت یہ ہو یا وہ۔ یہ واقعہ ہے کہ ذہنِ انسانی اُس وقت سے اِس وقت تک خدا کے تصوّر کے متعلق اس قسم کی بھول بھلیوں میں کھویا ہوا ہے جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں آتا۔ واضح رہے کہ اس وقت تک خدا کی پرستش کے متعلق ہم نے جو گفتگو کی ہے وہ اس کے اس تصوّر کے متعلق ہے جو ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس مقام پر کہہ دیا جائے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بلند مذاہب میں بھی (جن کا دعوٰے ہے کہ ان کی تعلیم ذہنِ انسانی کی تخلیق نہیں بلکہ وحی پر مبنی ہے) خدا کا تصوّر کچھ اسی قسم کا پایا جاتا ہے۔ لیکن مختلف مذاہبِ عالم میں؎ وحی کی تعلیم میں انسانی خیالات، تصوّرات، نظریات اور معتقدات کی آمیزش اس حد تک ہو چکی ہے کہ ان کے ہاں اصلی اور وضعی کی تمیز ہی باقی نہیں رہی۔ نہ ہی ان کے پاس اب کوئی ایسا معیار ہے جس کی رُو سے وہ خالص وحی کی تعلیم کو انسانی تصورات سے الگ کر سکیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف خود ان مذاہب کے علماء اور پیشواؤں کی طرف سے کھلے بندوں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے آج کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا (نہ کر سکتا ہے) کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہتے ہیں وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر کو ملی تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ان کتابوں میں خدا کا جو تصوّر سامنے آتا ہے وہ اس تصوّر سے ملتا جلتا ہے جو ذہنِ انسانی نے وضع کیا تھا۔

اسلام میں خُدا کا تصوّر

اس تمہید کے بعد ہم اسلام کی طرف آتے ہیں۔ واضح رہے کہ جب ہم اسلام کے متعلق بات کریں گے تو اس کے لئے ہماری سند قرآنِ مجید ہو گی۔ اور قرآن کے متعلق یہ حقیقت اپنوں اور بیگانوں، سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ یہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے نبیِّ اکرم (صلعم) نے (خدا سے بذریعہ وحی پاکر) اُمّت کو دیا تھا۔

قرآن، خدا کے متعلق بات کرنے سے پہلے انسان کے متعلق بات کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی کے دو تصوّر ہیں۔ ایک وہ جسے مادی تصوّرِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ اس تصوّر کی رُو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسان عبارت ہے اس کے طبیعی جسم PHYSICAL BODY سے جو طبیعی قوانین کے مطابق وجود میں آتا ہے۔ انہی قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل رہتا ہے اور انہی کے مطابق آخر الامر ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح انسانی جسم کے انتشار DISINTEGRATION سے انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصوّرِ حیات کی رُو سے

؎ اس اجمال کی تفصیل میری کتاب "مذاہبِ عالم کی مہینہ آسمانی کتابیں" میں ملے گی۔

مادی تصورِ حیات

انسان کو نہ خدا کے ماننے کی ضرورت پڑتی ہے نہ کسی خارجی رہنمائی کی احتیاج۔ انفرادی طور پر جسم کی پرورش طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ جو شخص ان قوانین کا اتباع کرتا ہے اس کی صحت اور توانائی اچھی رہتی ہے۔ جو اِن کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ بیمار اور کمزور ہو جاتا ہے۔ ان امراض کا ازالہ بھی قوانینِ طبیعی کی رُو سے کیا جا سکتا ہے۔ جب اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں (یا کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے) تو اسے موت آجاتی ہے۔ اور معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ باقی رہی اس کی اجتماعی زندگی، سو اس کے لئے عقل اور تجربہ کی روشنی میں ایسے قواعد و ضوابط مرتب کئے جا سکتے ہیں جن کے مطابق (مختلف افراد پر مشتمل) قوم کی پرورش ہوتی رہے۔ اس کے مفاد محفوظ رہیں اس کی توانائیاں نہ صرف قائم رہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوتا چلا جائے (تاکہ وہ ان اسباب و حوادث کا مقابلہ کر سکے جو اس کے درپئے تخریب ہوں) ایسے قوانین کے وضع اور مرتب کرنے میں ان کے پیشِ نظر صرف ایک معیار ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے ذریعے ان کی اجتماعی قوت و سطوت برقرار رہے، اور ان کے غلبہ و تسلّط میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ انسانی قوانین کی تشکیل میں بھی قومی مصلحت، بنیادی جذبہ ہوگا اور ان میں تغیّر و تبدّل بھی اسی نقطہ کے مطابق عمل میں آتا رہے گا۔ اس کے لئے نہ خدا کی ضرورت ہے نہ اس کی طرف سے کسی رہنمائی کی حاجت۔ قرآنِ کریم اس زندگی کو حیوانی سطح ANIMAL LIFE کی زندگی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲)

جو لوگ (زندگی کی بلند حقیقت سے) انکار کرتے ہیں وہ حیوانوں کی طرح متاعِ حیات سے فائدہ اٹھاتے اور کھاتے پیتے ہیں۔

وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ ان لوگوں کا مطمحِ نگاہ اور مقصدِ حیات صرف اپنی مفاد پرستیوں کے جذبات کا اِتباع ہوتا ہے۔ ان کی عقل و فکر بھی صحیح کام دینے کے بجائے ان کے جذبات کی لونڈی اور ان کے مقاصد کے بروئے کار لانے کا آلہ کار بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۙ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵/۴۳-۴۴)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ تو ایسے شخص کی نگرانی کیسے کر سکتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہیں؟ (بالکل نہیں) یہ لوگ (انسان نہیں) حیوان ہوتے ہیں، بلکہ ان سے زیادہ راہ گم کردہ۔

یہ لوگ اگر اس حقیقت کا اقرار بھی کریں کہ خارجی کائنات کا عظیم سلسلہ خدا کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے تو بھی قرآن اُسے خدا پر ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ انہی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ؀ (۲۹/۶۱)

اگر تو ان سے پوچھے کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تو یہ کہہ دیں گے کہ اللہ کے قوانین کی۔

ان سے پوچھو کہ جب تم خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کی کارفرمائی کا اقرار کرتے ہو تو انسانی دنیا میں اس سے کیوں انکار کرتے ہو (تمہارے ذہن میں وہ کون سا مقام آجاتا ہے) جہاں تم الٹے پھر جاتے ہو۔

یہ وہ لوگ ہیں جو

قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (۴۵/۲۴)

کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ہم (طبیعی قوانین کے مطابق) مرتے اور زندہ رہتے ہیں اور مرورِ زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

یہ ہے ایک تصوّرِ حیات جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ یہ محض ظن و قیاس پر مبنی ہے۔ علم و حقیقت پر نہیں (۴۵/۲۴)۔
دوسرا تصوّرِ حیات وہ ہے جس کی رُو سے مانا جاتا ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور

قرآنی تصوّرِ حیات

چیز بھی ہے جسے انسانی ذات PERSONALITY نفس SELF انا یا خودی ⁽¹⁾ کہتے ہیں۔ (قرآن میں اس کے لئے نفس کا لفظ آیا ہے اور اسے روحِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ قرآن میں انسان کی پیدائش کے سلسلے میں کہا گیا ہے۔ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ خدا نے انسانی تخلیق کے سلسلے کی ابتدا بے جان مادے سے کی۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ پھر اسے مختلف ارتقائی منازل سے گزارتے ہوئے اس مقام میں لے آیا جہاں اس کی نسل کی افزائش بسلسلۂ تولید ہونی تھی۔ اس مقام تک انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ثُمَّ سَوّٰهُ۔ پھر اس نے اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے اس میں خاص اعتدال و تناسب پیدا کیا۔ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ اور اس میں اپنی توانائی کا ایک شمہ ڈال دیا۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۭ اور (اس طرح) تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر کے اس قابل بنایا کہ تم مختلف علوم حاصل کر سکو۔ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ؀ (۳۲/۹-۷) لیکن تم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو ان قوّتوں اور صلاحیتوں کا صحیح

استعمال کرتے ہیں.

اس مقام پر قرآن نے بتایا ہے کہ سلسلۂ ارتقاء ORGANIC EVOLUTION کی سابقہ کڑیوں میں انسان بھی دیگر حیوانات کی سطح پر تھا. جب یہ آگے بڑھا تو اس میں ایک امتیازی خصوصیت پیدا ہوئی جس سے یہ الگ قسم کی مخلوق بن گیا. یہ امتیازی خصوصیت وہ ہے جسے قرآن نے "روحِ خداوندی یا الوہیاتی توانائی" DIVINE ENERGY سے تعبیر کیا ہے.

واضح رہے کہ قرآن میں رُوح کا لفظ ان معنوں میں نہیں آیا جن معنوں میں اسے مادہ MATTER کے مقابلہ میں استعمال کرتے ہیں. بالفاظِ دیگر یہ SPIRIT یا SOUL کے معنوں میں نہیں آیا. یہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (یا نفس) کہا جاتا ہے. سماعت و بصارت SENSES اور قلب MIND وہ ذرائع ہیں جو انسانی ذات کو معلومات بہم پہنچاتے اور ان میں تمیز و تفریق پیدا کرتے ہیں. یہ ذات اس علم کی روشنی میں اپنے اختیار و ارادہ سے معاملات کے فیصلے کرتی ہے اور اپنے ذرائع یا یوں کہئے کہ جسم اور اس کی قوتوں کو اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بناتی ہے.

رُوحِ خداوندی

یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ نَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ سے یہ مطلب نہیں کہ خدا نے اپنی ذات میں سے ایک حصہ انسان کو دے دیا. ذات PERSONALITY ایک ناقابلِ تقسیم وحدت INDIVISIBLE WHOLE ہوتی ہے جو حصّوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی. لہٰذا یہ تصوّر غلط ہے کہ انسانی ذات خدا کی ذات کا ایک جُزو ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر مادی آلائشوں میں پھنس گئی ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہیٰ یہ ہے کہ یہ جزو پھر اپنے کُل میں جا ملے جس طرح قطرہ دریا میں جا ملتا ہے. یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے. خدا کی ذات اپنی جگہ مکمل ہے اور انسانی ذات (جو اگرچہ خدا کی ودیعت کردہ ہے) اپنے مقام پر مستقل حیثیت رکھتی ہے. انسانی زندگی کا یہ تصوّر (کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں بلکہ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں) وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے.

انسانی ذات

اگر اسے مان لیا جائے تو دین کی بات آگے چلتی ہے. اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. اسے تسلیم کر لینے سے جو بات آگے چلتی ہے اس کی چند اہم کڑیاں یہ ہیں.

(۱) ذات جہاں بھی ہو اس کے بنیادی خصائص BASIC CHARACTERISTICS وہی ہوں گے.

(۲) انسان کو ذات بنی بنائی نشوونما یافتہ DEVELOPED FORM میں) نہیں ملتی. یہ اسے بطور ممکناتِ زندگی REALISEABLE POSSIBILITIES یا مضمر LATENT یا مستتر POTENT یا خوابیدہ DORMENT شکل میں ملتی ہے. اس کا مشہود MANIFEST یا بارز ACTUALIZE کرنا انسانی زندگی کا مقصود

ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما (DEVLOPMENT) کہتے ہیں۔

(۳) ایک غیر تربیت یافتہ ذات UN-DEVLOPED PERSONALITY کے لئے ضروری ہے کہ کوئی نشوونما یافتہ ذات DEVELOPED PERSONALITY بطور خارجی معیار OBJECTIVE STANDARD اس کے سامنے رہے۔ اگر انسان کے سامنے اس قسم کا کوئی خارجی معیار نہ ہو تو وہ کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک۔

(۴) اس کائنات میں ذات یا تو خدا کی ہے یا اس سے نیچے اُتر کر انسان کی۔ خدا کی ذات مکمل ترین، بلند ترین اور کامل نشوونما یافتہ ہے اس لئے وہی ذات انسانی ذات کے لئے خارجی معیار بن سکتی ہے۔ (واضح رہے کہ خدا کی ذات، انسانی ذات کی طرح، رفتہ رفتہ نشوونما پا کر مکمل یا نشوونما یافتہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ فی ذاتہٖ مکمل اور نشوونما یافتہ تھی اور ہے)۔

خدا اور انسان

(۵) ہم خدا کی ذات کی کنہ وحقیقت اور ماہیت وکیفیت کے متعلق کچھ نہیں جان سکتے۔ (خدا کی ذات تو ایک طرف ہم اپنی ذات کی کنہ وحقیقت کے متعلق بھی کچھ نہیں جان سکتے)۔ ذات اپنی صفات سے پہچانی جاتی ہے۔ یہی صفات ہیں جنہیں ہم نے اوپر بنیادی خصائص (BASIC CHARACTERISTICS) سے تعبیر کیا ہے۔ یہ صفات وخصائص درحقیقت ذات کے مختلف شئون (FACETS) ہوتے ہیں۔

(۶) ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ذات جہاں بھی ہوگی اس کے بنیادی خصائص (یا صفات) ایک ہی ہوں گی۔ لہٰذا انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی کے صفات ایک ہی ہیں بجز ان صفات کے جو ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہیں، مثلاً ازلیت، ابدیت (ھوالاوّل والآخر) لامتناہیت وغیرہ۔ پھر چونکہ خدا کی ذات مکمل ترین، بلند ترین اور لامحدود (INFINITE) ہے اس لئے اس کی صفات بھی مکمل ترین، بلند ترین اور لامحدود ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسانی ذات میں یہ صفات حدودِ بشری کے اندر سمٹی ہوئی ہیں۔ صفاتِ خداوندی اور انسانی ذات کی صفات میں یہ فرق ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

(۷) قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس تفصیل، وضاحت اور حسن وخوبی سے بیان کیا ہے کہ انسان کے لئے ان کے معیار بننے میں کسی قسم کا شک وشبہ یا ابہام والتباس نہیں رہ سکتا۔

(۸) قرآن نے وہ ضابطہ بھی دیا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات کی ان مضمر اور خوابیدہ صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ وہ خدا کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اُسے "قربِ خداوندی" حاصل ہو جاتا ہے۔ اس ضابطہ یا نظام کو الدّین کہتے ہیں۔

(۹) اس ضابطہ یا نظام کی رُو سے انسانی ذات کی نشوونما معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ تجرّد گاہوں اور خلوت گاہوں میں نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جس معاشرہ میں الدّین عملی شکل اختیار کرتا ہے اس میں ہر فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور تمام افرادِ معاشرہ سرفرازیوں اور سربلندیوں اور خوشگواریوں اور شادابیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۱۰) انسان کے ہر کام، بلکہ آرزو، ارادہ اور دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ ہر وہ کام جو اس کی ذات کی نشوونما میں ممدّ و معاون ہو عملِ خیر کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس جو کام اس کی ذات کے ضعف و اضمحلال کا موجب بنے عملِ شر ہے۔ بالفاظِ دیگر، جس طرح جسمِ انسانی کی نشوونما اور ضعف و ہلاکت کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما اور تباہی و بربادی کے لئے قوانین متعین ہیں۔ اگر انسانی ذات کی نشوونما ہوتی رہے تو انسانی جسم سے متعلق حوادث، حتیٰ کہ اس کی موت کا بھی، اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یعنی ایک نشوونما یافتہ ذات، حیاتِ جاوید حاصل کرلیتی ہے۔ اسے آخرت کی زندگی کہتے ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے:-

(ل) خدا اس مکمل ترین، بلندترین اور نشوونما یافتہ ذات کا نام ہے جس کی صفات انسانی ذات کے نشوونما کے لئے بطورِ خارجی معیار کام دیتی ہیں۔ ان صفاتِ خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کو اپنے سامنے بطورِ معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں (علیٰ حدِّ بشریت) ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

(ب) دین اس عملی ضابطۂ زندگی یا نظامِ حیات کا نام ہے۔ جس کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس نظام کے قوانین کا مجموعہ قرآن ہے۔ (واضح رہے کہ "مذہب[1]" کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ وہ صرف دین کے متعلق بات کرتا ہے ـــــ یعنی ایک عملی نظامِ حیات کے متعلق۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ دین، آدمی کو حیوانی سطح

---

[1] انگریزی زبان میں چونکہ "دین" کے لئے کوئی الگ لفظ نہیں تھا اس لئے انہوں نے، باقی مذاہب کی طرح، اسلام کو بھی ایک (RELIGION) قرار دے لیا، حالانکہ RELIGION کی جس قدر (DEFINITIONS) پہلے دی جاچکی ہیں، یا اس کا جو عام تصور ہے ان میں سے کسی بات کا بھی اسلام پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اسلام دین ہے، مذہب نہیں۔ اور دین کے معنی ہیں وہ طریقِ زندگی، انسانوں کی وہ ہیئتِ اجتماعیہ، جو خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کے خطوط پر متشکل ہو۔ اس سے "مذہب" اور "دین" کا بنیادی فرق سامنے آجاتا ہے۔ "مذہب" کا ماحصل، ایک ذاتی، داخلی تجربہ EXPERIENCE INTER PERSONAL بتایا جاتا ہے، جو یکسر انفرادی چیز ہے، لیکن دین، نظامِ زندگی کا نام ہے جو سراسر اجتماعی ہے۔

سے ابھار کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازیوں اور سربلندیوں کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی دنیا (آخرت) میں مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ

قرآنی تصوّر اور تصوف میں فرق

سوال سامنے آتا ہے کہ اگر دین کا مقصود افراد کی ذات کی نشوونما ہے تو یہ وہی انفرادی تصوّر ہے جسے خانقاہیت کا مسلک، ویدانت تصوّف (MYSTICISM) اپنے طریق پر پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور کائنات یا انسانی ہیئتِ اجتماعیہ پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟ یہ سوال اہم ہے اور اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کائنات کی ہر شے میں خدا کا عملِ تخلیق، اور نظامِ ربوبیت اس کے قوانین کے مطابق جاری و ساری ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ضمناً یہ دیکھ لینا بھی ضروری ہے کہ تخلیق اور نظامِ ربوبیت سے کیا مراد ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ایک نظام وہ ہے جس میں مختلف اشیائے کائنات کا اوّلین ہیولیٰ، عدم (NON-EXISTENCE) سے وجود (EXISTENCE) میں آیا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ اسے قرآن نے امر سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ گوشہ جس میں خدا

تخلیق

کا ارادہ اور فیصلہ اس انداز سے عملی شکل اختیار کرتا ہے کہ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنَ (۳۶/۸۲) "جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے کہہ دیتا ہے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے"۔ اس اوّلین ہیولیٰ کے وجود میں آجانے کے بعد مختلف عناصر میں نئی نئی تراکیب سے نئی نئی چیزیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اسے تخلیق کہتے ہیں۔ خلق کے معنی ہی صحیح توازن و تناسب (PROPORTION) کے ساتھ پیدا کرنا ہیں۔ اس طرح کائنات میں تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)

یہ رہا خدا کا عملِ تخلیق۔ اس کے بعد اس کا نظامِ ربوبیت شروع ہوتا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے

ربوبیت

نقطۂ آغاز سے آہستہ آہستہ بتدریج اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دینا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ خدا کا یہ عملِ تخلیق و ربوبیت، کائنات کے ہر گوشے میں جاری و ساری ہے لیکن (ہمارے اندازوں کے مطابق) اس کی رفتار بڑی سست ہے۔ فطرت کی اسکیمیں اپنی تکمیل تک پہنچنے کے لئے ایسے مراحل میں سے گزرتی ہیں جن کا ایک ایک مرحلہ (PERIOD) ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ سورۂ سجدہ میں ہے۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲/۵)

اللہ اپنی سکیم کو عالمِ امر کی بلندیوں میں ترتیب دے کر اس کا آغاز پست ترین نقطہ (ارض) سے کرتا ہے۔

پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اس (کی مقرر کردہ منزل) کی طرف بلند ہوتی چلی جاتی ہے ایک یوم میں جو تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

دوسرے مقام پر ان ارتقائی منازل کو پچاس پچاس ہزار سال کا بھی بتایا گیا ہے (۷۰/۴)۔ ان مراحل کے سلسلۂ دراز کے متعلق کچھ سمجھنا ہو تو نظریۂ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) کے ماہرین سے پوچھئے۔ وہ بتائیں گے کہ ایک نوع میں ذرا سی تبدیلی کے لئے کس طرح لاکھوں برس کی مدت درکار ہوتی ہے[1]۔ کائنات میں جب خدا کی اسکیم (تنہا) کارفرما ہوتی ہے تو مختلف اشیاء اپنے ارتقائی مراحل اس سُست رفتاری سے طے کرتی ہیں۔ لیکن اگر انسان خدا کے اس تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ طول و طویل مدت سمٹ کر دنوں اور مہینوں میں محدود ہو جاتی ہے، مخلوقات میں نت نئے اضافے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے (انسان اور خدا کے درمیان مکالمہ کی شکل میں) انسان کی زبان سے کہا ہے کہ

انسانی رفاقت

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم
(پیامِ مشرق)

یہی وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کے رفیق بننے والے انسان ہیں جنہیں قرآن "خالق" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ خدا احسن الخالقین (۲۳/۱۴) ہے یعنی جس کی تخلیق میں حسن و توازن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔

خدا کے تخلیقی پروگرام میں انسان کی رفاقت بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن اس کی حقیقی اہمیت اس مقام میں سامنے آتی ہے جہاں یہ اس کے قانونِ مکافات میں اس کا رفیق بنتا ہے۔ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کا قانونِ مکافات، ہر سبب CAUSE سے ایک نتیجہ EFFECT پیدا کرتا ہے، اسی طرح انسانی دنیا میں بھی ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اور مرتب کر کے رہتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ اُس کے قانون کے مطابق جس کام کا نتیجہ خوشگواری و شادابی ہے اس سے زندگی میں شادابی و خوشگواری پیدا نہ ہو۔ اور جس کام کا

انسانی دُنیا میں رفاقت

---

[1] "نوع" میں تبدیلی تو ایک طرف۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ پچاس ہزار سال کی مدت میں دن رات (یعنی چوبیس گھنٹے) میں ایک سیکنڈ کا اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ زمین کی حرکت کی رفتار سُست ہو رہی ہے۔

نتیجہ تباہی و بربادی ہے اس سے قومیں تباہ و برباد نہ ہوں. لیکن کائناتی نظام کی طرح اس گوشے میں بھی خدا کے قانونِ مکافات کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے ـــ وہی ہزار ہزار سال کا ایک دن (۲۲/۴۷). خارجی کائنات میں قانونِ خداوندی کی سست روی انسان کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کرتی لیکن انسانی معاشرہ میں اس کی یہ رفتار دلوں میں شکوک و شبہات کی چبھن اور خلش و اضطراب کی پھانس پیدا کر دیتی ہے. مثلاً اس کا قانون ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱) ظالموں کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی. یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے. لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ظالم پنپتے چلے جاتے ہیں اور مظلوم پستے رہتے ہیں. اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات کو نہیں مانتے وہ دھڑلّے سے کہتے ہیں کہ اگر خدا کا قانون کچھ حقیقت رکھتا تو ظالموں کی کھیتیاں پنپتی کیوں چلی جاتیں؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کا چلن یہی ہے کہ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس". ظالم جب تک صاحبِ قوت ہے اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا. یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے کہ

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ　(۲۲/۴۷)

یہ لوگ تجھ سے (اے رسول) کہتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ ہماری غلط روش کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوگا تو وہ تباہی اور بربادی کہاں ہے؟ وہ آتی کیوں نہیں؟ اگر تم سچے ہو تو اسے جلدی سے لاؤ.

بات یہ ہے کہ خدا کا قانون بالکل برحق ہے لیکن خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ہزار سال کا ہوتا ہے. لیکن مظلوم کا اس سے اطمینان نہیں ہو سکتا کہ ظالم کی تباہی ہزار یا پانچ سو سال بعد ہوگی. اس سے جب کہا جاتا ہے کہ ـــ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک ـــ تو وہ اس کے جواب میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتا ہے کہ ـــ کون جیتا ہے تیری زلف کے سَر ہونے تک ـــ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے وعدے بالکل سچے ہیں تو وہ کہہ دیتا ہے کہ مجھے بھی معلوم ہے لیکن بات یہ ہے کہ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے حساب و شمار سے نتیجہ خیز ہو. تو تم اس کے پروگرام میں اس کے رفیق بن جاؤ. چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں نبیٔ اکرمؐ (صلعم) سے کہا گیا ہے کہ

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝　(۶/۱۳۶)

تم ان (ظالموں) سے کہہ دو کہ تم اپنی جگہ اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہو اور مجھے اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے دو۔ نتیجہ بتا دے گا کہ آخرالامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ خدا کا یہ قانون کس طرح برحق ہے کہ ظالموں کی کھیتی پنپا نہیں کرتی۔

خارجی دنیا میں خدا کے تخلیقی پروگرام میں تو ہر قوم حصہ لے سکتی ہے (طبیعی سائنس کا مقصد ہی یہ ہے) لیکن خدا کے قانون کو انسانی معاشرہ میں نتیجہ خیز بنانے کے لئے وہی جماعت خدا کی رفیق بن سکتی ہے جو اس قانون کی محکمیت پر یقین رکھے اور جن افراد پر یہ جماعت مشتمل ہو ان کی ذات میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو۔ یہ وہ افراد ہیں کہ ان کے ہاتھوں جو کچھ (خدا کی رفاقت کے سلسلے میں) سرزد ہوتا ہے، خدا اسے خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ چنانچہ جب یہ جماعت (ظالموں کو یہ دکھانے کے لئے کہ ان کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی) نبی اکرمؐ کے زمانے میں سربکف اور کفن بدوش بدر کے میدان میں آگئی اور مخالفین کو مقتول و مغلوب کرنے کے بعد فاتح و منصور لوٹی (اس ضمن میں) خدا نے کہا کہ

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷)

ان (ظالمین) کو تم قتل نہیں کر رہے تھے خود اللہ قتل کر رہا تھا۔ تم ان پر تیر نہیں چلا رہے تھے۔ خود خدا چلا رہا تھا۔

یہ حصہ خدا کے قانونِ مکافات میں انسانی رفاقت سے متعلق تھا۔

نظامِ ربوبیت

اس سے آگے بڑھیے تو خدا کا نظامِ ربوبیت سامنے آتا ہے۔ خارجی کائنات میں یہ نظام کس طرح کارفرما ہے ہمیں سردست اس سے بحث نہیں۔ انسانی دنیا کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ

مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

کوئی زمین پر چلنے والا (یا کوئی متنفس) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جنہیں دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اس لئے اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ خدا کی یہ ذمہ داری کیسی ہے جس میں انسان بھوکے مرتے ہیں؟ یہ خیال ان لوگوں کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اپنی اس قسم کی ذمہ داریوں کو براہِ راست پورا کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ذمہ داری ان افراد کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جن کی ذات میں خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کی نمود ہوتی ہے۔ یہ افراد ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں رزق (سامانِ زیست) ذخیروں میں بند نہیں رہتا۔ نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے کھلا رہتا ہے۔ چنانچہ سورہ یٰسین میں ہے کہ

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳۶/۴۷)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اپنے رزق کو نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو تو جو لوگ اس قانون کو نہیں مانتے وہ جماعتِ مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان کے رزق کا انتظام کریں جنہیں اگر خدا چاہتا تو براہِ راست رزق بہم پہنچا دیتا۔

ان سے کہو کہ تم (خدا کے نظامِ ربوبیت کے بارے میں) کس قدر کھلی ہوئی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

یہ نظامِ ربوبیت (جس میں کوئی فرد سامانِ زیست سے محروم نہ رہے) خدا کے کائناتی قانون کی رفتار سے ہزاروں سال کے بعد متشکل ہوگا لیکن اگر انسان خدا کا رفیق بن جائے تو یہی نظام دنوں میں قائم ہو سکتا ہے (جیسا کہ اسلام کے ابتدائی ایام میں ہوا)۔ یہی وہ نظام (اسلامی معاشرہ) تھا جس نے خدا کے اس دعوے کو کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ داری اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی

عملاً پورا کر کے دکھا دیا۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے انسانی زندگی کا جو مقصود یا نصب العین بتایا ہے (یعنی افراد کی ذات کی نشوونما) وہ ایک انفرادی عمل نہیں۔ وہ انسانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ (بلکہ خارجی کائنات سب) کو محیط ہے۔ اور اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ اس سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ نہ انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر ہو سکتی ہے اور نہ نشوونما یافتہ ذات کی روشنی صرف اس فرد کے سینے تک محدود رہتی ہے۔ اس سے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے اور انسانی معاشرے کی تشکیل صحیح خطوط پر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ خانقاہیت (تصوف)[1] کی زندگی اور قرآنی نظریہ اور نظامِ حیات اس قدر مختلف ہیں۔

اس سے آپ نے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ خدا کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے اور خدا کے ساتھ انسان کا جو تعلق

پرستش کا مفہوم

بتایا ہے اس کی رُو سے نہ تو "پرستش" کا وہ مفہوم باقی رہتا ہے جس میں انسان کسی صاحبِ قوت ہستی سے ڈر کر اس کے سامنے گڑگڑائے یا اسے خوش کرنے کے لئے اس کی مدح و ستائش کے گیت گائے۔ یا اس کے غصے سے بچنے کے لئے اس کے حضور نذرانے گزارے اور نہ ہی خدا کے قوانین کی اطاعت کسی مستبد حاکم کے اندھے حکموں کی تعمیل کے مترادف ہوتی ہے۔ اس تصور کی رُو سے خدا کی صفات وہ خارجی معیار ہے جس کے مطابق انسان اپنی ذات کی نشوونما کرتا ہے۔ اور قوانین و احکامِ خداوندی وہ عملی طریق ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے۔ ان احکام و قوانین کی مثال ڈاکٹر کی ہدایات کی سی ہے جن کے مطابق وہ مریض کو بعض کام کرنے کی تلقین کرتا ہے اور بعض باتوں سے پرہیز بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کی ان ہدایات پر عمل کرنے سے مریض کا اپنا بھلا ہوتا ہے۔ اس کی ڈاکٹر کی خوشنودی یا ناراضگی کا مظاہرہ

[1] تصوف اور اس کی تاریخ کے متعلق میری مبسوط تصنیف "تصوف کی حقیقت" ملاحظہ کیجئے۔

نہیں ہوتا۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷) اگر تم حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرو گے تو اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو ہوگا اور اگر ناہمواریاں پیدا کرو گے تو اس کا نقصان بھی تمہاری ذات کو ہوگا. خدا تمہارے اعمال کا محتاج نہیں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (۳/۹۶) خدا، کائنات اور اقوامِ عالم سے بے نیاز ہے۔

اختیار و ارادہ

چونکہ انسانی ذات پر وہی عمل اثر انداز ہو سکتا ہے جسے وہ اپنے اختیار و ارادہ سے بطیبِ خاطر سرانجام دے' اس لئے کسی فرد کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اُسی نہج کو اختیار کرے جو انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے خدا کی طرف سے تجویز ہوئی ہے. اختیار و ارادہ' ذات (PERSONALITY) کی بنیادی خصوصیت ہے اس لئے اسے سلب کر لینے کے بعد انسان سے کسی بات کو منوانا اسے انسانی سطح سے گرا کر حیوانی سطح پر لے جانا ہے. جو طریق (یعنی کسی بات کو بہ جبر منوانا) انسانی ذات کو اس کی بنیادی خصوصیت (اختیار و ارادہ) سے محروم کر دے وہ انسانی ذات کی نشو و نما کیا کر سکے گا؟ اس لئے قرآن کا اعلان ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) دین کے ماننے یا نہ ماننے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَىِّ (۲/۲۵۶) غلط اور صحیح راستے وحیٔ خداوندی کی رُو سے واضح ہو چکے ہیں۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

لیکن جب آپ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ ـ بطیبِ خاطر ـ دین کا تجویز کردہ راستہ اختیار کریں گے تو پھر آپ کے لئے ان تمام قوانین و ضوابط کا ماننا ضروری ہو جائے گا جسے انسانی ذات کی نشو و نما اور اس معاشرہ کے نظم و ضبط کے لئے متعین کیا گیا ہے جس کے اندر اُس کی ذات کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ ذات کی برومندی' پابندیوں کے بغیر ناممکن ہے. البتہ یہ

بطیبِ خاطر پابندیاں

پابندیاں کسی غیر کی عائد کردہ نہیں ہوں گی یہ وہ پابندیاں ہوں گی جنہیں انسان اپنی ذات کی نشو و نما کے لئے خود (بطیبِ خاطر) اختیار کرتا ہے۔

اسلام اس طریقِ زندگی کا نام ہے جسے انسان اپنی ذات کی نشو و نما کے لئے بطیبِ خاطر اختیار کرتا ہے. اس سے صرف اس کی اپنی ذات کی نشو و نما نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے حسن میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا ہر گوشہ روشن اور تابناک ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے نظام ہی میں ممکن ہے جس میں تمام افرادِ انسانیہ کو سامانِ زیست بلامشقت بہم پہنچتا رہے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا پورا پورا انتظام ہو۔

دین (یعنی قرآنی نظامِ زندگی) ایک حقیقت ہے اور حقیقت ہمیشہ زمان اور مکان کے حدود و قیود سے ماوراء ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات' زمانے کے تقاضوں سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے بعض گوشے خاص طور پر اہمیت حاصل کر کے نمایاں

طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں اس حقیقت کے دو گوشے بڑی نمایاں حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ سامان رسل ورسائل کی وسعت سے پوری دنیا سمٹ کر ایک بستی بن گئی ہے۔ اور انسانی آبادی ایک وحدت سی بنتی نظر آرہی ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی نظامِ زندگی کی عالمگیریت نمایاں طور پر سامنے آرہی ہے۔ قرآن نے مخاطب ہی "النّاس" (نوعِ انسان) کو کیا تھا' اس لئے اب اس کے نظام کے مشہود ہونے کے لئے حالات خود بخود سازگار ہو رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہمارا زمانہ 'عصرِ معاشیات (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ اس میں معاشی تقاضوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے لیکن دنیا کو ابھی تک ایسا معاشی نظام نہیں ملا جس میں انسان کی انفرادیت کا قیام اور احترام بھی باقی رہے اور اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بھی باعزت طور پر حاصل ہوتی رہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کا دیوالہ مدت ہوئی پٹ گیا تھا۔ اشتراکیت نے ایک نئے تجربہ کے طور پر دنیا کو چیلنج دیا تھا لیکن وہ ابھی چار قدم بھی چلنے نہ پائی تھی کہ بری طرح ٹھوکر کھا کر گری ہے اور اس کے سنبھلنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ دنیا اب پھر ایک دوراہے پر مبہوت کھڑی ہے جہاں سے اُسے صرف قرآن کا نظامِ زندگی صحیح راستے کی طرف لے جا سکتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے باقی گوشے کم اہمیت رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے اور اس کا ہر گوشہ یکساں اہمیت کا حامل۔ اسلام انسان کو ایک وحدت کی حیثیت سے سامنے رکھتا ہے اور اسی حیثیت سے اس کے لئے نظامِ زندگی تجویز کرتا ہے۔ اس نظام کی عمارت انسانی ذات کے اقرار اور یقین پر اٹھتی ہے۔ آئندہ ابواب میں آپ کو اسی اجمال کی تفصیل ملے گی۔

تکملہ۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما دین کے اجتماعی نظام میں ہو سکتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر دین کا اجتماعی نظام قائم نہ ہو' تو انسانی ذات کی نشوونما کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں ایک فرد' ان اقدار کی پابندی کر سکتا ہے جن پر عمل پیرا ہونا انفرادی طور پر بھی ممکن ہے۔ مثلاً اپنی عصمت کی حفاظت کرنا' کسی کو دھوکا نہ دینا' ضرورتمندوں کی امداد کرنا' احترامِ آدمیت کا ملحوظ رکھنا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان اقدار کی پابندی سے انفرادی طور پر بھی' انسانی ذات کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ دیکھنے کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ آپ اپنے اختیار وارادہ کا استعمال کس انداز سے کرتے ہیں۔ زندگی کے جس دائرے میں اور جس حد تک آپ کے لئے اپنے اختیار وارادہ کا استعمال ممکن ہوگا۔ اسی دائرے میں یہ دیکھا جائے گا کہ آپ اسے استعمال کس طرح کرتے ہیں۔
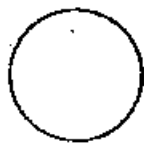
1- HUMANITY AND DEITY BY W.M. URBAN; P-15
GEORGE ALLEN AND UNWIN-1951

2- ان تمام (DEFINITIONS) کے لیے دیکھئے (F.S. BRIGHTMAN) کی کتاب "APHILOSOPHI OF RELIGION" صفحہ ۱۸

3- QUOTED BY "JULIAN HUXLEY" IN "RELIGION WITHOUT REVELATION"; P-40

4- QUOTED BY "ALDOUS HUXLEY" IN "ENDS AND MEANS" P-250.

5- SCIENCE AND THE MODERN WORLD.

6- MAX MULLER IN "SCIENCE AND RELIGION"

7- E.B. TAYLOR IN "PRIMITIVE CULTURE"

8- PROF. MONZIES IN "HISTORY OF RELEGION"

9- HOFFDING IN "RELIGIOUS PHILOSOPHY"

10- IN SEARCH OF THE MIRACULOUS (P-299)

11- C.F. BRIGHTMAN (P-81)

12- "F.J. SHEEN" IN "PHILOSOPHY OF RELEGION" (P-238)

13- AN HISTORION'S APPROACH TO RELIGION (P-18)

14- THE ORIGION AND GROWTH OF RELIGION

بابِ دوم

انسانی ذات

(HUMAN PERSONALITY)

گزشتہ باب میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) انسان اس کے طبیعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور "شے" بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔

(۲) ذات کی کنہ و حقیقت کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے (خواہ وہ خدا کی ذات ہو یا انسان کی ذات) ہم اس کے صفات و اعمال سے اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

زیرِ نظر باب میں انسانی ذات کی صفات و خصائص اور اعمال و شئون کے متعلق بات کی جائے گی۔ ماہرینِ علم الابدان ہمیں بتاتے ہیں کہ انسانی جسم لاتعداد خلیات (CELLS) سے مرکب ہے۔ لیکن ان خلیات کی یہ صورت نہیں کہ یہ ایک دفعہ کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئے اور جب تک انسان زندہ رہے گا اسی شکل میں باقی اور موجود رہیں گے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان خلیات میں ہر آن تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے (اسے اصطلاح میں METABOLISM کہتے ہیں)۔ لاتعداد خلیات ضائع ہوتے رہتے ہیں (اسے KATABOLISM کہتے ہیں) اور ان کی جگہ بے شمار نئے خلیات بنتے رہتے ہیں (اس تعمیری عمل کو (ANABOLISM) کہتے ہیں)۔

انسانی جسم میں ہر آن تبدیلی

اس مسلسل تغیر و تبدل کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جسمِ انسانی (جو ان خلیات سے مرکب ہے) ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس (نئے جسم) میں سابقہ جسم کا کچھ حصہ باقی نہیں رہتا۔ پہلے تحقیق یہ تھی کہ سابقہ جسم نئے جسم میں سات سال کے عرصہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ یہ تبدیلی تین سال میں عمل میں آجاتی ہے۔ بہر حال یہ تبدیلی تین سال میں ہو یا سات سال میں، ان کی اس تحقیق میں کوئی اختلاف نہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد انسان کا سابقہ جسم یکسر نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ اگر انسان عبارت ہو صرف اس کے جسم سے تو تین یا سات سال کے بعد پہلا فرد (INDIVIDUAL) ختم ہو جائے گا. اور اس کی جگہ ایک نیا فرد لے گا. اس تبدیلی کا عملی دنیا میں اثر کیا ہوگا اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے. دس سال پہلے زید نے آپ سے کچھ روپے بطور قرض لئے اور آپ کو رسید یا تمسک لکھ کر دے دیا. اب وہ قرضہ کی واپسی سے انکار کرتا ہے. آپ اس کی تحریر عدالت میں پیش کرتے ہیں. وہ اپنی مدافعت میں ڈاکٹر کی شہادت پیش کر دیتا ہے کہ جس زید نے دس سال پہلے یہ تحریر لکھی تھی اس کے جسم کا ایک ذرہ بھی موجودہ زید میں باقی نہیں. وہ زید مدت ہوئی فنا ہو گیا. اب اس کی جگہ ایک نیا زید وجود میں آ گیا ہے. اگر اس (موجودہ) زید سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرضہ کوئی لے اور اس کی ادائیگی کوئی اور کرے. اور اگر قرضہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے کچھ سزا دی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کرے کوئی، بھرے کوئی. یہ انتہائی ظلم ہوگا. اب سوچئے کہ اگر اس نظریے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ انسان صرف اس کے جسم سے عبارت ہے تو عملی دنیا میں اس کے کیا نتائج ہوں گے؟ نہ کوئی عہد معاہدہ باقی رہے گا نہ قول و قرار. نہ کسی سے ضابطہ اور قانون کی پابندی کرائی جا سکے گی. نہ مواخذہ اور باز پرس ہو سکے گی نہ کسی کو کسی جرم کا مرتکب قرار دیا جا سکے گا، نہ سزا کا مستوجب. اور تو اور اگر دس سال کے بعد کسی کی بیوی اس سے کہہ دے کہ جس عورت نے تم سے نکاح کا عہد باندھا تھا وہ ختم ہو چکی ہے میں اس عقد کی پابند نہیں. تو (مذکورہ صدر نظریہ کی رُو سے) وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہو گی. اسی حقیقت کے پیش نظر (BRIGHTMAN) نے کہا ہے کہ

اس نظریہ کا اثر

اَنا کا تسلسل

> اخلاقی نظام کا دار و مدار اس مسلمہ پر ہے کہ میں اپنے تمام گزشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں. اس لئے کہ اگر میں کچھ عرصہ کے بعد وہی نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی قرار نہیں دیا جا سکتا. لہٰذا ان فیصلوں کی خلاف ورزی اور ان معاہدوں کی شکست کا الزام مجھ پر کیسے عائد ہو سکتا ہے.

آپ ان خارجی مثالوں سے قطع نظر خود اپنے آپ پر نگاہ ڈالئے. بات سمجھ میں آجائے گی. آپ کی حالیہ عمر اگر چالیس سال کی ہے تو (مذکورہ صدر نظریے کے مطابق) آپ کم از کم پانچ چھ مرتبہ بدل چکے ہیں اور بالکل نئے "فرد" بن چکے ہیں. لیکن اس کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ جس واقعہ نے آپ کی زندگی کو دس برس کی عمر میں متاثر کیا تھا اُس کی یاد آج بھی آپ کے دل میں خوشی یا غم کی وہی کیفیات پیدا کر دیتی ہے جن کیفیات کو آپ نے اُس وقت محسوس کیا تھا. آپ ایک لمحے کے لئے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے کہ جس فرد پر وہ کیفیتیں گزری تھیں وہ میں نہیں ہوں کوئی اور تھا. ہم میں سے کون ہے جس نے تھا مس ہور کی اس منظر کشی میں اپنی آرزوؤں کا رنگ جھلکتے نہ دیکھا ہو جس کا نادر کا کوردی نے اس حسین انداز سے پیش کیا ہے، کہ

اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی دلچسپیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر
وہ بچپن اور وہ سادگی وہ رونا اور ہنسنا کبھی
پھر وہ جوانی کے مزے وہ دل لگی وہ قہقہے
وہ عشق وہ مہرِ وفا وہ وعدہ اور وہ شکریہ
وہ لذتِ بزمِ طرب یاد آتی ہے ایک ایک سب
یوں ہی شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی ناکامیاں گزرے ہوئے دن رنج کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
ان حسرتوں کی قبر پر
جو آرزوئیں پہلے تھیں پھر غم سے حسرت بن گئیں
غم ... ...

ہم میں سے کون ہے جو یہ کہے گا کہ وہ عیش وہ دلچسپیاں، وہ رنج اور ناکامیاں، جن کی یاد "اکثر شب تنہائی میں۔ کچھ دیر پہلے نیند سے۔ غم و مسرت کے ملے جلے تاثرات سے افقِ قلب پر قوسِ قزح کی نم آلود رنگینیاں پیدا کئے چلی جاتی ہے" میری نہیں کسی اور کی تھیں، کیونکہ میں تو اپنے جسمانی خلیات کے فنا اور تبدیل ہو جانے سے مدّت ہوئی ناپید ہو چکا ہوں۔ ہمارا اپنا تجربہ، اپنا احساس اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ "میں" اس جسم کا نام نہیں جو ہر سات یا تین سال کے بعد بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ "میں" اس حقیقتِ ثابتہ کا نام ہے جو جسم کے تغیّرات کے علی الرغم ہمیشہ غیر متبدّل رہتی ہے۔ تغیّرات کے بحرِ متلاطم میں اس تغیّر ناآشنا گہر تابدار کا نام انسانی ذات ہے۔ بار دیو کے الفاظ میں

(PERSONALITY IS CHANGLESSNESS IN CHANGE)

انسانی ذات، تغیّرات کی دنیا میں ثبات کا نام ہے۔

یہی "میں" (یا انسانی ذات) ہے جو ایک فرد کے تمام اعمال کی ذمّہ دار اور ان کے نتائج و عواقب کی مؤثر ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جن باتوں کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے وہ انسانی حافظہ کے کرشمے ہیں. اس میں ذات کا کوئی تعلق نہیں.

ذات اور حافظہ

اگر کسی انسان کا حافظہ گم ہو جائے تو اسے نہ اپنی سابقہ زندگی کا کوئی واقعہ یاد رہتا ہے نہ کسی واقعہ کا تذکرہ اس پر اثر انداز ہوتا ہے. جب حافظہ درست ہو جائے تو ماضی کے واقعات پھر اسی طرح اثر انداز ہونے شروع ہو جاتے ہیں. لہٰذا یہ سب حافظہ کا کھیل ہے.

لیکن یہ خیال سطح بینی کا نتیجہ ہے. حقیقت پر مبنی نہیں. انسانی ذات اپنے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے جسم کے اعضاء اور جوارح کو اپنا آلہ کار بناتی ہے. آپ کسی چیز کو پکڑنے کا ارادہ کرتے ہیں. آپ کا ہاتھ آگے بڑھتا ہے اور اس چیز کو پکڑ لیتا ہے. اگر (خدا نکردہ) آپ کا ہاتھ مفلوج ہو جائے تو وہ اس چیز کو پکڑنے کے لئے آگے نہیں بڑھے گا. کیا ہاتھ کی عدم حرکت سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آپ کے اندر ارادہ کرنے والی شے کوئی نہیں؟ سب ہاتھ کا کرشمہ تھا. جب ہاتھ بیکار ہو گیا تو معاملہ ختم ہو گیا؟ آپ ایسا کبھی نہیں کہیں گے. آپ کے اندر فیصلہ یا ارادہ کرنے والی شے اب بھی بدستور موجود ہے. فرق اتنا پڑا ہے کہ اب اس کا ارادہ مشہود شکل میں آپ کے سامنے نہیں آتا کیونکہ جس ہاتھ نے اُس ارادہ کا مظہر بننا تھا وہ ہاتھ بے حس و حرکت ہو چکا ہے. اب اس مثال سے آگے بڑھئے.

انسان کے تمام اعمال (خواہ وہ دل کی آرزوئیں ہوں یا محسوس افعال) اس کی ذات پر نقوش مرتب کرتے ہیں. انسانی ذات اپنے ان نقوش کو دماغ کے ذریعے مشہود کرتی ہے. اس کا نام حافظہ ہے. اگر دماغ کسی بیماری یا حادثہ سے مفلوج ہو جائے تو وہ انسانی ذات کے نقوش کو اُبھار کر سامنے لانے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے. جب یہ اچھا ہو جائے تو اس میں پھر وہی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے.

اسے بھی ایک مثال کے ذریعے سمجھئے. ریڈیو سٹیشن پر کوئی مغنّی آتش نفس اپنی آواز کی شعلہ باریوں سے فضا کے بحرِ متلاطم میں آگ لگائے جاتا ہے. آپ کا ریڈیو سیٹ ان برقی لہروں کو اپنے تاروں پر لیتا ہے. اور اس طرح اس میں سے وہی آواز پیدا ہو جاتی ہے. آپ اس موسیقی کی کیف باریوں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں کہ یکایک آپ کے سیٹ کا بلب اڑ جاتا ہے. وہ آواز ختم ہو جاتی ہے. ریڈیو سٹیشن پر گانے والا اب بھی گا رہا ہے. برقی لہریں اب بھی آپ کے کمرے میں موجود ہیں. لیکن آپ انہیں محسوس نہیں کرتے. اس لئے کہ وہ آلہ جو ان لہروں کو مشہود بنانے کا ذریعہ تھا بگڑ گیا ہے. آواز بدستور موجود ہے. اس کا ذریعۂ اظہار باقی نہیں رہا. دماغ ریڈیو سیٹ ہے اور انسانی ذات ریڈیو سٹیشن سے براڈ کاسٹ کرنے والا مغنّی. ریڈیو سیٹ کی خرابی کے یہ معنی نہیں کہ ریڈیو سٹیشن پر مغنّی ہی نہیں رہا. وہ تو بدستور موجود ہے. اس کی آواز کی نمود کا ذریعہ خراب ہو گیا ہے. یا مثلاً آپ آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہیں. آئینہ گر کر چُور چُور ہو جاتا ہے. اب سامنے دیوار پر آپ کا عکس دکھائی نہیں دیتا.

اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کا وجود باقی نہیں رہا۔ وہ تو بدستور باقی ہے۔ وہ ذریعہ جس سے آپ کے عکس کی نمود ہوتی تھی باقی نہیں رہا۔

لہٰذا دماغ اصلِ ذات نہیں۔ وہ پردہ ہے جس پر ذات اپنے نقوش کی نمائش کرتی ہے۔ برگساں نے اس موضوع پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (MATTER AND MEMORY) وہ اس نکتہ پر بحث کرنے کے بعد کہ حافظہ مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ انسانی ذات کے عمل کی نمائش ہے، لکھتا ہے۔

> ہم نے اب سمجھ لیا ہے کہ حافظہ کیوں دماغ کی کیفیت کا نام نہیں ہو سکتا۔ دماغ حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال پر اپنا تصرف جما سکے۔ لیکن خالص حافظہ مادی شے نہیں۔ یہ روحانیت کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا دراصل روحانیت کی دنیا ہے۔

ڈاکٹر گیلووے (GALLOWAY) نے اپنی کتاب میں حیاتِ جاوید IMMORTALITY پر بحث کرتے ہوئے اس نکتہ کے متعلق بھی گفتگو کی ہے کہ کیا حافظہ انسانی دماغ کا فعل ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے۔

> یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ حافظہ ان نقوش کا نام ہے جو انسان کے دماغ پر مرتب ہوتے ہیں، اس لئے مرنے کے بعد یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی بہت سی عادات کی جڑ اس کے عصبی نظام میں پیوست ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ حافظہ کلیتہً انسانی نفس کا عمل ہے، علاوہ بریں کسی حادثہ کی وجہ سے حافظہ کا جاتے رہنا یا بڑھاپے میں اس کا کمزور ہو جانا اس بات کی شہادت ہے کہ حافظہ کا دارومدار ذہنی نقوش اور عصبانی نظام پر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان چیزوں پر حافظہ کا مدار ہے کس حد تک؟ یہ واقعہ ہے کہ حافظہ کا مدار کلیتہً یا زیادہ حد تک، ذہنی نقوش پر نہیں۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو حافظہ کا مدار براہِ راست کسی بات کے دہرانے پر ہوگا لیکن یہ امر واقعہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظہ کا بیشتر مدار اس پر ہے کہ وہ چیز جسے یاد رکھنا مقصود ہے بامعنی ہے[1]۔ اور یہ ظاہر ہے کہ معنویت کا تعلق انسانی نفس سے ہے نہ کہ عصبی نظام سے۔ لہٰذا، یہ ممکن ہے کہ انسانی نفس معنول کو محفوظ رکھنے کی جو صلاحیت رکھتا ہے، اسے انسانی جسم کی موت کے بعد بھی اپنے ساتھ آگے لے جائے اور یوں اس دنیا کا تسلسل موت کے بعد بھی قائم رہے۔ اگر اس زندگی میں جسمانی تغیرات کے باوجود نفسِ انسانی معنوں کو بعینہٖ

---

[1] یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر ایک بامعنی فقرہ کو ایک آدھ مرتبہ دیکھ لیا جائے تو وہ یاد ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا جائے تو الفاظ کے اس بے معنی مجموعہ کو یاد کرنے کے لئے ان الفاظ کو کئی بار دہرانے کی ضرورت پڑے گی۔

برقرار رکھ سکتا ہے، تو اس سے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ انہیں موت کے پیدا کردہ تغیرات کے باوجود، محفوظ رکھ سکے گا۔ (صفحہ ۵۶۶ - ۵۶۵)

ذہنی عادات (MENTAL HABITS) حیوانی سطحِ زندگی کی چیز ہے۔ جس بات کو بار بار دہرایا جائے اس سے "عادت" پختہ ہو جاتی ہے جو اس کے بعد از خود MECHANICALLY سرزد ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ جانوروں کو سدھانے کا طریقہ ہی یہ ہے کہ ان سے ایک کام بار بار کرایا جائے۔ اس کا تعلق (MIND) سے نہیں ہوتا۔ دماغ کے میکانکی عمل سے ہوتا ہے۔ حافظہ کا تعلق اس شعور سے ہے جو انسانی سطحِ زندگی کی خصوصیت ہے اس لئے اس کی بنیاد نفسِ انسانی ہے، نہ کہ جسمِ انسانی۔

پروفیسر شروڈنگر نے ایک مختصر لیکن بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے (WHAT IS LIFE) وہ اس کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے۔

"میں" کیا ہے؟

> اگر آپ اس کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ کے مجموعہ سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا بغور مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر حافظہ اور تجربہ کی عمارت اٹھتی ہے.....

انسانی ذات ضائع نہیں ہو سکتی

> اگر کوئی ماہرِ عملِ تنویم ایسا بھی کر دے کہ تمہاری سابقہ یادداشت ذہن سے محو ہو جائے تو تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری "میں" کی موت واقع نہیں ہو جاتی۔ انسانی ذات کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کبھی صفِ ماتم نہیں بچھ سکتی۔ نہ ہی یہ کبھی ضائع ہو سکے گی۔

یہ ہے وہ "میں" (انسانی ذات) جس پر انسانی جسم کے تغیرات کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب انسان کا ہاتھ مفلوج ہو جائے تو انسانی ذات پھر بھی باقی رہتی ہے۔ ٹانگ مفلوج ہو جائے پھر بھی۔ جگر بگڑ جائے پھر بھی۔ دماغ خراب ہو جائے پھر بھی۔ یعنی انسانی جسم کے جتنے حصے (اعضاء و جوارح) جی چاہے خراب اور ختم ہوتے جائیں، اس سے انسانی ذات ختم نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا، اگر انسانی جسم سارے کا سارا ختم (DISINTEGRATE) ہو جائے، تو بھی انسانی ذات کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ یعنی اگر اس کی طبعی موت واقع ہو جائے تو اس کی ذات پھر بھی باقی رہتی ہے۔ موت کا دھچکا انسانی ذات کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیات بعد الممات کہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے باب میں لکھا جا چکا ہے انسانی ذات کی نشوونما مقصدِ زندگی ہے اور یہی اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے۔ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو یہ انسانی جسم کی موت کے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

(تفصیل اس اجمال کی آئندہ ابواب میں ملے گی) اوسپنسکی اس ضمن میں گرجیف کے الفاظ میں کہتا ہے:۔

اگر انسان ہر آن بدلتا ہے. اگر اس میں کوئی شے ایسی نہ ہو جو خارجی تغیّرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی شے ایسی نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے. لیکن اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے. اگر اس میں اس شئے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جئے تو یہ شے کبھی مر نہیں سکتی. عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں. اور اس کے ساتھ ہم بھی بدل جاتے ہیں. اس طرح ہمارے بہت سے "انا" فنا ہوتے ہیں. لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیّرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ اور اس طرح طبعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں.

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی　　وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(جیسا کہ باب اوّل میں کہا جا چکا ہے) ذاتِ خداوندی مکمّل ترین ذات ہے اس کے متعلق قرآن میں ہے.

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ (۲۷-۵۵/۲۶)

کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیّر واقع ہوتا رہتا ہے لیکن یہ خدا کی ذات ہے جو تغیّرات سے ناآشنا ہے. وہ بڑے اجلال و اکرام کی مالک ہے. جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اس میں (حدودِ بشری کے اندر) صفاتِ خداوندی کی نمود ہوتی جاتی ہے. خارجی تغیّرات سے غیر متاثر رہنا خدا کی بنیادی صفات میں ہے. اس لئے ایسا انسان بھی خارجی حوادث سے غیر متاثر رہتا ہے. وہ اقبالؒ کی آرزو ــــ

با اضطرابِ موج، سکون گہر بدہ

فنا میں بقا

کا مظہر بنتا چلا جاتا ہے. عام حالات میں ہماری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ (مثلاً) میں نے رات کو سوتے وقت ارادہ کیا کہ صبح پانچ بجے اٹھوں گا. صبح پانچ بجے الارم بجا. میں جاگ اٹھا. لیکن باہر کی سردی اور لحاف کی خواب آور نرمی اور گرمی سے یہ فیصلہ کر لیا آج نہیں، کل ضرور صبح سویرے اٹھ بیٹھوں گا اور سیر کو جاؤں گا. سوال یہ ہے کہ کیا رات کو فیصلہ کر کے سونے والا "میں" اور صبح کو اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے والا "میں" ایک ہی تھا؟ یا مثلاً میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ میں فلاں معاملہ میں آپ کا ساتھ دوں گا لیکن عین وقت پر میں آپ کا ساتھ چھوڑ جاتا ہوں. سوال یہ ہے کہ کیا وعدہ کرنے والا "میں" اور ساتھ چھوڑنے والا "میں" ایک ہی تھا؟ "میں" کے اس طرح بدل جانے کا مطلب یہ

ہے کہ میری ذات بہت کمزور ہے۔ اس کی نشوونما نہیں ہوئی۔ نشوونما یافتہ ذات کی پہلی پہچان یہ ہے کہ وہ خارجی حوادث سے متأثر ہو کر اپنے فیصلوں کو بدلتی نہیں۔ جن لوگوں کی ذات میں نشوونما شروع ہو جائے (یعنی جماعتِ مومنین) قرآن نے ان کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا...... (۴۱/۳۰) جو ایک دفعہ اس حقیقت پر ایمان لے آتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے تو پھر اس پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مخالفتوں کے ہجوم ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے ان کا ایمان اور محکم ہو جاتا ہے (۳/۱۷۳)۔ انسانی ذات کی نشوونما کی یہ پہلی علامت ہے۔ یہی ذات ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

موت کا احساس بھی اس میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔ انسان میں ہر آن ایک نئی "میں" کا پیدا ہو جانا (یعنی اس کا گھڑی گھڑی بدلتے رہنا) اس کا اپنی ذات کے ساتھ شرک ہے۔ اور شرک انسانیت کے لئے وجہ تذلیل۔ خدا کی احدیت (قل ھو اللہ احد) کے بھی یہی معنی ہیں کہ وہ ذات تغیر پذیر نہیں۔

قرآن میں انسان ہی کا ذکر ہے

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے قرآن کریم نے صفاتِ خداوندی کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ ان صفات میں سے انہیں چھوڑ کر جو ذاتِ خداوندی ہی کا خاصہ ہو سکتی ہیں (مثلاً ھُوَ الْاَوَّلُ وہ ازلی) باقی صفات وہ ہیں جن کی نمود انسانی ذات کے اندر ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ان صفات کا بیان خود انسانی ذات کے لوازم و خصائص کا بیان ہے۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱/۱۰) "ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے کہ اگر تم عقل و فکر سے کام لو تو تمہیں نظر آ جائے کہ اس میں خود تمہارا ہی ذکر ہے۔ یہ صفات متعدد ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو ایک اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان صفات کو سورۂ اخلاص میں (جو یوں تو صرف چار مختصر آیات پر مشتمل ہے لیکن ان آیات کو پھیلائیے تو ان میں کائناتِ ذات کے چاروں گوشے سمٹ کر آ جاتے ہیں)، بڑی جامعیت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی آیت ہے

احدیت

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ (۱۱۲/۱) یعنی ذات کی پہلی خصوصیت احدیت ہے۔ احدیت، بڑی جامع اصطلاح ہے۔ جس کا ترجمہ ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تفرید (UNIQUENESS)، توحید (ONE-NESS) اور وحدت و جامعیت WHOLENESS کے تمام رشتے آ جاتے ہیں۔ ذات، اول و آخر — ظاہر و باطن ذات ہی ہوتی ہے (۵۷/۳)۔ اس میں کسی اور شے کی آمیزش کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

گہریں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ناپختہ خودی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ رات کو سوتے وقت کچھ اور ہوتی ہے اور صبح کو جاگتے وقت کچھ اور۔ وعدہ کرتے وقت کچھ اور، اور وعدہ توڑتے وقت کچھ اور۔ غصے کی حالت میں کچھ اور، اور پشیمانی کے بعد کچھ اور، یہ ذات کی وحدت (توحید) کی علامت نہیں، شرک کی علامت ہے۔ توحید یہ ہے کہ ذات خارجی حوادث یا داخلی جذبات سے متاثر ہو کر بدلتی نہ رہے۔ وہ اپنے خصوص و لزوم میں ہمیشہ یکساں رہے (ذات کی اس خصوصیت کو غیر متبدل اصول یا غیر متغیر قوانین کہتے ہیں)۔ قرآن اسے "سنت اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) "تو کبھی سنت اللہ میں تبدیلی نہیں پائے گا۔" انسانی ذات کی اس خصوصیت کو "کیریکٹر" کہا جاتا ہے۔ بارڈیو کے الفاظ میں ذات کی نمود کیریکٹر میں ہوتی ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ (A.N. WHITE HEAD) نے کہا ہے کہ "ظاہر کا حقیقت کے ساتھ منطبق ہونا صداقت کہلاتا ہے۔" انسانی ذات کے ظہور و بطون میں وحدت، اس کی زندہ شہادت اور واضح دلیل ہوتی ہے۔

انسانی ذات کی انفرادیت INDIVIDUALITY کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ میں اپنے تمام ارادوں، فیصلوں اور اعمال و افعال کا ذمہ دار خود آپ ہوں۔ اس لئے ان کے نتائج و عواقب بھی مجھے ہی برداشت کرنے ہوں گے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت اس بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل

کَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔" اس کا بنیادی اصول ہے۔ اس باب میں نہ کسی کی سفارش کسی کے کام آسکتی ہے نہ فدیہ۔ نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے نہ معاوضہ۔ نہ کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے نہ معاونت۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (۲/۴۸) اسی قانونِ مکافات کی کارفرمائی کا اعلان ہے اور (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہ انسانی ذات کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ جب میرے سر درد کو کسی کی سفارش، کفارہ یا فدیہ دور نہیں کر سکتا تو میرے اعمال کے اثرات کو یہ چیزیں مجھ سے کس طرح الگ کر سکتی ہیں۔ میری جنت اور جہنم ان ہی کے مطابق مرتب ہوگی۔ کوئی دوسرا اس میں دخل نہیں دے سکے گا۔ (تفصیل ان امور کی آئندہ ابواب میں اپنے مقام پر ملے گی)۔

(۲) سورۂ اخلاص کی دوسری آیت ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (۱۱۲/۲)۔ صمدیت ذات کی دوسری خصوصیت ہے۔ یہ بھی ایک جامع لفظ ہے جس کا مفہوم ہے خارجی سہاروں سے مستغنی ہونا۔ اپنے ارادوں کا مالک آپ ہونا۔ اپنے فیصلوں میں خود مختار ہونا۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۲۲/۸) اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۵/۱) جیسے اشارات اسی خصوصیت کے آئینہ دار ہیں۔ ذات کی اس خصوصیت کی بنا پر انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے اور مختلف امکانات POSSIBILITIES میں سے

انتخاب CHOICE کا حق دیا گیا ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) تم جو چاہو کرو اور فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (۱۸/۲۹) "جس کا جی چاہے صداقت کو قبول کرے. جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے". انسان کے لئے ہے. کائنات میں کسی اور شے کو انتخاب اور فیصلہ کا حق نہیں دیا گیا چونکہ اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے اس لئے اس کی نشوونما انہی اعمال سے ہوسکتی ہے جنہیں انسان اپنے اختیار و ارادہ سے بطیب خاطر کرے. نہ مجبوری کی نیکی نیکی ہے، نہ مجبوری کی بدی بدی. لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲۵۶) "دین میں کوئی زبردستی نہیں" کے منشور سے یہی مقصود ہے. انسان کے اختیار و ارادہ کا اس قدر احترام کیا گیا ہے کہ اور تو اور خدا بھی (اپنی لامحدود قوتوں کے باوجود) انسانی آزادی میں دخل نہیں دیتا. یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے جس پر وہ قائم رہتا ہے. علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں.

> خدا بھی ایسا نہیں کرتا کہ میری جگہ خود محسوس کرنا یا حکم لگانا شروع کردے یا یہ کہ اگر میرے سامنے ایک کی بجائے دو راستے ہیں تو وہ میرے لئے خود ایک کا انتخاب کرے.
>
> (خطبات تشکیل جدید (انگریزی) ص۹۵، ۱۹۳۴ء ایڈیشن)

انسان کی انسانیت اس کے اختیار و ارادہ سے وابستہ ہے. یہ ذات کی صفت صمدیت کا تقاضا ہے. واضح رہے کہ ذات کا اپنی مرضی سے اپنے اوپر پابندی عائد کرلینا اس کی آزادی کے منافی نہیں. (آزادی کے منافی وہ پابندی ہے جسے کوئی دوسرا اس کی مرضی کے خلاف عائد کرے). اس قسم کی پابندیاں خود ذات خداوندی نے بھی اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں. مثلاً قرآن میں ہے کہ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴) "تمہارے رب نے رحمت و ربوبیت کو اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے". انسان بھی اپنی ذات کے نشوونما کے لئے جو پابندیاں بطیب خاطر اپنے اوپر عائد کرتا ہے وہ اس کے شرف انسانیت کے منافی نہیں ہوتیں. قرآنی معاشرہ، آزادی اور پابندی کے اسی بنیادی تصور کا مظہر ہوتا ہے جس میں افراد کی ذات نشوونما پاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے.

(۳) سورۃ اخلاص کی تیسری آیت ہے. لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ ۝ (۱۱۲/۳) جس کا عام ترجمہ ہے." نہ اس نے کسی کو بسلسلۂ تولید پیدا کیا ہے. نہ وہ کسی سے بسلسلۂ تولید پیدا ہوا ہے". یہ بھی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے. انسانی جسم بسلسلۂ تولید (PROCREATION) پیدا ہوتا ہے. یہ "پیدائش" کی حیوانی سطح ہے. اس سے ایک فرد اپنے باپ کی اولاد بنتا ہے. اور اسی سے اس کی اولاد پیدا ہوتی ہے. لیکن انسانی ذات پیدائش کے اس سلسلہ کا نتیجہ نہیں. پیدائش بسلسلۂ توالد و تناسل کی صورت میں، باپ کا ایک حصہ اس سے الگ ہوکر بیٹے کے جسم کا جزو بنتا ہے. لیکن ذات ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے. اس کے حصے بخرے نہیں ہوسکتے. اگر ذات کا کوئی حصہ اس سے الگ ہوجائے تو ذات نامکمل رہ جاتی ہے. اور ذات کا نامکمل ہونا ذات کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے.

افزائشِ نسل (یعنی بذریعہ تولید بچے پیدا کرنا) نوعِ انسانی کی بقا، کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ذات کا تقاضا تولید (PROCREATION) نہیں، تخلیق (CREATION) ہے (جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے) یہ خصوصیت انسان کی ہے کہ وہ خالقِ کائنات کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا ہے (اس لئے کہ کائنات میں کسی اور شے کو ذات دی ہی نہیں گئی)۔ یہی وجہِ شرفِ انسانیت ہے۔

(۴) سورۃ اخلاص کی چوتھی آیت ہے۔ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ٥ (۱۱۲/۴) "اس کا ہم پلہ اور ہمسر کوئی نہیں"۔ جس قوم کے افراد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو دنیا کی کوئی دوسری قوم اس قوم کی ہمسر نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے جب جماعتِ مومنین کے لئے کہا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (۳/۱۳۹) "تم سب پر غالب رہو گے" تو اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

(جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآن کریم نے صفاتِ خداوندی کا تعارف نہایت شرح و بسط سے کرایا ہے۔ اور اس کا تذکرہ اس کی آیات میں مختلف مقامات پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ انسانی ذات میں ان صفات کا منعکس ہوتے جانا، اس (ذات) کی نشوونما کی علامت ہے۔ آئندہ باب میں بتایا جائے گا کہ اس نشوونما کا طریقہ (یا اس کے لئے ہدایات) انسان کو ملتی کس طرح سے ہیں۔

جیسا کہ باب اوّل میں بتایا جا چکا ہے، دین کی عمارت، انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس تصوّر یا عقیدہ کو دین کے نظام میں جس قدر اہمیت ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ آئندہ ابواب میں آپ کو جگہ بہ جگہ ذاتِ انسانی کا ذکر نظر آئے گا اور اس کے مختلف خصائص و شئون کی تفاصیل آپ کے سامنے آئیں گی۔ لیکن اس عقیدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، ہم چاہتے ہیں کہ اس مقام پر مختصر الفاظ میں انسانی ذات کے مختلف گوشوں کو دہرا دیا جائے تاکہ آئندہ اوراق میں جہاں جہاں اس کا ذکر آئے، یہ حقائق پیشِ نظر رہیں اور اس کے متعلق کسی مقام پر بھی غلط تصوّر قائم نہ ہو سکے۔ انہیں غور سے دیکھئے۔

(۱) قرآنِ کریم نے ذی حیات مخلوق کے سلسلۂ تخلیق اور اس کی مختلف کڑیوں کا ذکر متعدد مقامات میں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک مقام وہ آتا ہے جہاں عملِ تخلیق بذریعہ تولید و تناسل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یعنی حیوانات کی تخلیق جس میں جنین ایک مدّت تک رحمِ مادر میں پرورش پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں، قرآن نے پہلے ان تمام مراحل کو گنایا ہے جن سے عام حیوانات کے بچے اور انسانی جنین، رحمِ مادر میں گزرتے ہیں۔ مثلاً نطفہ کا لوتھڑے (عَلَقَةً) میں تبدیل ہونا۔ لوتھڑے کا مُضْغَةً (گوشت کے ٹکڑے) کی شکل اختیار کرنا۔ پھر اس میں ہڈیاں (عِظٰمًا) بننا۔ پھر ہڈیوں پر گوشت کا پردہ چڑھنا۔ یہ وہ مراحل ہیں جن میں سے حیوانی اور انسانی جنین ایک ہی انداز سے گزرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن نے، انسانی جنین کے متعلق کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴)

انسان اور دیگر حیوانات میں فرق

"پھر ہم نے اسے ایک جداگانہ قسم کی مخلوق بنا دیا" گویا اس مقام میں پہنچ کر انسان، دیگر حیوانات سے یکسر مختلف ہو گیا۔ دوسرے مقام پر اس مابہ الامتیاز تبدیلی کے متعلق کہا کہ وَ نَفَخَ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (۳۲/۹) "اللہ نے اس میں اپنی روح (توانائی) پھونک دی"۔ یہ ہے وہ خصوصیت جس سے انسان، دیگر حیوانات سے منفرد ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے کائناتی قوتیں (ملائکہ) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔ سورۂ صٓ میں ہے۔ اِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِیۡنَ (۳۸/۷۱-۷۲) "جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی (غیر جاندار مادہ) سے تخلیقِ انسانی (کی ابتداء) کرنے والا ہوں۔ سو جب میں اس کا تناسب درست کر کے اس میں اپنی توانائی پھونک دوں تو تم اس کے سامنے فرمانبرداری کرتے ہوئے جھک جانا"۔

یہ شے جسے خدا نے "اپنی توانائی" کہہ کر پکارا ہے، صرف انسان کو عطا ہوئی ہے اور کسی کو نہیں۔ اس باب میں (کہ انسان، حیوانات سے یکسر جداگانہ مخلوق ہے) ہمارے دَور کا ایک ماہر نظریۂ ارتقاء (SIMPSON) اپنی کتاب (THE MEANING OF EVOLUTION) میں لکھتا ہے۔

> یہ ٹھیک ہے کہ انسان بھی ایک حیوان ہے۔ لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ انسان صرف حیوان ہے.... اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف حیوان ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ان تمام خصائص کے وجود کا انکار کرتے ہیں جو صرف انسان کے اندر ہیں اور باقی حیوانات میں سے کسی میں موجود نہیں.... اس حقیقت کا اعتراف کرنا نہایت ضروری ہے کہ انسان ایک حیوان تو ہے لیکن اس کی ہستی کی انفرادیت کی بنیاد وہ خصوصیات ہیں جن میں کوئی اور حیوان اس کا شریک نہیں۔ فطرت میں انسان کا مقام اور اس مقام کی بلند ترین اہمیت، انسان کی حیوانیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی انسانیت کی وجہ سے ہے..... انسان بالکل ایک نئی قسم کا حیوان ہے۔ ایک ایسا حیوان جس میں اگرچہ طبیعی ارتقاء کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن اس باب میں ایک بالکل نئی قسم کا ارتقاء بھی نمودار ہو رہا ہے۔　(صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۳)

یہ شے عقل نہیں

(۲) یہ شے عقل (INTELLECT) بھی نہیں۔ عقل اور دین کے متعلق چوتھے باب میں بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے اس لئے اس مقام پر اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس اجمالی نکتہ کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی۔ یعنی باب چہارم میں۔

یہ سائیکلوجی سے متعلق "نفس" بھی نہیں

(۳) نہ ہی یہ وہ چیز ہے جسے ماہرینِ علم النفس (PSYCHE) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یا جسے علمِ تحلیلِ نفسی

(PSYCHO ANALYSIS) کی رُو سے تحت الشعور (SUB-CONSCIOUS MIND) کہا جاتا ہے۔

(نہ ہی یہ وہ شے ہے جسے قدیم فلسفہ میں "روح" (SPIRIT) کہتے تھے اور جو مادہ (MATTER) کی نقیض سمجھی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دَورِ حاضر کی تحقیقات کی رُو سے خود مادہ کا وہ تصور ہی باقی نہیں رہا جو اس سے پہلے عام فکرِ انسانی پر چھایا ہوا تھا۔ اب مادہ کوئی ٹھوس شے نہیں رہا۔ سر جیمز جینس اسے محصور لہریں (BOTTLED UP WAVES) کہتا ہے۔ رسل اسے مربوط حوادث (INTER-RELATED EVENTS) کہہ کر پکارتا ہے۔ آئن سٹائن اسے منجمد خیالات CONSIDERED THOUGHTS سے تعبیر کرتا ہے۔ اوسپنسکی اسے محض ایک (CONDITION) قرار دیتا ہے۔ خالص طبعی نقطہ نگاہ سے دیکھئے تو مادی شے چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ ہوتی ہے جنہیں (MOLECULES) کہتے ہیں۔ ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے سے بھی زیادہ چھوٹے چھوٹے عناصر کا مجموعہ ہوتے ہیں جنہیں ATOMS کہا جاتا ہے۔ ان سے آگے جائیے تو یہ الیکٹرون ELECTRONES اور پروٹون PROTONS میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جو برق (ELECTRICITY) کے ذرات کہلاتے ہیں اور جن پر مادہ کی تعریف صادق ہی نہیں آتی۔ اس طرح مادہ (قدیم تصور کے مطابق) خود غیر مادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا روح اور مادہ کی وہ ثنویت، جس نے گزشتہ زمانے کے مفکرین کو اس قدر پریشان کر رکھا تھا، اب عملاً مفقود ہو گئی ہے۔ قرآن، مادہ کے مقابلہ میں، روح (SPIRIT) کا ذکر تک نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اس میں روح بمعنی (SOUL) کا ذکر بھی نہیں۔ وہ مادہ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کو خدا کے "عالمِ امر" سے متعلق بتا کر آگے بڑھ جاتا ہے کیونکہ محسوسات میں گھرا ہوا ذہنِ انسانی، ماورائے محسوسات (عالمِ امر) کی کنہ و حقیقت کا ادراک ہی نہیں کر سکتا۔

لہٰذا، وہ شے جس نے انسان کو دیگر مخلوق سے ممتاز کیا ہے، روح (بمعنی SOUL یا SPIRIT) بھی نہیں۔

(۵) قرآن نے اس "شے" کو عقل (INTELLECT)، شعور CONSCIOUSNESS قلب MIND) یا (PSYCHE روح SPIRIT OR SOUL سے الگ قرار دیا ہے اور اسے نفس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ الشمس میں ہے، وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (۹۱/۷-۱۰) "نفس، اور وہ تمام اسباب و عناصر جو اسے سنوارتے اور تکمیل دیتے ہیں، اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ خدا نے اس کے اندر تشتت و انتشار (DISINTEGRATION) اور ان سے محفوظ رہنے کی صلاحیت، دونوں کے امکانات رکھ دیئے ہیں۔ جس نے اس کی نشوونما کی، وہ کامیاب ہو گیا۔ جس نے اسے دبائے رکھا (اور اُبھرنے اور پھلنے پھولنے نہ دیا) وہ ناکام و نامراد رہا۔" آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح نفسِ انسانی کو ایک منفرد، مخصوص اور مستقل تشخص (ENTITY) قرار دیتا ہے۔ اسی کو انسانی ذات

Margin headings: روح بھی نہیں — یہ النفس، انسانی ذات ہے

(HUMAN PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے اندر امکانی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں ـــــ بننے اور بگڑنے دونوں کی استعداد ـــ

اربابِ علم و فکر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ جب ہم فلسفہ کی اصطلاح میں "انا" (I) کا لفظ بولتے ہیں تو اس کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے لیکن جب ہم روزمرہ کی بول چال میں اس لفظ ("میں" یا (I)) کا استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم کچھ اور قرآن کریم نے بھی، نفس کا لفظ ان مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ روزمرہ کے بول چال میں جیسے ہم "فلاں شخص" یا "اپنا آپ" وغیرہ کہتے ہیں، اس کے لئے بھی نفس کا لفظ آتا ہے اور انسانی ذات کے اصطلاحی مفہوم کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ قرآن کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

(۶) نفسِ انسانی، خدا کا عطا کردہ ہے۔ یہ خدا کی ذات کا جزو نہیں۔ خدا نے اُسے مِنْ رُّوْحِهٖ یا مِنْ رُّوْحِنَا کہا ہے

انسانی ذات خُدا کی ذات کا جزو نہیں

لیکن اپنے آپ (خدا) کو کہیں بھی "روح" سے تعبیر نہیں کیا یعنی اگر قرآن میں یہ لکھا ہوتا کہ خدا روح ہے اور اس نے اس (روح) کا کچھ حصہ انسان کو دے دیا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی ذات، خدا کی ذات کا جزو ہے۔ لیکن قرآن نے کہیں ایسا نہیں کہا اس لئے یہ خدا کی ذات کا جزو نہیں۔ ذات کے اجزاء (حصے) ہو نہیں سکتے۔ انسانی ذات، خدا کی رُوح (توانائی) کی مظہر ہے۔ یعنی اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی حدودِ بشریت کے اندر۔ خدا کی طرح لامحدود و لاانتہا انداز سے نہیں۔

(۷) ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی ذات کو خدا نے "جدید یا منفرد تخلیق" سے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے یہ نہ تو طبیعی ارتقاء (PHYSICAL EVOLUTION) کی پیداوار ہے۔ اور نہ ہی ان طبیعی قوانین کے تابع جن کے مطابق انسانی جسم کی مشینری زندہ اور مصروفِ عمل رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم کی موت سے انسانی ذات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اسے

اخروی زندگی

اُخروی زندگی یا حیات بعد الممات کہتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (۱۷/۴۹) "یہ کہتے ہیں کہ جب ہم (گل سڑ کر) ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ جائیں گے اور بالکل منتشر DECOMPOSED ہو جائیں گے، تو اس کے بعد بھی ایک نئی پیدائش کے لئے اٹھائے جائیں گے؟" یعنی مادی تصورِ حیات کے قائلین کا اعتراض (اور سوال) یہ ہے کہ مادی جسم کے اجزاء کے منتشر ہو جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ کیا اس کے بعد پھر نئی زندگی ملے گی؟ وہ کیسے مل سکتی ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا۔ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ۝ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ۔ ان سے کہو (ہاں، تمہیں مرنے کے بعد کی زندگی

ضرور ملے گی) خواہ تمہارے مادی اجزا مرورِ زمانہ سے پتھر بن جائیں یا لوہے میں تبدیل ہو جائیں۔ یا کوئی اور ایسی مخلوق جس کے متعلق تم خیال کرو کہ اس میں زندگی کی نمود نہیں ہو سکتی۔ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا۔ اس پر یہ کہیں گے کہ ہمیں کون زندگی کی طرف لوٹا کر لائے گا۔ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (۵۱-۵۰/۱۷) ان سے کہو کہ وہی خدا جو تمہیں پہلی مرتبہ عدم سے وجود میں لایا تھا۔ جو خدا نیست (NON-EXISTENCE) سے ہست (EXISTENCE) کی حالت میں لا سکتا ہے، وہ جسم کی موت کے بعد بھی زندگی کو مسلسل جاری رکھ سکتا ہے۔ اس وقت زندگی کا محمل (VEHICAL) "نفسِ انسانی" ہو گا۔ یوں زندگی کی جوئے رواں اس طبیعی زندگی سے آگے چلے گی۔ اگر نفسِ انسانی جسم سے متعلق طبیعی قوانین کے تابع ہوتا تو جسم کی موت کے ساتھ یہ بھی ختم ہو جاتا۔ لیکن یہ جسم کے سہارے زندہ نہیں۔ اس لئے جسم کی موت سے مرتا نہیں۔

(۸) ایک چیز ہے حیات بعد الممات (SURVIVAL AFTER DEATH) اور دوسری چیز ہے حیاتِ جاوداں (IMMORTALITY) حیات بعد الممات تو ہر ذی شعور انسان کے لئے ہے۔ لیکن حیاتِ جاوداں صرف اس ذات کے حصے میں آ سکتی ہے جس کی باقاعدہ نشوونما ہو چکی ہو۔ (اسے تزکیۂ نفس کہتے ہیں)۔ واضح رہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کی تکمیل اسی دنیا میں نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے اسے اُخروی زندگی کی جنت میں مزید مراحل طے کرنے ہوں گے۔ اس دنیا میں اس نشوونما کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگر وہ نشوونما ایک خاص معیار تک جا پہنچتی ہے (جسے قرآن نے ثقل موازین ــ پلڑا جھکنے ــ سے تعبیر کیا ہے (۷-۶/۱۰۱) تو یہ اگلے مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس کی نشوونما رُک جاتی ہے (اسے جہنم کی زندگی کہا جاتا ہے)۔

حیاتِ جاوداں

(۹) انسانی ذات کی جنتِ اُخروی کی زندگی کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ اسے "حیاتِ جاوداں" مل جائے گی۔ اس سے مراد ہے کہ دنیاوی زندگی کی طبیعی موت کے بعد اسے پھر موت نہیں آئے گی۔ یعنی لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (۴۴/۵۶) "یہ لوگ اس میں، اس پہلی موت کے علاوہ (جس کا مزہ وہ پہلے چکھ چکے ہیں) موت کا مزہ نہیں چکھیں گے"۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کریں گے۔ لیکن یہ حیاتِ جاوداں، خدا کی ابدیت جیسی نہیں ہے۔ اُس جیسی ازلیت یا ابدیت کسی کو نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں کے متعلق قرآن میں متعدد بار آیا ہے کہ خٰلِدِيْنَ فِيهَا أَبَدًا۔ وہ جنت میں "ابدی طور پر" رہیں گے۔ لیکن اس ابدیت کے متعلق دوسری جگہ کہہ دیا کہ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ (۱۱/۱۰۸) "وہ اس میں اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان باقی ہیں۔ بجز اس کے جو مشیتِ خداوندی میں ہے۔" (اس آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ اسی طرح ہو۔ یعنی اہل جنت کا خلود اسی وقت تک ہی ہو گا جب تک مشیتِ خداوندی کے مطابق ارض و سمٰوٰت کا قیام و دوام ہے)۔ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر

یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ دوام کب تک ہوگا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ اس کی ابدیت، ذاتِ خداوندی کی ابدیت جیسی قطعاً نہیں۔ حیاتِ جاوداں سے ہمارا مقصد یہی ہے۔

(۱۰) انسانی زندگی کا مقصود، ذاتِ انسانی کی نشوونما ہے۔ قرآن نے وہ ضابطہ عطا کیا ہے جس کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، لہٰذا قرآن کی رُو سے "اخلاقیات" سے مقصد اتنا ہی نہیں کہ ان کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے تو امن و سلامتی کی زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لہٰذا عملِ خیر اسے کہتے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشوونما ہو اور عملِ شر وہ جس سے اس کی نشوونما رُک جائے۔

خیر اور شر

یہی معیار، ایک اچھی اور بُری (صحیح اور غلط) مملکت کا یا معاشرہ کا ہے۔ جس مملکت یا معاشرہ میں افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے، وہ حق (قرآنی اقدار) کے مطابق ہے۔ جس میں انسانی ذات کی نشوونما رُک جائے، وہ باطل ہے۔ اسی کو آزادی اور محکومی کہتے ہیں۔ جن افراد کی ذات کی نشوونما ہو، وہ آزاد ہیں۔ جن کی نشوونما رُک جائے وہ محکوم اور غلام ہیں، خواہ ان کی اپنی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ نظامِ سیاست و معاشرت کی عمارت بھی کس طرح انسانی ذات کے عقیدہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور اخلاقیات کا نظام بھی کس طرح اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے۔

(۱۱) جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین، مستقل اقدار کہلاتی ہیں جن کا تفصیلی ذکر ایک الگ باب میں ملے گا۔ اس مقام پر، ایک مرکزی نقطہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ انسانی جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ شخص خود کھائے یا استعمال کرے۔

انسانی ذات کی پرورش "دینے" سے ہوتی ہے

اس کے برعکس، انسانی ذات کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے۔ بالفاظِ دیگر جسم کی پرورش "لینے" سے ہوتی ہے۔ ذات کی پرورش "دینے" سے۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸) وہ شخص جو ہر اس چیز کو جو اس کے پاس ہے (اور اس کی ضروریات سے زاید ہے ۲/۲۱۹) دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اور جس کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے وہی مقصدِ حیات میں کامیاب ہوتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی (۸۷/۱۴)۔ (تفصیل ان امور کی اگلے باب میں ملے گی)۔ قرآن کا معاشی نظام اسی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔

آپ تاریخِ انسانی پر غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ طلسمِ پیچ و تاب

بنائے رکھا ہے، یہ ہے کہ

اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد

(۱) مختلف افراد میں کمانے کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔
(۲) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو زیادہ کماتا ہے، اس کے پاس اس کی ضروریات سے زیادہ دولت آجاتی ہے۔
(۳) جس کی کمانے کی استعداد کم ہوتی ہے، اس کی کمائی اس کی ضروریات کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی۔
(۴) معاشرہ کا توازن قائم رکھنے اور افراد کی پرورش کے لئے ضروری ہے کہ جن کے پاس زائد دولت (SURPLUS MONEY) ہے، ان کی دولت اُن پر صرف کی جائے جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔
(۵) سوال یہ ہے کہ جن کے پاس فاضلہ دولت ہے وہ اپنی دولت دوسروں کو کیوں دے دیں؟

اخلاقیات کی تدبیر یہ ہے کہ دولت مندوں کو انسانی ہمدردی کا واسطہ دلا کر ان کے جذبات کو اپیل کیا جائے تا کہ وہ اپنی دولت خیرات میں دیں۔ لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ یہ اپیلیں بہت کم کامیاب ہوتی ہیں اس لئے یہ بھی اس سوال کا تسلی بخش حل نہیں ہو سکتا۔ نیز جن لوگوں کی پرورش خیرات سے ہو ان کی خودی (ذات) تباہ ہو جاتی ہے، ان میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی یہ تدبیر صحیح نہیں قرار پا سکتی۔ دنیا کی حکومتیں اس کے لئے ٹیکس عائد کرتی ہیں اور یوں مالداروں سے ان کی فاضلہ دولت حاصل کرتی ہیں۔ مالدار اسے جبر خیال کرتے ہیں اور ایسے حربے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ حکومت کی دستبرد سے بچ جائیں۔ اس سے معاشرہ میں بددیانتی کا مرض عام ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہتے ہیں تو وہ زیادہ کمانا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم جان مار کر ایسی دولت پیدا کریں جو ہمارے پاس رہ نہیں سکتی۔ ہم کیوں نہ اتنا ہی کمائیں جتنا ہمارے پاس رہ سکے۔ اس سے معاشرہ کی پیداوار پر سخت مضر اثر پڑتا ہے۔ یہ ہے وہ مشکل جس میں آجکل اشتراکی نظام بُری طرح پھنسا ہوا ہے یعنی اسے وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) نہیں ملتا جس سے لوگ پوری پوری محنت کر کے ملک کی دولت بڑھائیں اور اس میں صرف اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی حکومت کے سپرد کر دیں۔

یہ جذبۂ محرکہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے جو کہتا ہے کہ جو شخص جس قدر زیادہ کما کر، اپنی فاضلہ دولت، دوسروں کی پرورش کے لئے دے گا اتنی ہی زیادہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہو گی۔ اس عقیدہ کے مطابق ہر فرد کا سب جان مار کر محنت کرتا ہے۔ لیکن فاضلہ دولت اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اس سے ایک طرف نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کٹ جاتی ہے (کیونکہ اس نظام کی بنیاد ہی

اس مشکل کا حل

"فاضلہ دولت" پر ہے) اور دوسری طرف اس مشکل کا اطمینان بخش حل بھی مل جاتا ہے جس کی وجہ سے اشتراکی نظام کو پہلے استبداد کا ہنٹر ہاتھ میں لینا پڑا اور اب وہ بُری طرح ناکام ہو رہا

ہے۔ (ان امور کی تفصیل اپنے اپنے مقام ملے گی)۔

(۱۲) تصریحاتِ بالائے انسانی ذات کے بنیادی خصائص بھی آپ کے سامنے آگئے اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ اسلامی نظامِ معاشرت و معیشت اور اخلاق و سیاست کی عمارات کس طرح اس بنیاد پر استوار ہوتی ہیں۔ آئندہ ابواب میں اس اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔
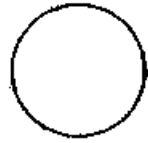
1- A PHILOSOPHY OF RELIGION; P-196
2- "NICOLAS BERDVAEV" IN "SLAVERY AND FREEDOM"
3- MATTER AND MEMORY BY HENRY BERGSON
4- WHAT IS LIFE BY ERVIN SCHRODINGER
5- IN SEARCH OF THE MIRACULOUS
6- SLAVERY AND FREEDOM
7- "TRUTH IS THE CONFIRMATION OF APPEARANCE TO REALITY" A.N. WHITEHEAD IN "ADVENTURES OF IDEAS"
8- THE MYSTERIOUS UNIVERSE
9- QUOTED BY "IQBAL" IN HIS "LECTURES"
10- TERTIUM ORGANUM
11- HUMAN DESTINY

باب سوم

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جا چکا ہے کائنات کی کوئی شے پہلے ہی دن اپنی مکمل شکل میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ اس کا آغاز ابتدائی نقطۂ تخلیق سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ارتقائی سفر شروع ہوتا ہے۔ اس سفر کی ہر منزل میں وہ حشو و زوائد سے پاک صاف ہو کر، بنتی، سنورتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے تا آنکہ اس آخری منزل تک پہنچ جاتی ہے جو اس کے لئے (مشیت کے پروگرام کی رُو سے) مقرر ہے۔ وہ ان تمام منازل کو اس راہ نمائی کی رُو سے طے کرتی ہے جو اسے خالقِ کائنات کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ ہے سلسلۂ تخلیق و ارتقار کی وہ عظیم حقیقت جسے قرآن نے چار الفاظ میں بیان کر دیا ہے جب فرمایا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ۝ (۸۷/۳-۲) خدا وہ ہے جو ہر شے کا تخلیقی آغاز کرتا ہے۔ پھر اسے بنا سنوار کر اس میں اعتدال پیدا کرتا ہے۔

اشیائے کائنات کے لئے راہ نمائی

پھر اس کے لئے ایک اندازہ مقرر کرتا ہے کہ اس نے کس حد تک آگے جانا ہے اور کیا بننا ہے۔ اور ان تمام مراحل کو طے کرنے کے لئے اسے راہ نمائی دیتا ہے۔ زیرِ نظر موضوع کا تعلق اس آیت کے آخری حصے (یعنی فَھَدٰی) سے ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اشیائے کائنات کو ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے راہ نمائی بھی خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر کائنات کی ہر چیز شاہد ہے، اس لئے اس کے لئے کسی نظری دلیل یا ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ "ہدایت" (راہ نمائی) ہر شے کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔

کائنات کی طرف وحی

اسے قرآن نے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے[۱]۔ (وحی کے معنی ہیں خفیف لیکن تیز اشارہ) چنانچہ کائنات کائنات میں تیرنے والے عظیم الجثہ کرّوں کے متعلق

---

[۱] پروفیسر گیلووے اس باب میں لکھتا ہے۔ "وسیع معنوں میں دیکھا جائے تو نظامِ فطرت خود وحی ہے اس لئے کہ اس نظام سے ایک ایسا مقصد اور مفہوم سامنے آتا ہے جس کا سرچشمہ خود (علم) الٰہی ہے۔" (صفحہ ۵۸۲)

ہے۔ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲) "خدا نے ہر کرّے کی طرف اس کے متعلق وحی کردی۔" زمین کے متعلق ہے ۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا (۹۹/۲) "وہ ایسا اس لئے کرے گی کہ اس کے نشوونما دینے والے نے اسے اس کی وحی کردی ہے۔" بے جان اور غیر نامی اشیاء سے ہٹ کر جاندار چیزوں کی طرف آیئے تو وہاں بھی خدا کی وحی اسی طرح کارفرما ہے۔ چنانچہ شہد کی مکھی کے متعلق ہے وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ ..... مِمَّا يَعْرِشُوْنَ (۱۶/۶۸) "تیرے نشوونما دینے والے نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کردی ہے کہ وہ پہاڑوں میں، درختوں پر، ٹٹیوں پر اپنا گھر بنائے۔" سورۂ نور میں اس تفصیل کو سمٹا کر دو لفظوں میں بیان کردیا ہے جہاں کہا کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ ..... يَفْعَلُوْنَ (۲۴/۴۱) "کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے، نیز پرندے جو فضا میں اس طرح پر پھیلائے ہوئے اڑتے رہتے ہیں خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل

اشیائے کائنات کی صلوٰۃ و تسبیح

رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اُس راستے کو بھی جانتا ہے جس پر اسے قانونِ خداوندی کے اتباع میں چلنا ہے اور ان فرائضِ زندگی کو بھی جن کی خاطر اسے مصروفِ تگ وتاز رہنا ہے (اس اہتمام کے باوجود انہیں ویسے ہی نہیں چھوڑ دیا گیا) ان پر قانونِ خداوندی کی نگاہ مسلسل متواتر رہتی ہے تاکہ وہ اس کا جائزہ لیتا ہے کہ یہ اپنے اپنے فرائض کو کس طرح سرانجام دیتے ہیں۔" (اس آیت میں "صلوٰۃ" اور "تسبیح" کے الفاظ قابلِ غور ہیں)۔

اس حقیقت کو سورۂ انعام میں یوں بیان کیا گیا ہے (۶/۳۸)۔ "زمین میں کوئی چلنے والا جانور ایسا نہیں اور نہ ہی اپنے بازوؤں پر اڑنے والا کوئی پرندہ، کہ وہ سب تمہارے جیسے انواع (SPECIES) نہ ہوں۔ کوئی شے ایسی نہیں جس کے لئے کتابِ کائنات میں ضروری ہدایت موجود نہ ہو۔ یہ سب اس کے قانون کے محور کے گرد جمع ہوتے ہیں۔"

یہ وہ راہ نمائی ہے جسے عام اصطلاح میں جبلّت (INSTINCT) کہتے ہیں یا اقبالؒ[1] کے الفاظ میں (TRACKLESS WAY OF A BIRD) "ایسا راستہ جس پر کوئی نشانات نہ ہوں۔" آپ "مہاجر پرندوں" (MIGRATORY BIRDS) کو دیکھئے وہ کس طرح سمندر کی پہنائیوں، جنگلوں اور صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے ہزار ہا میل کی مسافت کے بعد یوں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے ہیں گویا کوئی ان کا ہاتھ پکڑے وہاں تک لے آیا ہے۔ یہ اشیائے کائنات کی پہلی خصوصیت ہے۔ یعنی انہیں ان کے فرائضِ زندگی اور وظائفِ حیات کے متعلق راہ نمائی قدرت کی طرف سے ملتی ہے اور یہ راہ نمائی ہر شے (اور ایک نوع کے ہر فرد) کے اندر ودیعت کرکے رکھ دی گئی ہے۔ ایک نوع کے ہر فرد سے مراد یہ ہے کہ (مثلاً) مرغ ایک نوع ہے۔ یہ راہ نمائی مرغی کے ہر بچے کو قدرت کی طرف سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (مثلاً) ایک مرغی کے نیچے، سینے کے لئے کچھ انڈے مرغی کے اور کچھ بطخ

[1] (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHTS IN ISLAM)

کے رکھ دیئے جائیں اور سب انڈوں سے ایک ہی وقت میں بچے نکلیں تو بطخ کے بچے پانی کی طرف لپکیں گے اور مرغی کے بچے خشکی پر رہیں گے۔ اور ان میں سے ہر بچہ ایسا ہی کرے گا خواہ وہ افریقہ کے صحرا میں ہو یا نیویارک کے شہر میں۔

اشیائے کائنات کی مجبوری

اشیائے کائنات کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جو ہدایت انہیں قدرت کی طرف سے ملتی ہے وہ اس پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ جی چاہے تو اس راہ نمائی کے مطابق چلیں اور جی چاہے تو اس کے خلاف راستہ اختیار کر لیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ ..... (۱۶/۴۹)
"کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جس قدر ذی حیات (چلنے والے) ہیں۔ نیز تمام کائناتی قوتیں سب خدا کی راہ نمائی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور وہ اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتیں"۔ اسے ان اشیاء کی فطرت کہتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ

(۱) کائنات کی ہر شے کو راہ نمائی خدا کی طرف سے ملتی ہے جس کے مطابق وہ اپنے ارتقائی مدارج طے کر کے منزل مقصود تک پہنچ جاتی ہے۔

(۲) ہر شے اس راہ نمائی کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ اس کو اس شے کی فطرت کہتے ہیں جسے وہ بدل نہیں سکتی۔ اب آگے بڑھیئے۔

انسان بھی مخلوقِ خداوندی کے زمرے میں داخل ہے اس لئے اسے راہ نمائی دینا بھی خدا کے ذمے ہے۔ لیکن اس باب میں اس کی کیفیت دیگر اشیائے کائنات سے مختلف ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ (مثلاً) حیوانات میں ہر نوع اور نوع کے ہر فرد کو وہ راہ نمائی جس کے مطابق اس نے زندگی بسر کرنی ہوتی ہے پیدائشی طور پر از خود ملتی ہے۔ انسان کی طبعی زندگی دیگر حیوانات کی طرح ہے۔ اس لئے حیوانی بچہ بھی دیگر حیوانی بچوں کی طرح اپنے طبعی تقاضوں کے لئے راہ نمائی اپنی پیدائش کے ساتھ لاتا ہے۔ وہ بھی اس دنیا میں آتے ہی بھوک کے لئے دودھ کے چشموں کی طرف لپک جاتا ہے اور اپنی جبلی راہ نمائی سے دودھ پینے کا ڈھنگ سیکھتا ہے۔ لیکن وہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے اس میں اور دیگر حیوانی بچوں میں فرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً اگر مرغی کا بچہ شروع میں پانی سے دُور بھاگتا تھا تو وہ آخر وقت تک پانی سے محترز رہے گا۔ لیکن انسانی بچے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دے گا۔ کبھی پانی کے ٹب میں جا گرے گا اور ڈبکیاں لگائے گا۔ کبھی مرچیں آنکھوں کو لگائے گا۔ کبھی کوئلہ مُنہ میں ڈال لے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان معاملات میں اسے فطرت کی طرف سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے تقاضے محض طبعی تقاضے نہیں۔ انسانی تقاضے بھی ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس کی زندگی محض حیوانی

زندگی نہیں انسانیت کی زندگی بھی ہے۔ فرائض کا احساس، لغزش پر ندامت، مستقبل پر نگاہ، یہ سب انسانی زندگی کے مظاہر ہیں۔ بنیادی طور پر سمجھا جائے تو انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں بلکہ (جیسا کہ سابقہ ابواب میں بتایا جاچکا ہے) جسم کے علاوہ

انسانی ذات کی نشوونما

اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح جسم کی پرورش اس کی حیوانی زندگی کا تقاضا ہے اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما اس کی انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے انسان کو فطرت کی طرف سے کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔ بالفاظِ دیگر خیر اور شر کی تمیز انسان کے اندر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "انسان شر کو بھی اسی طرح پکار پکار کر بلاتا ہے جس طرح خیر کو۔ یہ بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے" (۱۷/۱۱)۔ یہ پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپک کر جاتا ہے، خواہ وہ آخر الامر اس کے حق میں کتنے ہی نقصان رساں کیوں نہ ثابت ہوں۔

ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال چلا آرہا ہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ اس خیال کی تائید میں قرآن کریم کی ایک آیت بھی پیش کی جاتی ہے۔ یعنی وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰھَا ..... دَسّٰھَا (۹-۱۰/۹۱)۔ اس آیت (فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَا) کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے انسانی نفس کو نیکی اور بدی کا الہام کر دیا ہے۔" لیکن نہ صرف

نیکی اور بدی کی تمیز انسان کے اندر نہیں

یہ کہ اس آیت کا ترجمہ صحیح نہیں، یہ پورے کا پورا تصور ہی قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اگر نیکی اور بدی کی تمیز ہر فرد کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے تو حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے رشد و ہدایت کا سلسلہ بے معنی قرار پا جاتا ہے۔ اس قسم کی تمیز دیگر اشیائے کائنات میں (مثلاً حیوانات میں) تو رکھ دی گئی ہے۔ اس لئے ان کی طرف کسی نبی کے بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پھر یہ کہ یہ چیز ہمارے تجربہ اور مشاہدہ کے بھی خلاف ہے۔ انسانی بچہ جس قسم کے ماحول میں پرورش اور تربیت پاتا ہے اسی قسم کے خیالات و معتقدات لے کر پروان چڑھتا ہے۔ جینی بچے کے نزدیک گوشت نہایت قابلِ نفرت شے ہے لیکن مسلمان بچہ گوشت مزے لے لے کر کھاتا ہے۔ لہٰذا یہ تصور غلط ہے کہ نیک و بد کی تمیز اور خیر و شر کی تفریق انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ سورۃ والشمس کی جو آیات اوپر درج کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ نفسِ انسانی (انسانی ذات) میں یہ امکانی صلاحیت و استعداد رکھ دی گئی ہے کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو محفوظ رکھ لے اور چاہے اپنی تخریب کر لے۔ جو فرد اس کی نشوونما کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔ جو اسے دبائے رکھے گا وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ دراصل ان آیات میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ انسانی ذات نشوونما اور ارتقا یافتہ شکل میں نہیں دی گئی۔ وہ صرف امکانی صلاحیتوں (POTENTIALITIES) کا مجموعہ ہے۔ اگر انسان ان صلاحیتوں کی صحیح پرورش کرلے تو انسانی ذات نشوونما یافتہ

(DEVELOPED) ہوجاتی ہے. اگر ایسا نہ کرے تو وہ تباہ ہوجاتی ہے. اس میں محفوظ رہنے اور تباہ ہونے کے امکانات (POSSIBILITIES) موجود ہیں.

فطرت اللہ کا مفہوم

اس ضمن میں ایک اور غلط تصور بھی ہمارے ہاں مروّج ہے. اور وہ یہ کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے یعنی جو فطرت خدا کی ہے وہی فطرت انسان کی ہے اور اسلام دینِ فطرت ہے. یعنی یہ دین انسان کی اس فطرت کے مطابق ہے جو فطرت اللہ پر متفرع ہے. اس غلط تصور کی تائید میں سورۂ روم کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے. فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (۳۰/۳۰). حالانکہ اس آیت میں بلکہ زمانہ نزولِ قرآن کی عربی زبان میں) لفظ "فطرت" ان معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوتا تھا جن معنوں میں یہ اب استعمال ہوتا ہے. اب اس سے مراد NATURE لی جاتی ہے. عربی زبان اور قرآن میں فَطَرَ کے معنی ہیں کسی چیز کو پہلی بار پیدا کرنا (قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ ۱۷/۵۱ قرآن میں آیا ہے) لہٰذا فطرت کے معنی ہیں خدا کا قانونِ تخلیق. اس اعتبار سے سورۂ روم کی مندرجہ صدر آیت کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انسان کو بھی اپنے اسی قانونِ تخلیق کے مطابق پیدا کیا ہے جس کے مطابق نے کائنات کی دوسری اشیاء کو پیدا کیا ہے.

انسان خدا کی فطرت پر پیدا نہیں ہوا

اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس سے خود خدا کی فطرت کا جو نقشہ مرتب ہوتا ہے وہ کبھی خدا کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا. مثلاً انسان کے متعلق قرآن میں ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۴/۲۸) "انسان کو بڑا ہی کمزور پیدا کیا گیا ہے." یہ جھٹ لغزش کھا جاتا ہے. یا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (۲۱/۳۷). انسان بڑا ہی جلد باز ہے. وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱). اسی طرح دوسری جگہ ہے. وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) "انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے." یا كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰) "یہ بڑا ہی کم ظرف اور تنگ نظر واقع ہوا ہے." اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹) انسان بڑا بے صبرا پیدا کیا گیا ہے." كَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) "یہ بڑا جھگڑالو ہے." اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲) "انسان بڑا ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے." یہ ہیں "انسان کی فطرت" کے وہ نمایاں خط و خال جن کا ذکر خدا نے قرآن میں کیا ہے. اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) خود خدا کی فطرت بھی ایسی ہی ہے. لہٰذا یہ تصور بھی غلط ہے کہ انسان کی فطرت وہی ہے جو خدا کی فطرت ہے انسان کی کوئی فطرت نہیں.

انسان کی فطرت کوئی نہیں

"انسان کی کوئی فطرت نہیں" ایک عظیم انقلابی اعلان ہے جو اس خیال کے یکسر خلاف جاتا ہے جو دنیا میں بطور مسلّمہ مانا جاتا ہے۔ "انسانی فطرت" ایک ایسی اصطلاح ہے جو صدیوں سے انسان کے کان میں پڑتی چلی آرہی ہے اور اس طرح اس نے ایک حقیقتِ ثابتہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن اصل یہی ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ فطرت کسی شئے کی ان بنیادی خصوصیات کو کہا جاتا ہے جو پیدائش سے اس کے اندر ودیعت کرکے رکھ دی گئی ہوں اور جن کے مطابق وہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ آگ کی فطرت ہے کہ وہ حرارت پہنچائے۔ بکری کی فطرت ہے کہ وہ گھاس کھائے شیر کی فطرت ہے کہ وہ گوشت کھائے، گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ یہ تمام اشیائے کائنات اور حیوانات اپنی اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنی فطرت بدل نہیں سکتے۔ فطرت ہوتی ہی غیر متبدل ہے۔ جہاں تک انسان کی حیوانی سطح کی زندگی (یعنی طبیعی زندگی) کا تعلق ہے، اس پر قوانینِ فطرت اسی طرح حاوی ہیں جس طرح دیگر حیوانات پر۔ لیکن اس کی انسانی سطح کی زندگی میں کوئی شے ایسی نہیں جسے اس کی فطرت کہا جائے۔ "انسانی" فطرت کے متعلق یہی غلط تصور تھا جس سے ایک گروہ نے یہ کہہ دیا کہ بدی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ عقیدہ کہ "ہر انسانی بچہ گناہگار پیدا ہوتا ہے" اسی غلط تصور کی تخلیق ہے۔ دوسری طرف متفاول طبقہ (OPTIMIST) ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے۔ یہ دونوں تصور باطل ہیں۔ انسان نہ فطرتاً نیک ہے نہ بد۔ اس میں کچھ صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں اور وہ بھی غیر نشوونمایافتہ شکل میں (UN-DEVELOPED)۔ یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ (i) وہ ان صلاحیتوں کی نشوونما کرے یا انہیں ویسے ہی (UN-REALISED) چھوڑ دے۔ اور (ii) جب ان کی نشوونما کرے تو انہیں جس طریق پر چاہے استعمال کرے۔ اگر یہ انہیں نوعِ انسانی کے تعمیری مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے، تو اسے نیکی کہا جائے گا۔ اگر انہیں تخریبی امور میں استعمال کرتا ہے تو یہ بدی کہلائے گی۔ وحی کی راہ نمائی سے ان صلاحیتوں کو نشوونما دینے کا طریق اور ان کا صحیح مصرف بتاتی ہے۔ یہ جو ادبر قرآن کریم کی بعض آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان ایسا ہے، اور ایسا ہے۔ تو اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر انسان وحی کی روشنی میں نہ چلے اور اپنے طبیعی تقاضوں کی تسکین ہی کو اپنا مقصودِ زندگی قرار دے لے، تو پھر وہ اس قسم کا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو وحی کی راہ نمائی میں استعمال کرے تو پھر اس کی صفات وہ ہوں گی جنہیں قرآن "مومن کی زندگی" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسی زندگی جو خود اپنی اندرونی کشمکش سے بھی امن میں ہو اور جس سے پوری انسانیت امن میں رہے۔

اسے پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ "فطرت" اور "اختیار و ارادہ" دو متضاد چیزیں ہیں۔ فطرت، مجبور کی ہوتی ہے۔ صاحبِ اختیار و ارادہ کی نہیں ہوتی۔ اور چونکہ انسان کو، اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی فطرت کوئی نہیں ۔۔ نہ نیک نہ بد۔

یہ نیک یا بد اپنے اختیاری اعمال سے بنتا ہے۔

ضمیر کی آواز جس طرح یہ تصور صحیح نہیں کہ خیر اور شر کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر رکھ دی گئی ہے اسی طرح یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ انسان کے اندر ایک اور شے ہے جسے اس کی ضمیر کہتے ہیں اور جو خیر اور شر نیکی اور بدی میں تمیز کر دیتی ہے۔ (اسی لئے کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی ضمیر کی آواز کے تابع چلنا چاہیئے)۔ یہ تصور بھی غلط ہے ضمیر کی آواز انسان کے ابتدائی ماحول، تعلیم، تربیت، معاشرہ کی فضا سے مرتب ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت (SOCIETY INTERNALISED) ہوتی ہے (جس طرح تقلید (SOCIETY DIVINISED) ہوتی ہے[1])۔

ان مختصر اشارات سے واضح ہے کہ خدا کی طرف سے راہ نمائی دیئے جانے کا جو طریق کائنات کی دیگر اشیاء کے سلسلہ میں اختیار کیا گیا تھا، انسان کے سلسلہ میں وہ طریق اختیار نہیں کیا گیا۔

انسان کے لئے راہ نمائی انسان کی صورت میں یہ طریق اختیار کیا گیا کہ خود انسانوں میں سے ایک شخصیت کو منتخب کر کے اسے وہ راہ نمائی بذریعہ وحی دے دی جاتی، جس کی روشنی میں چل کر کاروانِ انسانیت اپنی منزل تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ منتخب فرد (جسے نبی اور رسول کہہ کر پکارا گیا ہے) اس راہ نمائی کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا۔ سورۂ اعراف میں ہے (۷/۳۵) "اے نوعِ انسان! جب تمہاری طرف تم میں سے میرے رسول آئیں اور میرے احکام تمہارے سامنے پیش کریں تو تم میں سے جو ان قوانین کی نگہداشت کرے گا اور اپنی اصلاح کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن"۔ ہم نے (سابقہ صفحات میں) دیکھا ہے کہ جو راہ نمائی خدا کی طرف سے کسی نوع کے فرد کو براہِ راست ملتی ہے (مثلاً حیوانات کو) وہ فرد اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اس لئے اس کی صورت میں راہ نمائی دیئے جانے کا وہ طریق تجویز کیا گیا ہے جس میں اس کا اختیار و ارادہ سلب نہ ہو۔ یہی وجہ ہے

انسانی اختیار و ارادہ کہ خدا نے اس طریق راہ نمائی کی وضاحت کے بعد کہہ دیا کہ اس باب میں ہر فرد آزاد ہے کہ اس کا جی چاہے تو اس کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو اس کے خلاف روش اختیار کرلے (۱۸/۲۹)۔ وہ جونسی روش اختیار کرے گا اس کے مطابق نتائج مرتب ہو جائیں گے۔

جس طرح وہ وحی جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے ان اشیاء کی پیدا کردہ نہیں ہوتی (خدا کی طرف سے وہی

---

[1] چونکہ میں اپنی دیگر تصانیف اور مقالات میں ان تمام عنوانات پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وحی اکتسابی نہیں ہوتی

طور پر ملتی ہے) اسی طرح جو وحی خدا کی طرف سے انبیاء کرامؑ کو دی جاتی ہے وہ بھی ان کی اپنی عقل و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر صاحبِ وحی اپنی کوشش اور محنت سے حقیقت کا انکشاف (DISCOVER) نہیں کرتا۔ حقیقت اپنے آپ کو خود اس پر منکشف (REVEAL) کرتی ہے۔ وحی کے اس طرح خارج سے ملنے (OBJECTIVITY) کو قرآن، نزول کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق انسان کے اندر سے اُبھر کر باہر آنے کی بجائے، انسان کو خارج سے ملتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ (۳۹/۲) "ہم نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے۔" نزولِ وحی سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان کو کسب و ہنر اور محنت و ریاضت سے نہیں ملتی، بلکہ جس فرد کو خدا خود منتخب کرے اسے بلاسعی و کاوش مل جاتی ہے۔ وَاللّٰہُ یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ (۲/۱۰۵) "اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے۔" اس میں صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا شائبہ تک نہیں ہوتا (۵۳/۴-۳)۔ وہ اپنے خیالات و رجحانات و میلانات سے کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ وحی ہوتی ہے جو اس پہ نازل کی جاتی ہے چونکہ ہم وحی کی کیفیت کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس لئے اس بات کا سمجھنا ہمارے لئے مشکل (بلکہ ناممکن) ہے کہ ایک شعبہ میں وہ ایسی باتیں کرے جو (دوسرے انسانوں کی طرح) اس کے اپنے فکر و اختیار کا نتیجہ ہوں اور دوسرے شعبے میں وہ ایسے حقائق بیان کرے جو نہ اس کی اپنی عقل و فکر کا نتیجہ ہوں اور نہ ہی اس نے انہیں کسی سے پڑھا سنا یا سیکھا ہو۔ لیکن نبی کی زندگی اس قسم کے دو شعبوں میں منقسم ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مخالفین حضورؐ سے کہتے کہ وہ ان قوانین میں تھوڑا سا ردّ و بدل کر دیں جو ان کے سامنے پیش کئے جاتے تھے تاکہ باہمی مفاہمت (COMPROMISE) کی کوئی شکل پیدا ہو سکے تو ان کے جواب میں کہہ دیا جاتا کہ قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ...... اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ (۱۰/۱۵) "میرے لئے یہ ناممکن ہے کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی ردّ و بدل کر دوں۔ میں تو بس اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف بذریعہ وحی بھیجا جاتا ہے۔"

نبی کو اس کا علم تک نہیں ہوتا

چونکہ وحی فردِ متعلقہ کے اپنے کسب و ہنر اور سعی و کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتی تھی اس لئے اُسے (قبل از نبوت) اس کا علم و احساس تک بھی نہیں ہوتا تھا کہ اسے وحی مل جائے گی۔ سورۃ شوریٰ میں ہے۔ وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا کُنۡتَ تَدۡرِیۡ مَا الۡکِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ (۴۲/۵۲) "اس طرح ہم نے تیری طرف اپنے عالمِ امر سے وحی نازل کی ہے (حالانکہ) اس سے پہلے تو جانتا ہی نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے" حتیٰ کہ اسے اس کی توقع تک نہیں ہوتی تھی (وَمَا کُنۡتَ تَرۡجُوۡۤا اَنۡ یُّلۡقٰۤی اِلَیۡکَ الۡکِتٰبُ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنۡ رَّبِّکَ (۲۸/۸۶) "تجھے اس کی امید ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ تیری طرف یہ کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ خالص رحمتِ خداوندی کا نتیجہ ہے۔ جو تو صاحبِ وحی ہو گیا۔"

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص یونہی راستے پر چلتا مل جاتا' وحی کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا جاتا۔ بالکل نہیں ۔جس ذاتِ گرامی کو آخرالامر وحی دی جانی مقصود ہوتی' اُس کی تربیت شروع سے ہی خود خدائے تعالیٰ کی زیرِ نگرانی ہوتی چنانچہ

نبی کی تربیت

حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں قرآن میں ہے کہ جب انہیں طُور کی چوٹیوں پر وحی سے سرفراز کیا گیا تو انہوں نے اپنے جذبات سپاس گزاری کے اظہار کے طور پر خدا سے کہا کہ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ ہمارا پہلا احسان نہیں جس کے لئے تم شکرگزار ہو رہے ہو۔ ان احسانات کا سلسلہ اس سے بہت پہلے سے شروع ہے' اس دن سے' جب تمہاری پیدائش ہوئی تو ہم نے تمہاری ماں سے کہا کہ تمہیں صندوق میں ڈال کر دریا میں بہادے۔ پھر تمہاری پرورش فرعون کے محلات میں ہوئی تاکہ تم محکوم قوم کا فرد ہوتے ہوئے بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں سے واقف ہو جاؤ (کیونکہ تمہیں آخرالامر ان کے مقابلہ میں آنا تھا)۔ پھر وہاں سے تمہیں مدین کی وادیوں میں لے جایا گیا تاکہ تم فطرت کی کھلی فضا میں زندگی کے کچھ دن گزارو۔ تم نے آخرکار بنی اسرائیل کی تربیت انہی وادیوں میں کرنی تھی۔ جب تم دلے موسیٰؑ! ان تمام مراحل سے گزارے گئے ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى تب کہیں جا کر تم ہمارے پیمانے پر پورے اُترے۔ وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (۲۰/۴۱-۲۷) اور ہم نے تمہیں اپنے مشن کے لئے منتخب کیا۔ یہ نہیں کہ

آگ لینے کو آئے پیغمبری مل جائے

جس مقدس سینے کو وحی کا مہبط بنانا مقصود ہوتا تھا' اس کی نگہداشت شروع سے ذاتِ باری تعالیٰ خود کرتی تھی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اس کی نگہداشت خود ذاتِ خداوندی کرتی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ نبی کی زندگی ایک بے اختیار و ارادہ مشین کی طرح خدا کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتا تھا۔ نبی بھی دوسرے انسانوں کی طرح اپنے ہر عمل میں صاحبِ اختیار ہوتا تھا اور جو کچھ کرتا تھا اپنے ارادے اور فیصلے سے کرتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار قرار پاتا تھا۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ نبی کی وحی' اس چیز سے یکسر مختلف اور منفرد ہے' جسے عام طور پر "مذہبی واردات" (RELIGIOUS EXPERIENCE) یا "باطنی مکاشفات" REVELATIONS OF A MYSTIC کہا جاتا ہے۔ یہ واردات' مکاشفات' انسان کے اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ از قبیل وحی نہیں ہوتے۔ یہ صرف انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہے جو ایک خاص طریق اور ممارست سے ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے نہ کسی عقیدہ کی ضرورت ہے نہ کسی مذہب کی۔[1] چونکہ نبوت نبیِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گئی' اس لئے اب وحی کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ لہٰذا' اسلام میں کسی کے "باطنی تجربہ"

---

[1] اس کی تفصیل میری تصنیف "تصوف کی حقیقت" میں دیکھئے۔

کی کوئی سند یا حیثیت نہیں۔ نہ ہی اب کسی کے لئے خدا سے ہمکلامی کا امکان ہے۔ خدا سے ہمکلامی کا ذریعہ صرف وحی تھا جس کا سلسلہ نبیؐ اکرمؐ کی ذات پر ختم ہوگیا۔ قرآن کریم میں وحی کے سوا، خدا سے براہِ راست علم حاصل کرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ کشف، الہام وغیرہ بعد کی اصطلاحات ہیں جنہیں قرآن سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ بھی ایک بنیادی خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر "دین" (اسلام)" مذہب" (RELIGION)) سے الگ قرار پاتا ہے۔ مذہب میں انسان کا انتہائی کمال یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ خدا سے براہِ راست ہمکلام ہوجاتا ہے۔" دین" (اسلام) یہ بتاتا ہے کہ خدا کا کلام، اس کی آخری کتاب کے اندر محفوظ ہے ـــ اور انسان کا کام اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔ اس کے اتباع کا نتیجہ اس زندگی کی خوشگواریاں اور موت کے بعد کی زندگی کی سرفرازیاں ہے۔ اس کا نتیجہ کسی قسم کا "باطنی علم" حاصل ہوجانا نہیں "باطنیت" اور "دین" دو متضاد چیزیں ہیں۔

اب اس سے آگے بڑھئے

"باطنی واردات" کے مدعوین (MYSTICS) کا کہنا ہے کہ جو شخص حقیقت کی کوئی جھلک پالیتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ

کاں را کہ خبر شد، خبرش باز نیاید

وہ اس کیف و مستی میں گم ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس کا ان کیفیات کا کسی دوسرے کو بتانا تو ایک طرف اسے خود اپنے آپ کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ لیکن جب نبی پر انکشافِ حقیقت ہوتا ہے (یعنی اُسے وحی ملتی ہے) تو اس پر عظیم ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں۔ اسے

فریضۂ رسالت کی ذمہ داریاں

اپنی وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اور صرف پہنچانا ہی نہیں اس کے مطابق سابقہ (غلط) معاشرے کی جگہ ایک جدید معاشرے کو عملاً متشکل کرنا ہوتا ہے۔ یہی وہ گراں بار ذمہ داریاں ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبیؐ اکرمؐ سے کہا گیا کہ

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (۲-۳/۹۴)

ہم نے تم پر سے اس بوجھ کو اتار دیا جس سے تمہاری کمر دوہری ہو رہی تھی۔

علامہ اقبالؒ اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔

خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا"۔

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو

اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کرے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رُو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

نبی کی اس خصوصیت کو (کہ وہ خدا سے وحی پاتا ہے) عام طور پر نبوّت کہا جاتا ہے، اور اس کے اس فریضہ کو (کہ اس نے وحی کو دوسروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق ایک جہانِ نَو کی تخلیق کرنا ہوتا ہے) رسالت سے تعبیر کیا جاتا۔ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لئے ایسے افراد کو ساتھ ملانا ہوتا ہے جو وحی کی راہ نمائی میں زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیں۔ یہی وہ جماعت ہے جو حسنِ کائنات کو نکھارنے اور انسانی معاشرے میں خدا کے قانونِ مکافات کو انسانی حساب و شمار کے مطابق نتیجہ خیز بنانے میں خدا کی رفیق بنتی ہے۔ اسے "جماعتِ مؤمنین" کہا جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ

(۱) کائنات کی ہر شے کو اس نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے جس سے وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے، خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے۔

(۲) یہ راہ نمائی کائنات کی ہر شے کے اندر شروع سے ودیعت کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ خارج سے نہیں ملتی۔ اشیائے کائنات اس داخلی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہی ان کی فطرت کہلاتی ہے جو غیر متبدل ہوتی ہے۔

(۳) انسان کو چونکہ صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے اس لئے اسے راہ نمائی دینے کا وہ طریق اختیار نہیں کیا گیا جس کی رُو سے یہ اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس لئے یہ راہ نمائی ان کے اندر نہیں رکھی گئی۔

(۴) اس کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب کرکے اس کی طرف وحی بھیج دی جاتی۔ وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتا اور جو لوگ اس وحی کی صداقت پر ایمان لے آتے وہ مل کر ایسے معاشرے کی تشکیل کرتے جس میں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی۔

(۵) نبی کو جو راہ نمائی (وحی) خدا کی طرف سے ملتی اس میں اس کی اپنی عقل و فکر اور خیالات و جذبات کا کوئی دخل نہ ہوتا۔ اس لئے کہ وحی کی راہ نمائی عقل کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔

وحی کا سلسلہ

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب انسان نے تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی اور اس سے ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ پیدا ہوا (اسے وہ "ہبوطِ آدم" کے استعارہ سے تعبیر کرتا ہے) تو اس کی راہ نمائی کے لئے وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کا اعلان یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے ہر قوم اور ہر ملک میں انبیائے کرام آتے رہے۔ اصولی طور پر ان سب کا ایک ہی پیغام اور ایک ہی دعوت تھی (۴/۱۶۳)۔ چونکہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے، اس لئے اس میں ان رسولوں کا تذکرہ نام لے کر کیا گیا ہے جن سے وہ لوگ پہلے سے متعارف تھے — مثلاً نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یوسف، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، عیسیٰ (علیہم السلام) وغیرہ۔ اور باقیوں کا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا (۴/۱۶۴)۔ لیکن کسی رسول کا ذکر کیا گیا ہو یا نہ، ایک شخص مسلمان ہو نہیں سکتا جب تک وہ اس حقیقت پر ایمان نہ لے آئے کہ دنیا کی ہر قوم میں رسول آتے رہے ہیں اور انہیں خدا کی طرف سے سچی تعلیم ملی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے رسول ہونے میں تفریق کرتا ہے تو وہ مسلمان ہو نہیں سکتا۔ (۲/۲۸۵)

ختمِ نبوّت

شروع شروع میں انسان کا ذہن بڑا ناپختہ اور علم بڑا ناقص تھا، اس لئے اسے چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کی تعلیم بھی وحی کے ذریعے دی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، تا آنکہ انسانی تاریخ میں وہ زمانہ آگیا جس کے بعد انسانی علم نے دن بدن وسیع ہوتے چلے جانا تھا — تمثیلاً یوں سمجھئے کہ اب آدمی اپنے بچپن سے نکل کر سنِ بلوغت تک پہنچ گیا — اب ضرورت تھی کہ اسے وہ مستقل اصول اپنی مکمل شکل میں دے دیئے جاتے جن کی تعمیرِ انسانیت کے لئے ضرورت تھی اور اس کے بعد اسے اس کی آزادی ہوتی کہ یہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اپنی عقل و بصیرت کی رُو سے زندگی کی راہیں آپ متعین کرے۔ چنانچہ یہ اصول آخری بار محمد رسول اللہؐ کی وساطت سے، قرآنِ کریم کے اندر دیئے گئے۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا[1] (۱۵/۹) اور اس کے بعد سلسلۂ نبوت

---

[1] یہ حقیقت تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ قرآنِ کریم حرفاً حرفاً وہی ہے جو نبیٔ اکرمؐ نے دیا تھا۔ اس کے برعکس دنیا کی کوئی اور قوم نہ اس کا دعویٰ کرتی ہے اور نہ ہی اسے ثابت کر سکتی ہے کہ جو کتاب اس کے بانیٔ مذہب کو ملی تھی وہ ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔

ختم کردیا "ختمِ نبوت" درحقیقت انسانی تاریخ کا عظیم ترین انقلاب ہے۔ اس کے بعد' ان حدود کے علاوہ جو قرآن میں متعین کی گئی ہیں' انسان کو اپنے کاروبارِ حیات میں پوری پوری آزادی حاصل ہوگئی۔ ان حدود سے مقصد یہ ہے کہ انسانوں کا باہمی ٹکراؤ نہ ہو اور اس طرح کاروانِ انسانیت' باہمی تعاون و تناصر سے' زندگی کو بلندیوں کی طرف لئے جائے۔ اب انسانی راہ نمائی کے دو ہی سرچشمے ہیں ___ قرآنی تعلیم اور انسانی علم و بصیرت ___ قرآن کی یہ تعلیم پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے ہے۔ اس پر ایمان لانے سے انسان مسلم کہلاتا ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان قوانین (وحی) پر ایمان کیسے لایا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ انہیں سچا تسلیم کرلیتے ہیں وہ کس طرح اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ قوانین سچے ہیں۔ اس کے متعلق آئندہ باب میں گفتگو کی جائے گی جس میں یہ بتایا جائے گا کہ وحی اور عقل کا باہمی تعلق کیا ہے۔

خدا پر ایمان سے مفہوم کیا ہے

لیکن قبل اس کے ہم اگلے باب کے لئے ورق الٹیں ایک اہم حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا یہ ہے کہ انسانی راہ نمائی کے لئے وحی کی ضرورت ہے۔ اور وحی عقلِ انسانی کی وضع کردہ نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ لہٰذا خدا پر ایمان سے عملی مفہوم یہ ہے کہ اس کی طرف سے عطا فرمودہ وحی پر ایمان لایا جائے۔ خدا کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ خالقِ کائنات ہے۔ کائنات کا نظم و نسق اس کے مقرر کردہ قوانین کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے۔ ان قوانین پر اُسی کا کنٹرول ہے۔ مغرب میں مفکرین اور سائنسدانوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو خدا کی اس حیثیت پر تو ایمان رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی راہ نمائی کا تعلق ہے وہ اس کے لئے انسانی عقل کو کافی سمجھتا ہے۔ خدا کی وحی کا قائل نہیں۔ ہکسلے (JULIAN HUXLEY) کی کتاب کا ٹائیٹل (RELIGION WITHOUT REVELATION) اسی نہج فکر کا آئینہ دار ہے۔ قرآن کی رو سے خدا پر اس قسم کا ایمان' درحقیقت ایمان کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ ایسے خدا پرستوں کے متعلق کہتا ہے کہ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۴)۔ ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ اس کے اندر ہے وہ سب کس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے اور اس کا مالک اور آقا کون ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی کہو کہ اس کا جواب جہالت اور تعصب سے نہ دیں بلکہ علم و بصیرت کی رُو سے دیں۔ تو اس کے جواب میں یہ یقیناً کہیں گے کہ یہ سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے اور وہی اس کا مالک ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔ اس لئے کہ علم کی بارگاہ سے اس کے سوا اور کوئی جواب مل نہیں سکتا۔ قرآن اس کے بعد کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب تمہارا علم و بصیرت تمہیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے تو پھر تم اصل حقیقت کو بھی اپنے سامنے کیوں نہیں لاتے۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۲۳/۸۵)۔ اس کے

بعد وہ ان سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (۲۳/۸۶) ان سے پوچھو کہ فضائے آسمانی میں تیرنے والے کرّوں پر کس کا اقتدار ہے؟ بلکہ یہ پوچھو کہ پوری کی پوری کائنات کا مرکزی کنٹرول کس کے اختیار میں ہے۔ اس کے جواب میں بھی یہ کہہ دیں گے کہ اللہ کے ہاتھ میں (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم اس کی نگہداشت کیوں نہیں کرتے؟ پھر قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۳/۸۸) کائنات پر قبضہ واختیار کس کا ہے۔ وہ کون ہے جس کی طرف ہر شے اپنی حفاظت کے لئے پناہ ڈھونڈتی ہے اور جو اس کے قانون کی خلاف ورزی کرے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ بتاؤ کہ تمہارا علم وفکر اس کا کیا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے جواب میں بھی یہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے (سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ)۔

خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی ان کارفرمائیوں کا اقرار لینے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ جب ان کی عقل وبصیرت انہیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ یہ تمام اشیاء خدا کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں تو اس بات پر یقین رکھنے کے لئے انہیں کہاں سے دھوکا لگتا ہے کہ انسانی دنیا میں قوانینِ خداوندی کی ضرورت نہیں۔ یہاں انسان اپنے وضع کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے (فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۹) انسانی زندگی کے لئے بھی محکم اور اٹل قوانین خدا ہی کی طرف مل سکتے ہیں بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ (۲۳/۹۰)۔ لیکن اگر یہ اس حقیقت پر ایمان نہیں لاتے اور خارجی کائنات پر کنٹرول رکھنے والے خدا کے ایمان ہی کو ایمان باللہ سمجھتے ہیں تو یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ٥ (۲۳/۹۰)۔ خدا پر ایمان کا دعویٰ اسی کا ہے جو خارجی کائنات میں خدا کی کبریائی کے ساتھ اس حقیقت پر بھی ایمان رکھے کہ انسان کو راہنمائی بھی خدا ہی طرف سے ملتی ہے۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر وحی پر ایمان کے بغیر خدا پر ایمان کی کچھ حقیقت نہیں رہ جاتی۔ اوسپنسکی کے الفاظ میں:۔

> اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا۔ مذہب میں کوئی عنصر تو ایسا ہوتا ہے جو انسانی فکر کے احاطہ سے باہر ہو۔ اس لئے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک زبوں حال فلسفہ ہوگا۔

(A NEW MODEL OF THE UNIVERSE, P-34)

لہٰذا خدا پر ایمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی وحی پر ایمان لایا جائے۔ اس ایمان کو ایمان بالرُّسل (رسولوں

پر ایمان) اور ایمان بالکتاب (خدا کی کتابوں پر ایمان) کہتے ہیں۔ چونکہ قرآن خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی کا آخری، مکمل اور واضح ضابطہ ہے اور یہ نوعِ انسان کو محمدؐ رسول اللہ (صلعم) کی وساطت سے ملا ہے (جو سلسلۂ نبوت و رسالت کی آخری کڑی ہیں) اس لئے قرآن اور محمدؐ رسول اللہ پر ایمان، خدا پر ایمان کی لازمی کڑی ہے۔

○
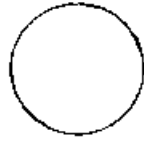
بابِ چہارم

عقل اور دین

سابقہ باب میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا تھا کہ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملتے ہیں؛ اور وحی، عقلِ انسانی کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ ذہنِ انسانی نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی جن حقائق اور نظامِ زندگی کو پیش کرتی ہے انہیں عقل کی رُو سے سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا آگے چل کر کی جائے گی۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ عقل بھی انکشافِ حقیقت کے لئے کوشش کرتی ہے لیکن جس طرح آنکھ (دُوربین کے بغیر) ایک خاص حد تک دیکھ سکتی ہے اس سے آگے نہیں دیکھ سکتی؛ اسی طرح عقل کی کارفرمائی

عقل کی محدودیت

کا ایک خاص دائرہ ہے۔ جو امور اس دائرے سے باہر ہوں وہ ان کے متعلق کوئی تحقیق و تفتیش نہیں کر سکتی۔ (مثلاً) کیلی فورنیا کی رصدگاہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اٹیکس کے الفاظ ہیں:-

> کائنات کے آغاز اور انجام کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔
>
> (THE GREAT DESIGN)

دوسرے عقلِ انسانی کی رُو سے جس قدر تحقیقات کی جاتی ہیں ان کے متعلق کسی مقام پر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہیں۔ اس سے آگے کچھ اور نہیں۔ اس ضمن میں ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر لکھتا ہے کہ

> نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیّر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑنا پڑتا ہے۔ (ایضاً ص۵۲)

عقل کی یہ محدودیت، اور حدِ دسترس کی یہ کیفیت خارجی کائنات کے متعلق ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس میں اس کی

تحقیقات کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک مسئلہ کو لیتی ہے۔ اس کا کوئی حل سوچتی ہے اور اس حل پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ صدیوں کی مسلسل سعی و کاوش کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تجربہ ناکام رہا۔ وہ حل غلط تھا۔ پھر وہ کوئی

تجرباتی طریق

دوسرا حل سوچتی ہے اور اس پر تجربہ شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح متعدد ناکام تجارب کے بعد اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے' اس دوران میں انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے اس کا اندازہ تاریخ کے اوراق سے لگ سکتا ہے۔ مثلاً جب انسان نے تمدنی زندگی شروع کی تو عقل نے یہ فیصلہ کرنا چاہا کہ اس کے اجتماعی امور کے حل اور افراد اور قبائل و اقوام کے باہمی تنازعات کے تصفیے کے لئے کس قسم کا نظام وضع کیا جائے۔ اس نے اس تجربے کی ابتداء انفرادی اقتدار سے کی۔ صدیوں کے تجربے نے بتایا کہ یہ طریق' انسانیت کی نشوونما کے لئے بڑا مضرت رساں ہے۔ پھر اس نے ایک اور حل سوچا۔ اسے ناکام پایا تو کوئی دوسرا حل سامنے رکھا۔ اس طرح وہ اب خدا خدا کر کے جمہوریت تک پہنچی ہے۔ آپ سوچئے کہ عقلِ انسانی کو ابتدائی طرزِ حکومت سے جمہوریت تک پہنچنے میں کتنی صدیاں لگ گئیں اور اس دوران میں نوعِ انسان کو کتنے خون کے دریا پیرنے اور کتنی آتشیں خندقیں عبور کرنی پڑیں۔ اور یہ جمہوریت بھی کون سی امن و سکون کی ضامن ہے۔ اس ایک مثال سے دیگر امور سے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ عقل کا دائرۂ عمل محدود اور اس کا طریقِ کار تجرباتی ہے۔ لیکن اس کی محدودیت کے یہ معنی نہیں کہ انسان عقل کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑنا شروع کر دے اور اسے انسانی دنیا سے نکال باہر کرے۔ اگر آنکھ ایک خاص حد کے اندر ہی دیکھ سکتی ہے' اس سے آگے نہیں جا سکتی' تو کوئی صاحبِ ہوش آنکھ کی محدودیت کی وجہ سے اُسے پھوڑ نہیں دیتا۔ لیکن انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے (جس کی بنیاد درحقیقت اس تصوف (MYSTICISM) پر ہے جس کا سرچشمہ فکرِ فلاطون کی بنیادی غلط نگہی ہے)۔ عقل کے ساتھ یہی کیا۔ ساری دنیا کا مذہبی لٹریچر (وہ شریعت سے متعلق ہو یا طریقت سے) عقل کی تنقیص و

مذہب اور عقل

تنکیر ہی سے نہیں بلکہ تحقیر و تذلیل سے بھرا پڑا ہے۔ حتّٰی کہ خود ہمارا (مسلمانوں کا) مروجہ مذہب بھی جو اسی تصوف کا پرتو یا اس سے متاثر شدہ تصورات کا مجموعہ ہے' ان کے تتبع میں عقل کے متعلق وہی کچھ کہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہر منبر و محراب سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ عقل اور ایمان متضاد عناصر ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان آنکھیں بند کر کے مان لینے کا نام ہے۔ عقل و فکر' دانش و بینش' علم و بصیرت' دلائل و براہین سے ایمان حاصل نہیں ہو سکتا۔ پھر اس نظریہ کی تائید میں اس قسم کی وضعی روایات کو پیش کر دیا جاتا ہے جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے کہ اَھْلُ الْجَنَّةِ بُلْهٌ۔ ابلہوں (بے وقوفوں) کا مقام جنت ہے۔ یہ اربابِ شریعت کی حالت ہے۔ اہلِ طریقت ان سے بھی سو قدم آگے ہیں۔ ان کا تو گویا زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ عقل و خرد کی اس قدر مٹی پلید کی جائے کہ کوئی ہوشمند اس "خباثت" کے قریب تک نہ جانا چاہے۔ ان کے ہاں مسلّمہ

ہے کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

علم کو ان کے ہاں "حجابِ اکبر" کہا جاتا ہے۔

انسانوں کے ان خود ساختہ تصوّرات کے بعد آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا کہتا ہے قرآنی تعلیم کے متعلق اگر کم از کم الفاظ میں کچھ کہنا چاہیں تو بلا تامل کہا جا سکے گا کہ قرآن "طلسمہائے فلاطونی" کے خلاف ضربِ کلیمی اور عجمی بت کدوں کے حق میں "تیشۂ ابراہیمی" تھا۔ اس نے ان تمام تخریبی تصوراتِ حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا، جو انسانیت کی راہ میں سنگِ گراں

عقل اور قرآن

بن کر حائل تھے۔ جہاں تک موضوعِ زیرِ نظر کا تعلق ہے اس نے انسانی عقل کو بہت بڑا بلند مقام عطا کیا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ وہ حیوان میں مابہ الامتیاز خصوصیت عقل کو قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیدائش کے ابتدائی مراحل میں حیوان اور انسان کا راستہ ایک ہی تھا۔ بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲/۷) انسانی زندگی کا آغاز بھی (حیوانات کی طرح) غیر ذی حیات مادہ (INORGANIC MATTER) سے ہوا۔ پھر وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا اس مقام تک آ پہنچا جہاں پیدائش کا سلسلہ بذریعہ تولید ہوتا ہے۔ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ (۳۲/۸)۔ یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ثُمَّ سَوَّاهُ۔ اس کے بعد قانونِ ارتقاء کی رُو سے انسان کے حشو و زوائد کو دُور کر کے اس میں خاص تناسب و اعتدال پیدا کیا گیا۔ یہاں سے وہ منزل شروع ہو گئی جہاں پہنچ کر یہ دیگر حیوانات سے مختلف ہو گیا۔ ایسا مختلف کہ قرآن نے اسے "تخلیقِ جدید" سے تعبیر کیا: ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (۲۳/۱۴) اس مقام پر خدا نے اسے اپنی توانائی کا ایک شمہ عطا کر دیا۔ وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ۔ تمہیں حواس (SENSES) عطا کر دیئے جن کے ذریعے تم اپنے خارجی ماحول کی معلومات فراہم کرتے ہو۔ اور ان کے ساتھ فؤاد (MIND) دے دیا۔ جس سے تم غور و فکر کے بعد استنباطِ نتائج کرتے ہو۔ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ (۳۲/۹) لیکن تم میں بہت تھوڑے ہیں جو ان سے صحیح کام لیتے ہیں۔

علم انسان کا پہلا درجہ، علم بذریعہ حواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) ہے اس کے بعد دوسرا درجہ تصوّراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کا ہے۔ یہ سب عقل و فکر کی بدولت ہے جو خالص انسانی خصوصیت ہے۔

بدترین خلائق

اس میں کائناتی مخلوق میں سے کوئی اور شریک نہیں۔ قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اس امتیازِ خصوصی (یعنی عقل) سے کام نہیں لیتے وہ بدترین خلائق ہیں۔ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ

عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ (۸/۲۲) "اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے، گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے"۔

مذہب کی دنیا میں انسانی زندگی کا انتہائی مقصود یہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے. قرآن کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ جہنم میں کون لوگ جائیں گے. سورۂ اعراف میں ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷/۱۷۹) شہروں کی مہذب آبادیاں ہوں یا دیہات کی غیر متمدن. ان میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو اس راستے پر چلتے ہیں جو انہیں سیدھا جہنم کی طرف لے جاتا ہے. یعنی لَهُمْ قُلُوْبٌ ..... لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا. ان کے

جہنمی کون ہیں

دل تو ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے. ان کی آنکھیں ہوتی ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے. ان کے کان ہوتے ہیں لیکن یہ اُن سے سننے کا کام نہیں لیتے. اُولٰٓئِكَ ..... غٰفِلُوْنَ ۝ (۷/۱۷۹) یہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے. یہ وہ لوگ ہیں جو بے خبری کی زندگی بسر کرتے ہیں. انہی کے متعلق سورۂ فرقان میں ہے: اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ ..... سَبِيْلًا (۲۵/۴۴) کیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دل کے کانوں سے سنتے اور عقل و فہم سے کام لیتے ہیں؟ بالکل نہیں. یہ محض حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر راہ گم کردہ. حیوانات کو جس قدر استعداد قدرت کی طرف سے ملتی ہے وہ اس سے بہرحال کام لیتے ہیں.

اہلِ جہنم کے متعلق دوسرے مقام پر ہے وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا ..... اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷/۱۰) "یہ لوگ کہیں گے کہ اگر ہم ہوش و خرد سے کام لیتے تو آج جہنم میں کیوں ہوتے؟ سورۂ یٰسین میں ہے کہ ظہورِ نتائج کے وقت نوعِ انسان سے کہا جائے گا کہ تم سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم "شیطن" کی محکومیت اختیار نہ کرنا وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے. اطاعت و محکومیت صرف خدا کی اختیار کرنا. یہی وہ راستہ ہے جو تمہیں زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا، لیکن وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ ..... تَعْقِلُوْنَ (۳۶/۶۲) اس نے تم میں سے اکثر پارٹیوں کو گمراہ کر دیا. کیا تم عقل و فکر سے کام نہیں لیتے تھے جو اس کے فریب میں آ گئے. هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۳۶/۶۳) یہ ہے وہ جہنم جس کے متعلق تم سے کہا گیا تھا کہ اگر تم عقل و فکر سے کام نہ لوگے اور اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاؤ گے تو تمہارا ٹھکانا اس میں ہوگا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے.

(i) انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز خصوصیت عقل و فکر کی صلاحیت ہے.

(ii) جو لوگ اس صلاحیت سے کام نہیں لیتے ان کی زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے بلکہ ان سے پست اور بدترین خلائق ہوتے ہیں.

(iii) یہی لوگ ہیں جنہیں "شیطان" اپنے دامِ فریب میں الجھالیتا ہے۔ اور یہی ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے۔

قرآن کی دعوت سرتاپا علم و بصیرت کی دعوت ہے۔ وہ قدم قدم پر تدبر و تفکر کا حکم دیتا اور عقل و شعور سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے' جو لوگ اس دعوت سے انکار کرتے ہیں ان کے متعلق پوچھتا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۴/۸۲)

تدبر و تفکر

"کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر و تفکر سے کام نہیں لیتے" یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق دوسرے مقام پر ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ... اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۳-۲۴) "یہ وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہ لینے کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ کان رکھنے کے باوجود بہرے اور آنکھیں رکھنے کے باوصف اندھے ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟" وہ اپنے احکام و ضوابط کی وضاحت کے بعد کہتا ہے؛ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ..... الْاٰخِرَةِ (۲/۲۱۹) "اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم ان کے فوری فوائد اور مستقبل میں جا کر نمایاں ہونے والے نتائج پر غور و فکر کر سکو۔" غور کیجئے اس آیت میں "دنیا اور آخرت" دونوں پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

جب میدانِ جنگ میں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں تو وہاں کے متعلق عام طور پر یہی کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ جس فوج کے سپاہیوں کے جذبات میں زیادہ شدت ہوگی' وہی بے جگری سے لڑے گی فلہذا وہی غالب و منصور ہوگی جنگ

جنگ میں عقل و فکر

میں عقل و فکر کا کوئی کام نہیں۔ اگر سپاہی وہاں سوچنے لگ جائیں تو کوئی بھی جان دینے پر آمادہ نہ ہو۔ وہاں فقط اندھے جذبات کام دے سکتے ہیں۔ لیکن قرآن ایسے مقام پر بھی عقل و فکر سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ اگر تم میں سو سپاہی ہمت و استقلال سے کام لینے والے ہوں گے تو وہ دشمن کے ہزار (یا کم از کم دو سو) آدمیوں پر غالب آجائیں گے۔ یہ اس لئے کہ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (۸/۶۵) "فریقِ مخالف عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اور تم ایسے نازک وقت میں بھی تدبر و تفکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔"

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس ضمن میں سورۂ سبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے اور اگر کہا جائے کہ وہ اس موضوع پر حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ آپ غور کیجئے کہ نبی اکرمؐ عمر بھر دعوت و تبلیغ میں مصروف رہے۔ وہ مختلف طرق و انداز سے قرآنی تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ آپ دن رات اپنے پیغام کی نشر و اشاعت میں لگے رہتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے اور مختلف پہلو ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ اس کی تعلیم کی وسعتیں

حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہیں۔ لیکن آپ اس پر غور کیجئے کہ اس قسم کی وسیع و عریض تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں' فقط ایک بات ــــ قُلْ اِنَّمَآ

صرف ایک بات

اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ ایک بات کس قدر اہم ہوگی؟ یہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجائے۔ جو اس دعوتِ رشد و ہدایت کا لب لباب ہو۔ ہر شخص ایسی بات سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہوجائے گا۔ ماننے کی غرض سے نہیں تو استعجاباً ہی سہی کہ دیکھیں وہ ایک بات ہے کیا؟

اس کے بعد آپ ان سے کہتے ہیں کہ وہ بات ایسی نہیں جسے یونہی چلتے چلتے سُن لیا جائے۔ وہ رُک کر، کھڑے ہوکر، تھم کر سننے کی ہے۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ـــ تم سب نہیں رُکنا چاہتے تو خیر' تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک' دو دو کرکے رُک جاؤ اور اللہ کے لئے کھڑے ہوجاؤ۔ آپ غور کیجئے کہ اس انداز میں کس قدر نفسیاتی نزاکتیں پوشیدہ ہیں۔ جب اس طرح تمام توجہات کو اپنی طرف مرکوز کرلیا تو کہا کہ اب سنو کہ وہ ایک بات کیا ہے جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں اور جس کے اندر باقی سب باتیں آجاتی ہیں۔ وہ ایک بات ہے ـــ

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (۳۴/۴۶)

سوچا کرو

غور و فکر کیا کرو، سوچا کرو، سمجھا کرو، عقل سے کام لیا کرو۔ تم نے جب عقل و فکر سے کام لینا شروع کردیا تو پھر صحیح راستہ اختیار کرلوگے۔ اس لئے کہ ہم جو صحیح راستے کی طرف دعوت دیتے ہیں' وہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ ہماری اپیل ہی علم و بصیرت اور دانش و بینش سے ہوتی ہے۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ ..... اتَّبَعَنِىْ (۱۲/۱۰۸) "ان سے کہہ دو کہ میں جو تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں تو میری یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں اور میرے اتباع کرنے والے بھی ایسا ہی کریں گے۔" اگر تمہیں اس دعوت سے اختلاف ہے تو اپنے دعوے کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرو۔ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱) "ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں اپنی دلیل پیش کرو۔" علم و بصیرت

دلیل پیش کرو

اور دلائل و براہین کے بغیر یونہی جھگڑتے چلے جانا کبھی صحیح روش نہیں قرار پاسکتی! فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ ..... بِهٖ عِلْمٌ (۳/۶۶) "تم اس معاملہ میں یونہی کیوں جھگڑتے ہو جس کی بابت تمہیں علم نہیں"۔ دوسروں سے جھگڑنا تو ایک طرف' تمہیں خود بھی اس بات کے پیچھے نہیں لگنا چاہیئے جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷/۳۶) پھر علم بھی یونہی قیاسی اور ظنی نہیں۔ ایسا یقینی علم جس کی شہادت تمہاری سماعت و بصارت (حواس) اور تمہارا قلب (MIND) دے۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ..... مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ جیسا کہ پہلے

بھی کہا جاچکا ہے علم کی ابتدا ادراک بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) سے ہوتی ہے. سمع و بصر سے مراد اوّل الذکر علم ہے اور فوآد سے ثانی الذکر. لہٰذا علم وہی علم کہلانے کے قابل ہے جس میں حواس (SENSES) کی شہادت اور قلب (MIND) کی تائید موجود ہو. ظن و قیاس کو علم کہا ہی نہیں جا سکتا. چنانچہ حقیقت کی مخالفت کرنے والوں کو

ظن و قیاس علم نہیں

کے متعلق قرآن میں ہے کہ مَا لَهُمْ بِهٖ ..... (۵۳/۲۸) "انہیں حقیقت کا علم نہیں یہ صرف ظن و قیاس کا اتباع کرتے ہیں اور ظن، حق (یقین) کے مقابلے میں کبھی کفایت نہیں کر سکتا.

ظن و قیاس تو ایک طرف قرآن اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ کسی چیز کا محض سرسری نظروں سے دیکھنا کافی نہیں. وہی دیکھنا کچھ معنی رکھتا ہے جس کے ساتھ غور و فکر شامل ہو. چنانچہ وہ ایسے لوگوں کے متعلق جو نبی اکرمؐ کی مجلس دعوت ارشاد میں آکر حضورؐ کو سرسری نگاہوں سے دیکھتے اور آپ کی باتوں کو سرسری طور پر سنتے تھے درانحالیکہ ان کا خیال کہیں اور ہوتا تھا، کہتا ہے کہ تَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (۷/۱۹۸) وہ تمہیں ایسے نظر آتے ہیں کہ وہ تیری طرف دیکھتے ہیں، لیکن وہ درحقیقت دیکھتے نہیں. "نظر" اور "بصر" کا یہ لطیف فرق قابل غور ہے. اسی طرح وہ کہتا ہے وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (۱۰/۴۲) اور ان میں وہ بھی ہیں جو (بظاہر) تیری طرف کان لگائے دکھائی دیتے ہیں. لیکن چونکہ وہ تمہاری باتوں کو دل کے کانوں سے نہیں سنتے. جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر غور نہیں کرتے. عقل و فکر سے کام نہیں لیتے. اس لئے ان کا یہ سننا درحقیقت سننا نہیں. اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۴۲) کیا تو ان بہروں کو سنا سکے گا جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے. یہ آنکھوں والے نہیں بلکہ درحقیقت اندھے ہیں. اَفَاَنْتَ..... لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۰/۴۳). تو کیا تو ایسے اندھوں کو صحیح راستہ دکھا سکے گا جو عقل و بصیرت سے کام ہی نہ لیں (نیز دیکھئے (۱۰/۴۵ از ۴۷/۱۶).

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کی زبان عربی ہے (یا جو عربی زبان جانتے ہیں) وہ تو قرآن کے مطالب سے واقف ہوتے ہیں. یہ ٹھیک ہے کہ کسی کتاب کے مطالب کو سمجھنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری ہے جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے لیکن یہ

محض زبان جاننا کافی نہیں

ضروری نہیں کہ محض زبان کے جاننے سے اس کتاب کے مطالب بھی سمجھ میں آجائیں. مطالب سمجھنے کے لئے غور و فکر اور عقل و شعور سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے. چنانچہ (سورۃ ہود میں ہے کہ) حضرت شعیبؑ کی دعوت کے جواب میں ان کی قوم کہتی تھی کہ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (۱۱/۹۱) "جو کچھ تو کہتا ہے اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں." (حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت شعیبؑ اپنی قوم کی زبان میں ہی گفتگو کرتے تھے). خود نبی اکرمؐ کے اوّلین مخاطب عرب ہی تھے لیکن ان میں سے بھی وہی ایمان

لائے تھے جو وحی کے پیغام پر غور و فکر کرتے تھے. جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے وہ اس پیغام کی صداقت وحقانیت کو نہیں پہچان سکتے تھے. نبیؐ اکرمؐ جب ان کی حالت پر غور کرتے اور دیکھتے کہ جس غلط روش پر چلے جارہے ہیں وہ انہیں کس طرح تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جارہی ہے تو ایک مشفق طبیب کی طرح آپ کا دل کڑھتا اور آپ چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح صحیح راستے پر لے آیا جائے، انہیں تباہی سے بچایا جائے خواہ اس کے لئے ان پر جبر ہی کیوں نہ کرنا پڑے. آپ کی اس خواہش اور آرزو کے جواب میں کہہ دیا گیا کہ ایمان وہی ہے جو سمجھ سوچ کر لایا جائے. جبر سے منوائی ہوئی بات کو ایمان کہہ ہی نہیں سکتے.

ایمان وہی ہے جو سمجھ سوچ کر لایا جائے

(کیونکہ ایمان تو دل کی رضامندی اور ذہن کے اطمینان سے لایا جاتا ہے). دیکھئے اس باب میں قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ..... اَسَفًا (۱۸/۶) "اے رسولؐ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو اس غم میں کہ یہ لوگ صحیح بات کو مانتے کیوں نہیں، ان کے پیچھے اپنی جان گھلا لے گا." حالانکہ اگر زبردستی لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود ہوتا تو اللہ کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ انسان کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ (دوسرے حیوانات کی طرح) مجبوراً ایک ہی روش پر چلتا. لیکن اس نے دانستہ ایسا نہیں کیا. اس نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے اور اختیار و ارادہ کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ جس روش کو چاہے اپنی مرضی سے اختیار کرے. وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ..... جَمِيْعًا (۱۰/۹۹) لہٰذا یہ غلط ہے کہ تو لوگوں کو زبردستی مومن بنالے. اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) ایمان خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق لایا جاتا ہے وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ اور وہ قانون یہ ہے کہ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۱۰/۱۰۰) جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ شکوک اور التباس میں رہتے ہیں. ان پر حقیقت واضح نہیں ہوتی. ان کی نگاہ کے سامنے بات صاف نہیں ہوتی. لہٰذا، ایمان وہی لاسکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں.

یہاں قرآن نے کہا ہے کہ جو بات کسی سے جبراً منوائی جائے اسے ایمان کہہ ہی نہیں سکتے. ایمان وہی ہے جو عقل و فکر کی بنیاد پر لایا جائے. اس سے ظاہر ہے کہ کسی کو مجبور کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص اپنی عقل و فکر سے کام نہ لے سکے. اس جبر کی ایک قسم تو یہ ہے کہ کسی کے سر پر تلوار رکھ کر کہا جائے کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے اسے مانو ورنہ تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا. ظاہر ہے کہ اس صورت میں عقل و فکر سے کام لینے اور اپنے اختیار و ارادہ سے فیصلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. دوسری شکل یہ ہے کہ کسی اور طریق سے عقل و فہم کو اس طرح ماؤف کر دیا جائے کہ وہ شخص سمجھنے سوچنے کے قابل نہ رہے اور یوں دوسرے سے دب کر، بلکہ ڈر کر، اس کی بات مان لے. اسے توہم پرستی (SUPERSTITION) کہتے ہیں. قرآن نے متعدد مقامات

معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لایا جاسکتا

بہ رسول اللہ کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کوئی معجزہ دکھایئے تو ہم آپ کی دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔ ان سے کہو کہ ایمان عقل و فکر کی رُو سے کسی بات کے ماننے کو کہتے ہیں۔ معجزہ دیکھ کر کسی بات کو مان لینا ایمان نہیں کہلا سکتا۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ بالکل سچ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میں آگ پر چل سکتا ہوں ظاہر ہے کہ آگ پر چل کر دکھا دینا اس کے پہلے دعوے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ رسول اللہ کو (قرآن کے سوا) کوئی معجزہ نہیں دیا گیا۔ سورۃ انعام میں ہے: وَ اِنْ كَانَ ...... يَسْمَعُوْنَ (۶/۳۵-۳۶) "اے رسولؐ! اگر یہ بات تجھ پر بہت گراں گزرتی ہے کہ یہ لوگ تمہارے پیغام سے اعراض کیوں برت رہے ہیں تو اگر تو اس کی استطاعت رکھتا

حضورؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا

ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرے یا آسمان تک کوئی سیڑھی لگا لے اور اس طرح انہیں کوئی معجزہ دکھا دے۔ (تم ایسا کر دیکھو۔ لیکن اس طرح انہیں مومن نہیں بنایا جا سکتا) اگر اس طرح سب کو زبردستی مومن بنانا مقصود ہوتا تو اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق نہایت آسانی سے ایسا کر دیتا۔ سو تو یہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے باوجود ان میں سے نہ ہو جا جو حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ یاد رکھو پیغامِ صداقت پر لبیک وہی کہتے ہیں جو اسے دل کے کانوں سے سنتے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ ضد اور تعصب یا تقلید اور جہالت کی بنا پر عقل و فکر سے کام نہیں لیتے کچھ عرصہ کے بعد ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے راہ نمائی کی ہے۔ ماہرینِ علم الحیات (BILOGISTS) کا کہنا ہے کہ جس عضو سے کوئی کام نہ لیا جائے کچھ عرصہ کے بعد فطرت اسے بیکار سمجھ کر معدوم ہی کر دیتی ہے اور پھر وہ نوع اس عضو سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جو لوگ اپنی یہ روش بنا لیں کہ "ہم سے جو کچھ کہا جائے گا ہم اس سے بلا سوچے سمجھے انکار کر دیں گے اور ایک دفعہ انکار کر دینے کے بعد پھر انکار ہی کئے چلے جائیں گے"۔ ان لوگوں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی ختم ہو

فکر کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے

جاتی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ..... عَظِيْمٌ (۲/۶-۷) جو لوگ انکار کی روش اختیار کر لیتے ہیں انہیں ان کی زندگی کے تباہ کن عواقب سے متنبہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ وہ ایک بار انکار کر دینے کے بعد پھر کبھی اعترافِ حقیقت نہیں کریں گے۔ ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات ان کے دلوں اور کانوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا انجام بڑا دردناک ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ..... الْمُعْتَدِيْنَ (۱۰/۷۴) "وہ حقیقت و صداقت سے محض اس لئے انکار کر دیتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ (یا ان کے آباؤ اجداد) اس سے انکار کر چکے ہیں اس طرح اللہ کا قانون

ردِ عمل ان سرکشوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے؛ یہ مہریں خود ان کی اپنی روش کا نتیجہ ہوتی ہیں کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳/۱۴)۔ (حقیقت یہ نہیں جیسے یہ لوگ اپنے طور پر سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ یونہی لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ) ان لوگوں کے اپنے اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں۔" ان کی حالت یہ ہوتی ہے

دلوں پر مہریں کیسے لگتی ہیں

کہ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ ..... يَعْلَمُوْنَ ۝ (۵۸ - ۳۰/۵۹) جب ان کے سامنے خدا کا قانون پیش کیا جاتا ہے تو اس پر عقل و فکر سے غور کر کے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ ان کا پہلا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ یہ (پیغام پہنچانے والا) دھوکے باز ہے۔ اس کے بعد وہ اس کے ماننے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے جو علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۵۹: ۳۰؛ ۱۸/۵۷) مہریں لگنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل حقیقت کی طرف سے پھر جاتے ہیں۔ اور یہ سب اس لئے کہ یہ لوگ تدبر و تفقہ سے کام نہیں لیتے۔ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ (۹/۱۲۷)

قرآن نے اس کی وضاحت کر دی ہے کہ جہاں کہا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ اندھے ہو جاتے ہیں تو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے ماتھے کی آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔ یہ طبعی طور پر اندھے (PHYSICAL BLIND) ہو جاتے ہیں۔ نہیں — یہ مراد نہیں۔ ان کے ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ دل کی آنکھوں سے روشنی جاتی رہتی ہے۔

دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا ..... فِي الصُّدُوْرِ (۲۲/۴۶) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں (کہ اقوامِ گذشتہ کی بستیوں کے اُجڑے ہوئے کھنڈرات ان کے لئے باعثِ عبرت بنتے اور اس طرح ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے یہ سمجھنے سوچنے کا کام لے سکتے۔ ان کے گوش، نصیحت نیوش بن سکتے۔ اس لئے کہ عقل و فکر سے کام نہ لینے کی وجہ سے ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں۔ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینے کے اندر ہیں۔"

مندرجہ بالا آیت میں قرآن نے "سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ" کی تاکید کی ہے۔ اس سے ذہن اس گوشے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں قرآن نے بتایا ہے کہ اس کے سمجھنے کا طریق کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی پیغام یا نظام کو پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ

قرآن فہمی کے تین طریق

(۱) جس سطح تک تمہارے زمانے میں علم پہنچ چکا ہے اسے اس علم کی رُو سے پرکھو اور دیکھو کہ علم کی بارگاہ سے اس کے متعلق کیا فتوےٰ ملتا ہے۔ یا

(iii) یہ دیکھو کہ اقوامِ سابقہ میں سے جس قوم نے اس نظام کے مطابق زندگی بسر کی تھی اس کے نتائج کیا نکلے۔ اور جس نے اس کی خلاف ورزی کی اس کا مآل کیا ہوا۔

اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جو جماعت اس نظام پر عمل پیرا ہو رہی ہے، اسے اطمینان سے اسے عمل میں لانے دو۔ اس کے بعد اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ نظام اپنے دعاوی میں سچا ہے یا جھوٹا۔ سورۂ یونس میں ہے۔ بَلْ كَذَّبُوْا...... الظّٰلِمِيْنَ (۱۰/۳۹) یہ لوگ اس پیغام کو جھٹلا رہے ہیں جس کا انہوں نے علمی طور پر احاطہ نہیں کیا۔ وَ لَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا (۲۷/۸۴) نہ انہوں نے اس کا انتظار کیا ہے کہ اس کے نتائج سامنے آجائیں تو ان کو دیکھ لیا جائے کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا۔ اسی طرح اُن اقوام نے اس کی تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزری ہیں۔ یہ کم از کم یہی دیکھ لیتے کہ ان اقوام کا انجام کیا ہوا تھا۔

غور کیجیے۔ قرآن نے یہ تینوں طریق تجویز کر کے کس طرح علم و عمل کے تمام گوشوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ اس نے کہا کہ ہے کہ یا تو انسان قرآنی حقائق کو علمی نقطۂ نگاہ سے دیکھے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے اپنے زمانے کے علوم تک دسترس ہو۔ یا تاریخ کے اوراق سے پوچھے کہ اس قسم کے نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا انجام کیا ہوا تھا۔ اور تیسرا طریق استنتاجی (PRAGMATIC) ہے جس میں کسی پروگرام کے نتیجہ سے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ طریق تینوں زمانوں کو محیط ہو جاتا ہے۔ تاریخی شہادت سے ماضی کا زمانہ[1]۔ اپنے دَور کی علمی سطح سے زمانۂ حال، اور مرتب ہونے والے نتائج سے زمانۂ مستقبل۔

یہ تیسرا طریق وہ ہے جس پر نبیِ اکرمؐ نے خاص طور پر زور دیا تھا کیونکہ وہ لوگ نہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں سے عبرت حاصل کرنا چاہتے تھے اور نہ ہی ان کا علم اتنا زیادہ وسیع تھا کہ وہ اس کی کسوٹی پر قرآن کے دعاوی کو پرکھ سکیں اس لئے آپ ان سے بار بار فرماتے تھے کہ قُلْ يٰقَوْمِ .... الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶) "اے گروہِ مخالفین تم اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہو اور میں اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہوں (نہ تم میرے پروگرام میں دخل دو، نہ میں تمہارے پروگرام میں دخل انداز ہوتا ہوں) نتیجہ مرتب ہونے پر معلوم ہو جائے گا کہ آخرالامر کامیابی کس کی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ حقیقت محسوس طور پر سامنے آجائے گی کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے ظالموں کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھا کرتی"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے وحی پر ایمان علم و عقل کی رُو سے ہی لایا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ نظری دلائل سے ہو اور خواہ وحی کے متعین کردہ نظام کے نتائج کو اپنے سامنے مشہود دیکھ کر۔ بہرحال ایمان کی عمارت علم و بصیرت اور عقل و فکر کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت کو سمجھنے اور اسے تسلیم کرنے کا اور کوئی طریق نہیں۔ قرآن نے واضح

---

[1] قرآن تاریخی شواہد پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس حقیقت کو ہم نے ایک مستقل باب میں الگ بیان کیا ہے جو آگے چل کر سامنے آجائے گا۔

الفاظ میں بتا دیا ہے کہ جو لوگ علم و بصیرت اور فہم و تدبر سے کام نہیں لیتے۔ وہ کبھی ان لوگوں جیسے نہیں ہو سکتے جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ قُلْ ھَلْ ..... تَتَفَکَّرُوْنَ (۶/۵۰) نیز ۱۱/۲۴؛ ۱۳/۱۶) "ان سے کہو کہ کیا اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے ہیں۔ کیا تم اس حقیقت پر غور و فکر نہیں کرتے"۔ دوسری جگہ ہے۔ وَمَا یَسْتَوِی..... (۱۹-۲۲/۳۵) "اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی اندھیرا اور روشنی ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ نہ دھوپ اور سایہ۔ نہ ہی زندہ اور مردہ برابر ہو سکتے ہیں۔ تم انہیں نہیں سنا سکتے جو قبروں میں جا پڑیں۔ سنایا اسی کو جا سکتا ہے جو (قانونِ خداوندی کے مطابق) خود سننا چاہے"۔ اس حقیقت کو چند الفاظ میں سمٹا کر یوں بیان فرمایا کہ ھَلْ یَسْتَوِی..... اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۹/۹) "کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں؟ (جب وہ برابر نہیں ہو سکتے تو اس حقیقت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ) نصیحت وہی قبول کر سکتے ہیں، جو عقل و فکر سے کام لیں"۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام لیں ان کے سامنے خدا کی طرف لے جانے والی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، ہم انہیں اپنی طرف آنے والے راستے دکھاتے چلے جاتے ہیں۔

اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں

لہٰذا، ایمان عقل و فکر کی رُو سے لایا جاتا ہے اور کوئی فرد یا قوم جس قدر زیادہ تدبر و تفکر سے کام لے اس کے سامنے اتنی ہی زیادہ زندگی کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

عمل کا محرّک کیا ہے؟

ایمان کے بعد عمل کا سوال سامنے آتا ہے اور عمل کے متعلق بے ساختہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق یکسر جذبات سے ہے۔ عقل و فکر سے نہیں۔ جذبات کو ابھارنے سے آپ انسان سے بڑے سے بڑا کام کرا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ جان تک دے دینے میں ذرا تامل و توقف نہیں کرتا۔ اگر اس وقت انسان عقل سے مشورہ کرنے بیٹھ جائے تو اسے کبھی اس ایثار و قربانی کی اجازت نہیں دے گی۔ اس موضوع پر کسی سے بات کیجئے وہ اس چیز کو مسلّمہ کی حیثیت سے پیش کر دے گا کہ عمل کے محرک جذبات ہی ہو سکتے ہیں، عقل نہیں۔ اور اس مسلّمہ کی تائید میں اس قسم کے اشعار بھی پیش کر دے گا کہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی[1]

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

یا یہ کہ

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش[۱]

لیکن قرآن اس باب میں بھی جذبات میں بہنے کی بجائے حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جذبات کو مشتعل کر کے آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کام لے سکتے ہیں۔ لیکن اس سے نہ تو عمل میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ نہ ہی کیریکٹر بنتا ہے۔ استقامت سے کیریکٹر کی تشکیل ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ مومنین کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا (۲۵/۷۳) "مومنین وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) خود خدا کے قوانین بھی پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے"۔ ظاہر ہے کہ جب احکامِ خداوندی پر بھی سوچ سمجھ کر عمل کرنے کی تلقین ہے تو دیگر امور میں محض جذبات کی بناء پر آمادہ بہ عمل ہونا کس طرح مستحسن قرار پا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتی لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں آپ ان کے جذبات کو اُبھار کر ان کی جان تک بھی لے لیں لیکن دوسرے وقت میں وہ آپ کو ایک پیسہ تک دینا بھی گوارا نہ کریں۔ اعتماد اور بھروسہ صرف انہی پر کیا جا سکتا ہے جو عقل و فکر کی بنا پر کوئی راستہ اختیار کریں اور جو قدم اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شاہراہِ حیات پر استقلال و استقامت سے گامزن رہیں گے اور آخر الامر منزلِ مقصود تک جا پہنچیں گے۔ انہی کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ (۴۱/۳۰) "جو لوگ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ ان کا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اس پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں۔

عمل بھی عقل و فکر کی رُو سے ہونا چاہیئے

ایک شبہ

اس مقام پر ہمارے سامنے وہ اہم اور نازک سوال آتا ہے جو سطح بین حضرات کے ذہن کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہے وہ بیوقوفوں کی وجہ سے نہیں۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو بڑی عقل و فکر کے مالک ہیں۔ دنیا درحقیقت مختلف عقول کی کشمکش (BATTLE OF WITS) کی رزمگاہ ہے۔ یہاں صبح سے شام تک عقلوں کی جنگ جاری رہتی ہے جو سب سے زیادہ عقل و فکر کا مالک

---

[۱] ایسے مقامات میں عقل سے مفہوم کیا ہے اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

ہوتا ہے، وہ سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار ہوتا ہے اور اپنے سے کم عقل والوں کو فریب دے کر ان کا سب کچھ چھین کر لے جاتا ہے۔ افراد سے آگے بڑھئے تو یہی حالت اقوام کی ہے۔ جو قوم زیادہ سمجھدار ہے وہ کم عقل رکھنے والی قوم کو اپنا (سیاسی یا معاشی) غلام بنائے رکھتی ہے۔ یہی نہیں کہ ان کی عقل انہیں ہر وقت ایسی ایسی تدابیر سمجھاتی رہتی ہے جن سے وہ کمتر عقل والی اقوام کی کھال اتارتے رہتے ہیں۔ ان کی عقل ایسے دلائل بھی فراہم کرتی ہے جو ان کے ان سیاسی اور اقتصادی حربوں کو حق بجانب (JUSTIFIED) قرار دیتے اور دنیا کی نگاہوں میں انہیں بڑا خوش آئند بنا کر دکھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات انہی دلائل کی بنا پر ایسے اشخاص یا اقوام کے اس قسم کے اعمال خود ان کی اپنی نگاہوں میں بھی مستحسن بن کر دکھائی دینے لگ جاتے ہیں اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ کو بالکل حق بجانب سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انسانی عقل نہ صرف دوسروں کو دھوکا دیتی ہے بلکہ خود اس شخص کو بھی دھوکا دے جاتی ہے جس کی یہ عقل ہوتی ہے۔ چنانچہ (H.C. WARREN) کی DICTIONARY OF PSYCHOLOGY میں عقل، RATIONALITY کی تعریف ہی یہ لکھی ہے کہ

عقل فریب کار ہے

> اس ذہنی عمل کا نام ہے، جو اس کام یا ارادے کے جواز کے لئے خوش آئند دلائل تراشے جو درحقیقت کسی اور ہی جذبے کے ماتحت پیدا ہوا ہو۔ خواہ اس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہو۔

جوڈ C.M. JOAD لکھتا ہے، کہ

> عقل اس قوت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم صحیح ماننا چاہتے ہیں وہ فی الواقعہ صحیح ہے۔

حتیٰ کہ

> عقل انسان کے جذبات کے پیچھے اس طرح چلتی ہے جس طرح کتے کے پاؤں اس کی ناک کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ (DECADANCE)

قرآن بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے، کہ انسان اپنے جذبات سے مغلوب ہو جائے اور انہی کو اپنا "خدا" بنا لے تو (شرابی کی طرح) اس کی عقل اس کی صحیح راہ نمائی کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ وہ کہتا ہے۔ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا۔ کیا تو ایسے شخص کا نگران و محافظ بن سکتا ہے؟ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اس قسم کے لوگ سمجھتے سوچتے اور یا (دیکھتے) سنتے ہیں۔

جذبات کے تابع عقل

بالکل نہیں۔ ان کی عقل و فکر مفلوج ہو چکی ہوتی ہے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۲۵/۴۴-۴۳) یہ انسان نہیں رہتے بلکہ حیوانی سطح پر آجاتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کر دی گئی کہ جو لوگ جذبات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ ..... اَهْوَآءَهُمْ (۴۷/۱۶) "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اس لئے کہ یہ اپنے جذبات ہی کے پیچھے چلتے رہے"۔ یہ صاحبِ علم و عقل ہوتے ہیں لیکن جس طرح نشے کی حالت میں انسان کی عقل و ہوش کچھ کام نہیں دیتی۔ جذبات سے مغلوب ہو جانے پر علم و بصیرت بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اَفَرَءَيْتَ ...... غِشٰوَةً (۴۵/۲۳) "کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ (خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے) وہ علم و عقل کے باوجود راستہ سے بھٹک گیا اور اس کے کانوں پر اور دل پر مہریں لگ گئیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے"۔ وہ اقوامِ سابقہ کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ وہ اس لئے تباہ نہیں ہوئیں کہ وہ علم و بصیرت نہیں رکھتی تھیں، وہ اس لئے تباہ ہوئیں کہ ان کی مفاد پرستیوں کے جذبات نے ان کی غلط روش

مستبصرین کی ہلاکت

کو ان کی نگاہوں میں بڑا خوشنما بنا دیا اور وہ دانش و بینش اور علم و بصیرت کے باوجود ہلاک ہو گئیں۔ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا ..... كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۲۹/۳۸) "اور عاد و ثمود (کے انجام پر غور کرو جو) ان کی بستیوں کے کھنڈرات سے واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ ان کے سرکش جذبات نے ان کے غلط اعمال کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھا دیا اور اس طرح انہیں صحیح راستے کی طرف جانے سے روک دیا اور وہ تباہ ہو گئے حالانکہ وہ علم و بصیرت رکھتے تھے"۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ ...... يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۷-۲۶) "ان قوموں کو جیسا غلبہ و تمکن حاصل تھا ویسا تمہیں بھی حاصل نہیں۔ ان کی آنکھیں سب کچھ دیکھتی تھیں۔ ان کے کان سب کچھ سنتے تھے۔ ان کے دل سب کچھ سمجھتے تھے (وہ دانا و بینا تھیں) لیکن جب انہوں نے اپنے جذبات کے پیچھے لگ کر قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی اختیار کی تو ان کی سماعت و بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آسکے۔ اور جس تباہی (تنذیر) کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا"۔

ان تصریحات سے (بظاہر) ایسا نظر آتا ہے کہ قرآن کی رُو سے عقل (جس کا اس نے اتنا بلند مقام بتایا تھا) جذبات کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اور جذبات، انسان کو صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیتے۔ لہٰذا اس مقام پر انسان

جذبات اور قرآن

بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ افلاطونی طلسم (ویدانت اور تصوّف) نے اس مشکل کا حل یہ بتایا کہ جذبات کو فنا کر دو تا کہ — نہ رہے بانس نہ بجے بانسری — لیکن

قرآن اس ذہنیت کو رہبانیت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لوگوں کا خود ساختہ نظریہ ہے جسے خدا کی سند حاصل نہیں (۵۷/۲۷)۔ اوّل تو اس لئے کہ (وہ جانتا ہے کہ) جذبات کبھی فنا نہیں ہو سکتے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ انہیں دبا دیں۔ لیکن جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر انہیں ایک طرف سے دبا دیا جائے تو وہ اپنے ابھرنے اور نکلنے کے لئے دس راستے خود پیدا کر لیتے ہیں اور یہ راستے ایسے ہلاکت انگیز ہوتے ہیں کہ اس سے انسان کی ذات بے حد ملوّث ہو جاتی ہے۔ اور معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ سایئکالوجی کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ جذبات کی PEPRESSION سے PERVERSION پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جذبات انسان کی تباہی کا موجب ہیں اور ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہیں فنا کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ ایک ایسی چیز پیدا کر دی ہے جو شرہی شر EVIL ہے۔ قرآن کی رُو سے خدا کے متعلق یہ تصور باطل اور گمراہ کن ہے۔ خدا یکسر خیر ہے۔ اور

خیر و شر

اس نے کوئی چیز ایسی نہیں بنائی جو فی ذاتہ شر ہو اور اس کا علاج اس کے فنا کر دینے کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس لئے دنیا میں مختلف قوتیں پیدا کی ہیں۔ قوتوں کا استعمال انہیں خیر و شر بنا دیتا ہے۔ اگر تلوار کو ظالم کا ہاتھ روکنے کے لئے استعمال کیا جائے تو وہ خیر ہے۔ اگر اسے مظلوم کے گلے پر چلایا جائے تو وہ شر ہے۔ جذبات اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتے ہیں۔ اگر اس قوت کو سرکش اور بے لگام چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ تخریب ہوتا ہے۔ اگر اسے صحیح راستے CHANNEL پر ڈال دیا جائے تو وہ تعمیری نتائج پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا کسی شے کا صحیح مصرف میں استعمال ہونا خیر ہے اور غلط مقام پر استعمال (حتیٰ کہ اس کا رائگاں اور بیکار چلے جانا) شر۔

قرآن کی رُو سے جذبات کوئی ایسی چیز نہیں جن سے دُور بھاگا جائے۔ اور انہیں قابلِ نفرت قرار دے کر فنا کر دینے کی فکر کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ جب جذبات سے وحی کی راہ نمائی میں کام لیا جائے تو اس سے تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ اس راہ نمائی سے سرکش اور بیباک ہو جائے تو اس کا نتیجہ ہلاکت اور بربادی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا ..... ظّٰلِمِیْنَ (۲۸/۵۰) "اگر یہ لوگ تیری بات نہیں سنتے اور مانتے تو (یہ اس لئے نہیں کہ یہ عقل و فکر کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمہاری بات ماننے کے قابل ہی نہیں)۔ یہ اس لئے ہے کہ یہ لوگ اپنے جذبات کے پیچھے چل رہے ہیں اور اس شخص سے زیادہ گمراہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر اپنے جذبات کے پیچھے چلا جائے۔ یاد رکھو خدا کا قانون ایسے لوگوں کی راہ نمائی نہیں کرتا جو مختلف قوتوں کو ان کے صحیح مقام پر نہ رکھیں"۔

ان تصریحات سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آ گئی کہ جذبات سے اگر وحیٔ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے تو اس سے

وہ نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کے لئے جذبات کو پیدا کیا گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جذبات میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہیں۔ یہ کام عقل کا ہے۔ بالفاظِ دیگر، جو کچھ قرآن نے کہا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل اگر وحی کی راہ نمائی میں چلے تو اس میں اتنی

عقل وحی کی روشنی میں

قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ (جذبات کی لونڈی بننے کے بجائے) جذبات کو اپنے پیچھے چلائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو عقل جذبات سے مغلوب ہو کر ان کا آلۂ کار بن جاتی ہے وہ عقل خام اور نا تربیت یافتہ ہے۔ جس عقل کی تربیت وحی کی راہ نمائی میں کی جائے وہ اتنی پختہ ہو جاتی ہے کہ جذبات کے دبانے سے دب نہیں سکتی بلکہ وہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتی ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ تنہا عقل جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے لیکن عقل اور وحی دونوں مل کر جذبات پر غالب رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جو لوگ وحی کی راہ نمائی میں چلتے ہیں ان پر "شیطان" غالب نہیں آ سکتا۔ ("شیطان" سے مراد انسان کے سرکش جذبات اور اُن کے تابع چلنے والی عقل ہے)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی، عقل کو وہ کون سی بات سمجھاتی ہے جس سے اس میں اتنی پختگی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جذبات کے تابع چلنے کی بجائے انہیں اپنے پیچھے پیچھے چلاتی ہے، اور اس طرح تخریب کی بجائے تعمیری نتائج مرتب کرتی

وحی سے عقل کی تربیت کیسے ہوتی ہے

چلی جاتی ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور انتہائی غور و فکر کا محتاج۔ بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ انسان کی عقل ہمیشہ اُس چیز کو اختیار کرتی ہے جس میں اُسے اپنا فائدہ نظر آئے۔ جو شخص اپنے فائدے کی سوچتا ہے اسے عقلمند کہا جاتا ہے جو اپنا نقصان چاہتا ہے اُسے ہر شخص بے وقوف بلکہ پاگل کہتا ہے۔ لہٰذا عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے فائدے کی سوچے۔ اور یہ وہ فریضہ ہے جس سے آپ اُسے باز نہیں رکھ سکتے۔

آپ نے یہ بھی اکثر دیکھا ہو گا کہ ایک شخص کوئی کاروبار کرتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا کاروبار اختیار کر لیتا ہے۔ دریافت کرنے پر وہ بتاتا ہے کہ یوں تو پہلے کاروبار میں بھی نقصان نہیں تھا لیکن موجودہ کام میں زیادہ فائدہ ہے۔ لہٰذا انسان کی عقل اس کام کو چھوڑ دیتی ہے جس میں کم فائدہ ہو۔

لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ عقل ایک کام کو یہ سمجھ کر اختیار کرتی ہے کہ اس میں بہت زیادہ فائدہ ہے لیکن اس میں فائدے کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو عقل اپنے لئے نفع بخش سمجھے وہ فی الواقعہ نفع بخش ہو۔

تصریحات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ

(i) اگر عقل کو مطمئن کرا دیا جائے کہ فلاں بات میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ اس بات کو اختیار کرے گی.
(ii) جب وہ کسی معاملہ میں تجربہ کے بعد دیکھ لے کہ کہنے والے کی بات سچی ثابت ہوئی ہے تو وہ اس کے بعد اس کی اور باتوں پر بھی اعتماد کرے گی. اور جب تک اس کی کوئی بات نقصان رساں ثابت نہ ہو جائے وہ اس پر اعتماد کرتی جائے گی.
ان مبادیات کے بعد آگے بڑھیئے. ہمارے ہاں ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ "مال صدقۂ جان. جان صدقۂ آبرو".

مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو

اس کے معنی یہ ہیں کہ مال بھی اپنی جگہ قیمت رکھتا ہے لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز بچ سکتی ہو تو انسان کی خاطر مال قربان کر دینا چاہیئے. ایسے وقت میں جو شخص ایسا کرتا ہے اسے عقلمند کہا جاتا ہے. اس کے یہ معنی ہوئے کہ مال کے مقابلے میں جان کا بچانا از روئے عقل زیادہ نفع رساں ہے. اس لئے جب مال اور جان میں TIE پڑے گی، تو انسانی عقل مال کو قربان کر کے جان بچا لے گی.
اور اگر کبھی ایسا ہو کہ جان اور آبرو میں TIE آپڑے تو عقلمند وہ ہے جو آبرو کے تحفظ کے لئے جان تک بھی قربان کر دے.
جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ مال، جان اور آبرو میں سے ہر شے اپنی اپنی قیمت رکھتی ہے لیکن ایک تو ان کی قیمتوں میں فرق ہے. یعنی مال کی قیمت سے جان کی قیمت زیادہ ہے اور جان کی قیمت سے آبرو کی قیمت زیادہ.

اضافی اور مستقل اقدار

دوسرے یہ کہ آبرو اتنی قیمتی متاع ہے کہ اسے کسی چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا. لیکن مال اور جان ایسی چیزیں ہیں جنہیں، ان سے زیادہ قیمتی شے کے حصول کی خاطر قربان کرنا پڑ جاتا ہے. بالفاظ دیگر مال اور جان کی اقدار اضافی RELATIVE VALUES ہیں لیکن آبرو کی قیمت مستقل PERMANENT یا مطلق ABSOLUTE ہے.
کرنے کا کام یہ ہے کہ عقل کو بتایا جائے کہ زندگی کی فلاں متاع کی قیمت کیا ہے. اور وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو مستقل اقدار رکھتی ہیں. اس سے یہ ظاہر ہے کہ جب تک مستقل اقدار کا تعین نہ کیا جائے یہ متعین کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کہ کس شے کی حفاظت کے لئے کس شے کو قربان کر دینا ضروری ہے. یہی اخلاقیات ETHICS کی بنیاد ہے.
گذشتہ ابواب میں ہم نے یہ بتایا ہے کہ دین وہ طریق زندگی بتاتا ہے جس پر چل کر کاروانِ انسانیت اپنی منزل تک

دین مختلف اقدار کا تعین کرتا ہے

پہنچ سکتا ہے. یا وہ ضابطۂ حیات دیتا ہے جس کی رو سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے. اب ہم اس مقام تک پہنچ گئے ہیں جہاں

متعین طور پر کہا جا سکتا ہے کہ دین ہمیں کیا دیتا ہے؟ ایک فقرے میں یہ کہ دین مختلف اقدار کا تعین کرتا ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کا ایک تصور یہ ہے کہ انسان عبارت ہے اپنے طبیعی جسم سے۔ جسم کے تقاضوں کی تسکین مدعائے حیات ہے۔ اور یہ سب طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصورِ زندگی کے مطابق اقدار کا تعین بھی طبیعی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔ اس کے لئے نہ کسی خارجی راہ نمائی کی ضرورت ہے نہ ماورائے عقل کسی سرچشمۂ علم کی احتیاج۔ انسان کے طبیعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے (ان تقاضوں میں جسم کی پرورش کے ساتھ جذباتی حظائظ ولذائذ بھی شامل ہیں) کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں میں کون سی زیادہ اہم اور قیمتی ہے اور کون سی کم۔ جب دو چیزوں میں تصادم ہو تو ان میں سے کسے اختیار کرنا چاہیئے اور کسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ سب کچھ انسانی عقل وتجربہ کی رُو سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جب مال اور جان میں TIE پڑ جائے تو جان کی حفاظت کے لئے مال کو قربان کر دینا چاہیئے۔ اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت نہیں۔ جان کی حفاظت انسان (بلکہ تمام حیوانات) کی جبلّت INSTINCT کا تقاضا ہے جس کی تصدیق اس کی عقل اور تجربہ مشاہدہ اور مطالعہ کرتے ہیں۔

لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان محض جسمِ انسانی کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات یا خودی کہتے ہیں۔ جس طرح جسم کے تقاضے ہیں اسی طرح اس کی ذات کے بھی تقاضے ہیں۔ جس طرح جسم کی نشوونما ہوتی ہے، اسی طرح اس کی ذات کی بھی نشوونما ہوتی ہے۔ جس طرح جسم کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔

واضح رہے کہ (جیسا کہ ہم پہلے باب میں بیان کر چکے ہیں) انسان ایک وحدت ہے جس کے مظہر جسم اور ذات دونوں ہیں۔ اس لئے (قرآنی نقطۂ نگاہ سے) انسانی جسم اور اس کی ذات دو متخاصم اور متناقص "عناصر" نہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ نہ ان میں سے ایک شر ہے اور دوسرا خیر۔ انسان عبارت ہے ان دونوں سے اور دونوں کی پرورش اور نشوونما ضروری ہے۔ لیکن جس طرح جسم سے متعلق اقدار میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی قدر زیادہ اہم ہوتی ہے کوئی کم۔ اور دو اقدار کے تصادم کی صورت میں کم قدر کو زیادہ قیمتی قدر کی خاطر چھوڑ دینا پڑتا ہے اسی طرح جب جسم سے متعلق کسی قدر اور ذات سے متعلق قدر میں باہمی تضاد ہو تو چونکہ انسانی ذات، جسم کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہے، اس لئے جسم سے متعلق قدر کو ذات سے متعلق قدر کی خاطر چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ (جیسے جان اور آبرو کے تصادم کے وقت آبرو کے تحفظ کے لئے جان کو قربان کر دینا چاہیئے) جو اقدار انسانی ذات کو نشوونما دے کر حیاتِ جاوید کا مستحق بنا دیتی ہیں وہ ان تمام اقدار سے افضل اور گراں بہا ہیں جن کا تعلق محض جسم کی حفاظت اور نشوونما

قرآنی نظامِ اخلاق

سے ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر قرآنی نظامِ اخلاق کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ان مستقل اقدار کا تعین عقلِ انسانی کی رُو سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ چیز عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کا تعین وحی کی رُو سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کا یہ فیصلہ ایسا ہے جس کی تائید اب مغرب کے

مستقل اقدار صرف وحی دے سکتی ہے

مفکرین اور ماہرینِ علم الاخلاق کی طرف سے بھی ہو رہی ہے۔ مثلاً مارٹن بوبر MARTIN BUBAR لکھتا ہے۔

> مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ ڈان جون کے نزدیک زیادہ سے زیادہ عورتوں کا اپنے دامِ فریب میں لے آنا مستقل قدر ہے۔ اور ایک ڈکٹیٹر کے نزدیک قوت کا حصول مستقل قدر۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہیئے جسے ہر شخص متعلقہ تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔
>
> BETWEEN MAN AND MAN

راشڈل HASTINGS RASHDALL اپنی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے۔

> اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے
>
> (صفحہ ۲۸۶)

اس حقیقت کو اس نے دوسرے مقام پر زیادہ وضاحت سے لکھا ہے جہاں کہا ہے کہ

> ہم یہ کہتے ہیں کہ قانونِ اخلاق اپنا حقیقی وجود رکھتا ہے اور اخلاقیات مطلق ہیں یعنی کوئی ایسی شے ضرور ہے جسے ہم اخلاقی فیصلوں میں حق مطلق یا باطل مطلق کہہ سکتے ہیں۔ خواہ ہم یا کتنے ہی اور انسان انہیں ایسا نہ مانیں۔ اخلاقیات سے ہمارا جو مفہوم ہے اس کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے۔ اس قسم کے غیر مشروط موجود فی الخارج مطلق۔ اخلاقی قوانین بطور ایک نفسیاتی حقیقت تو ضرور موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس قسم کا قانون ملے گا کہاں سے۔ یہ قانون کسی انسانی شعور میں تو ملنے سے رہا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے۔ اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان بھی اخلاقیات میں ایک نگاہ رکھتے ہیں۔
>
> (صفحہ ۲۱۱)

یہاں تک اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اخلاق کا معیار مستقل اور مطلق اقدار پر ہے۔ اور مطلق اقدار کو انسانی ذہن پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد راشڈل لکھتا ہے۔

ایک مطلق اخلاقی قانون یا اخلاقی نصب العین کسی مادی شے کے اندر موجود ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہی یہ کسی انسان کے ذہن میں موجود ہو سکتا ہے۔ ایک اخلاقی قانون صرف کسی MIND کے اندر مل سکتا ہے۔ اور مطلق اخلاقی قانون صرف اُس MIND کے اندر مل سکتا ہے، جو حقیقت کا سرچشمہ ہو۔ اسی کو خدا کہتے ہیں۔

(صفحہ ۲۱۲)

وحی کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ نبی کو خارج سے ملتی ہے۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نہیں اُبھرتی یعنی اس میں OBJECTIVITY ہوتی ہے۔ اسے قرآن نے "نزول" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ راشڈل لکھتا ہے کہ

اخلاقی پابندیوں سے مراد وہ ضابطۂ اخلاق ہے جو انسان کو خارج سے عطا ہو...... یہ عقیدہ درحقیقت خدا پر ایمان کے مترادف ہے۔　　　(صفحہ ۲۱۳)

H.N.WIEMAN کے نزدیک خدا کی DEFINITION ہی یہ ہے کہ

وہ کارگہِ فطرت میں اقدار کا سرچشمہ ہے۔

برگساں اس باب میں لکھتا ہے۔

انسان تنہا عقل کی روشنی میں صحیح راہ پر چل ہی نہیں سکتا..... عقل ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہیں تو وہ اس بلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو دے سکے وہ حقیقت کا پتہ کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتی۔

نظریۂ اضافیت کے مفکر، پروفیسر آئن سٹائن نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام ہی OUT OF MY LATER DAYS ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے۔

سائنس ہمیں صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے"۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیے"۔ اس لئے اقدار کی قیمت مقرر کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے برعکس مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر و عمل کی قیمت مقرر کرے...... یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربے سے درست ثابت ہو۔　(صفحہ ۱۲۴ از ۱۱۴ تا ۲۵)

یہ اقدار وحی کے ذریعہ مل سکتی ہیں جس کی خصوصیات پروفیسر جوڈ کے نزدیک یہ ہوتی ہے کہ

یہ اپنی سند آپ ہوتی ہے اس کے لئے ہم کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ یہ استدلالی طریق کا نتیجہ نہیں

ہوتی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم بعد میں وحی کی تائید میں عقلی دلائل پیش کردیں۔ لیکن جس طریق سے وحی حاصل ہوتی ہے وہ استدلالی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جن علوم کو استدلالی کہتے ہیں ان کی اصل و بنیاد بھی غیر استدلالی ہوتی ہے۔ مثلاً علم ریاضی کے بنیادی اصول۔

پروفیسر CASSIRER اپنی شہرۂ آفاق کتاب AN ESSAY ON MAN میں لکھتا ہے:۔

یہ حقیقت کہ دنیا میں عقل بڑی مبہم چیز ہے اور اس کے فیصلے یونہی تسلیم کر لینے کے قابل نہیں ہوسکتے، انسان کو کبھی معلوم نہ ہوسکتی اگر اس کی طرف وحی کی روشنی نہ آتی۔ وحی نے ہی آکر اُسے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل اس قابل ہی نہیں کہ وہ صداقت و حکمت کی طرف راہ نمائی کرسکے۔ اس لئے کہ وہ خود اپنے مفہوم و مطالب کے اعتبار سے مبہم ہوتی ہے۔ (صفحہ ۹)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مطلق یا مستقل اقدار کا سرچشمہ علمِ خداوندی ہے اور ان کے حصول کا ذریعہ وحی۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ جو ضرب المثل ہمارے سامنے آچکی ہے (یعنی مال صدقۂ جان۔ جان صدقۂ آبرو)۔ اس میں اس بات کو تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ جان بچانے کی خاطر مال خرچ کر دینا چاہیئے اس لئے کہ جان کا تعلق انسان کے جسم سے ہے۔ اسے ہر شخص محسوس کرتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جان کے ضائع ہوجانے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اس کا احساس ہر شخص نہیں کرسکتا کہ آبرو کے ضائع ہوجانے سے کیا نقصان ہوتا ہے۔ اس سے انسان کا کوئی مادی نقصان تو ہوتا نہیں اس نقصان کا تعلق کسی ایسی شے سے ہے جو غیر مادی ہے۔ اور یہ چیز انسان کی ذات PERSONALITY ہے۔ اگر کوئی شخص انسان کی ذات کو نہیں مانتا تو اس کے نزدیک آبرو کے ضائع ہوجانے سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ

مستقل اقدار کا اثر انسانی ذات پر پڑتا ہے

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے معاشرہ (سوسائٹی) میں بدنامی ہوجاتی ہے۔ لیکن بدنامی اُس معاشرے میں ہوتی ہے جو آبرو کو قیمتی متاع سمجھے۔ جس سوسائٹی میں آبرو کو قیمتی متاع نہ سمجھا جائے اس میں آبرو کے ضائع ہوجانے پر بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مثال کے طور پر) ہمارے ہاں اگر (بدقسمتی سے) کسی غیر شادی شدہ لڑکی کو حمل قرار پاجائے تو یہ چیز اس کے لئے اس قدر بدنامی کا باعث ہوجاتی ہے کہ وہ اس کی بجائے مرجانے کو ترجیح دے دیتی ہے لیکن یورپ میں اس قسم کا حمل معیوب قرار نہیں دیا جاتا۔ اس لئے وہاں بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے یہ واضح ہے کہ مستقل اقدار وہ ہیں جن کا نفع اور نقصان (اصلاً اور اساساً) انسانی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے مستقل یا مطلق اقدار کے لئے انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری، اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا تسلیم کرنا

بھی ضروری ہے کہ ان اقدار کے ضائع کر دینے سے (اگرچہ انسانی جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن اس سے) انسانی ذات کو نقصان پہنچتا ہے. بالفاظِ دیگر اسے ماننا ضروری ہے کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے. اس کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا. اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں. جن اعمال سے انسانی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے وہ اس کی نشوونما DEVELOPMENT میں ممد و معاون ہوتے ہیں. اور جب انسانی ذات نشوونما پالیتی ہے تو وہ حیاتِ جاوید حاصل کرلیتی ہے. اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی طبعی موت کے بعد بھی حیات کا تسلسل تسلیم کیا جائے (اسے آخرت پر ایمان لانا کہتے ہیں). بالفاظِ دیگر اس کے لئے

ایمانیات کی ضرورت

(۱) خدا پر ایمان

(۲) انسانی ذات پر ایمان.

(۳) زندگی کے تسلسل (آخرت) پر ایمان۔

(۴) قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان۔

(۵) اور اس بات پر ایمان کہ سلسلۂ کائنات اور خود انسان کی تخلیق ایک خاص پروگرام کے مطابق بالمقصد ہوئی ہے، ضروری ہے۔

دیکھئے اس باب میں مغربی مفکر کیا کہتے ہیں. راشڈل لکھتا ہے۔

اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ کائنات کا کوئی مقصد ہو اور وہ مقصد حکمت پر مبنی ہو۔ (ایضاً ص ۲۱۹)

دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ

(i) انسانی ذات ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ii) ذات کا سرچشمہ مادی نہیں روحانی ہے. یعنی اس کی زندگی مستقل ہے اور انسانی جسم کے تغیرات سے اس میں تبدیلیاں نہیں ہوتیں۔

(iii) انسانی اعمال کا سرچشمہ اس کی ذات ہے. جس قسم کے اس کے اعمال ہوں گے اسی کیفیت کی اس کی ذات سمجھی جائے گی۔ (صفحہ ۲۰۵، ایضاً)

نیز اس کے لئے

انسان کی حیات بعد الممات یعنی حیاتِ جاوداں پر ایمان بھی ضروری ہے. (ایضاً صفحہ ۲۱۵)

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے دیکھئے کہ قرآن اسے دو آیات میں کس حسنِ ایجاز سے بیان کرتا ہے. سورۂ جاثیہ میں ہے. وَخَلَقَ اللّٰهُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۴۵/۲۲) "خدا نے اس سلسلۂ کائنات (ارض و سموٰت) کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے یونہی رائگاں جانے کے لئے نہیں بنایا۔ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور اس لئے کہ ہر شخص کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہو جائے۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو۔ اس کے بعد ہے اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ" تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود بنا لیا کہ جو ان کا تقاضا ہو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ انہی کے پیچھے چلنے لگ جائے۔ جب انسان کی کیفیت یہ ہو جائے تو اس کی عقل و فکر وہ کام قطعاً نہیں دیتی جس کے لئے انہیں انسان کو دیا گیا تھا۔ اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ..... غِشٰوَةً (۴۵/۲۳)" ایسا شخص علم و بصیرت کے باوجود غلط راستے پر چلتا ہے۔ اس کے کانوں اور دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ" ایسا شخص صرف اسی صورت میں صحیح راستے کی طرف آ سکتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کی پرستش چھوڑ کر قوانین خداوندی کا اتباع کرے۔ اے رسول! تم ان مخاطبین سے پوچھو کہ کیا تم نے اس سے کوئی سبق حاصل کیا؟"

جذبات کے پیچھے چلنے والے لوگ وہ ہیں جو انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھ رہے ہیں۔ اور انسانی ذات اور اس کی حیات بعد الممات پر یقین نہیں رکھتے۔ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴)" یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے پھر مرورِ زمانہ اس کے قویٰ کو مضمحل کر دیتا ہے اور آخر الامر انسان مر کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے ان لوگوں کا تصور انسانی زندگی کے متعلق۔ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)" لیکن ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں۔ محض قیاسات پر مبنی ہے۔ علم کی بارگاہ سے یہی فتویٰ ملے گا کہ انسان کے اندر یقیناً ایک شے ایسی بھی ہے جو اس کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ اس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔

دوسرے مقام پر ہے فَاَعْرِضْ عَنْ ..... بِمَنِ اهْتَدٰى (۵۳/۳۰-۲۹) جو شخص ہمارے قوانین سے پہلو تہی کرتا ہے تم اس سے اعراض برتو۔ اس لئے کہ اس شخص کے سامنے صرف اس کی طبیعی زندگی کے مفاد ہیں۔ وہ زندگی کے تسلسل اور ذاتِ انسانی کی جاودانی کا قائل ہی نہیں۔ ان کا مبلغ علم بھی طبیعی قوانین (PHYSCIAL LAWS) تک محدود ہے۔

قرآن کریم نے ان مقامات پر واضح کر دیا کہ مستقل اقدار پر وہی شخص ایمان لا سکتا ہے جو زندگی کو طبیعی زندگی ہی نہ سمجھے

مستقل اقدار پر کون ایمان لا سکتا ہے؟

بلکہ انسانی ذات، قانون مکافاتِ عمل اور حیات بعد الممات کا قائل ہو۔ جو ان حقائق پر یقین نہ رکھے اس کے لئے نہ خدا

پر ایمان لانا کوئی معنی رکھتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی ضابطۂ اخلاق (MORALITY) کا قائل ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اخلاقی ضابطہ مستقل اقدار ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور مستقل اقدار پر وہی یقین رکھ سکتا ہے جو انسانی ذات، قانونِ مکافات اور تسلسلِ حیات کا قائل ہو۔

جب انسانی عقل و بصیرت، اس طرح مستقل اقدار کو تسلیم کرلے تو وہ جذبات کے پیچھے چلنے کے بجائے جذبات کو اپنے پیچھے چلاتی ہے۔ اور خود وحیٔ خداوندی کی روشنی میں چلتی ہے۔ اسی کو اقبالؔ عقلِ خودبیں کے مقابلے میں عقلِ جہاں بیں یا "خرادب خوردہ دل" سے تعبیر کرتا ہے۔ وحی اور عقل کے اس امتزاج کو قرآن مومنین کی خصوصیت بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ..... ھٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰-۱۸۹) "یقیناً کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کی تخلیق اور لیل و نہار کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی ان اربابِ بصیرت کے لئے جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور یوں تخلیقِ ارض و سمٰوٰت پر غور و فکر کرکے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے نشوونما دینے والے نے اس کارگۂ کائنات کو نہ تو بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے۔" یہی وہ اربابِ بصیرت ہیں جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ (۵/۱۰۰) "اے اربابِ بصیرت تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔" انہی کو وہ صاحبِ ایمان قرار دیتا ہے جب کہتا ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا (۶۵/۱۰) "اے اربابِ بصیرت، جو ان حقائق پر ایمان رکھتے ہو قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔" یعنی قرآن کی رُو سے مومن اور متقی اربابِ بصیرت ہی ہو سکتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ قَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ وَ

ایمان اور علم و بصیرت ساتھ ساتھ

الۡاِیۡمَانَ (۳۰/۵۶) "جن لوگوں کو علم اور ایمان دیا گیا ہے وہ یہ کہتے ہیں۔" یعنی ایمان اور علم و بصیرت لازم و ملزوم ہیں۔ علم کے بغیر انسان ایمان تک پہنچ نہیں سکتا۔ یقین اسی کا یقین ہے جس نے اسے علیٰ وجہ البصیرت حاصل کیا ہو۔ لاکؔ (LOCKE) کا یہ قول اربابِ علم و فکر میں عام طور پر زبان زد ہے کہ

> جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔ (ESSAYS BOOK, IV)

لیکن آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے لاکؔ سے کتنی صدیوں پہلے اس حقیقت کو بیان کر دیا تھا کہ علم اور ایمان (وحی اور عقل) ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ ایمان وہی ایمان ہے جس کی تائید علم و بصیرت کرے۔ اس طرح ایمان لانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے جذبات ان کے اپنے ارادوں کے تابع چلتے ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی غلط خیال گھومتے پھرتے ان کے قریب آجائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ صحیح راستہ

کون سا ہے۔ جونہی قانونِ خداوندی ان کے سامنے آتا ہے، تمام تاریکیاں یک لخت چھٹ جاتی ہیں اور صحیح راستہ اُبھر کر ان کے سامنے آجاتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا..... مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱) جو لوگ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ جب کوئی غلط خیال یا سرکش جذبہ یونہی پھرتے پھراتے ان کے قریب آجاتا ہے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لاتے ہیں۔ جونہی وحی کی روشنی ان کے سامنے آتی ہے ساری فضا جگمگا اٹھتی ہے اور وہ اس کی روشنی میں فوراً فیصلہ کرلیتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔

یہ ہے قرآن کا وہ طریق جس سے وہ عقل کو مستقل اقدار کی محکمت منواتا ہے اور جب اس طرح عقل ان حقائق کو تسلیم کرلیتی ہے تو وحی کی روشنی میں اس کا یہ قدم صحیح راستے کی طرف اٹھتا ہے اور انسانی جذبات اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ وحی، عقل اور جذبات کے اس حسین امتزاج کا نام اسلامی نہجِ زندگی ہے۔ اس میں ہر فرد، ذہن کے کامل یقین اور دل کے پورے اطمینان کے ساتھ اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے (۹/۱۱۱) اور اس کی عقل اس کے اس سودے پر اسے مبارکباد دیتی ہے (۹/۱۱۱) اس لئے کہ اس نے علیٰ وجہ البصیرت اپنا اطمینان کرلیا ہوتا ہے کہ وہ مستقل اقدار جو وحی کے ذریعے سے متعین ہوئی ہیں ان کے اتباع میں نفع ہی نفع ہے۔ نقصان کا شائبہ تک نہیں۔ وَقِیْلَ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ قَالُوْا خَیْرًا (۱۶/۳۰) "متقیوں سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایسی چیز جو خیر ہی خیر ہے، جس میں شر کا گزر تک نہیں"۔ جب عقل ان اقدار کی حقیقت اور قیمت کو سمجھ لیتی ہے تو وہ ان ہلاکت انگیزیوں کی طرف جانے کی بجائے جن کی طرف سرکش جذبات بلاتے ہیں، وحی کی اس آواز کے پیچھے لگتی ہے جو اس کے لئے فی الحقیقت نفع بخش ہوتی ہے۔ اس لئے کہ عقل کا تقاضا ہی اس طرف رُخ کرنا ہے جو اسے نفع بخش دکھائی دے۔

حاصلِ بحث

وحی، عقل اور جذبات کے متعلق جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اسے مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ (۱) عقلِ انسانی کی حیثیت ایک قوت کی سی ہے جسے جس طرح استعمال کیا جائے گا اسی طرح اس کے نتائج مرتب ہوں گے۔

(۲) جب انسانی عقل (جذبات سے الگ ہٹ کر) خارجی کائنات کے رموز و اسرار کی تحقیق و تفتیش کرتی ہے تو وہ اپنے تجرباتی طریق سے صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اسے سائنٹفک طریقِ تحقیق کہا جاتا ہے، قرآن کریم اس طریق کی اہمیت پر بڑا زور دیتا ہے کیونکہ اس سے فطرت کی قوتیں مسخر ہوتی ہیں اور تسخیرِ فطرت ہی سے انسان مقامِ آدم تک پہنچتا ہے۔

(۳) لیکن انسانوں کے باہمی معاملات میں یہی عقل جب جذبات کے تابع چلتی ہے (یعنی جب اس قوت کو انسان کے

جذبات استعمال کرنے لگ جاتے ہیں) تو دنیا میں عقول کی جنگ شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَيُفْسِدُ فِی الْاَرْضِ ـ خونریزیاں اور فساد انگیزیاں ہوتا ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں' اتباعِ شیطان ہے۔

(۴) جذبات' انسانی عمل کے محرّک ہوتے ہیں اس لئے یہ بھی انسان کی بڑی متاع اور عظیم قوت ہیں۔ لیکن یہ قوت اسی صورت میں تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے جب اسے عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے۔

(۵) اس کا طریقہ یہ ہے کہ عقل کو ان مستقل اقدار کا محافظ بنا دیا جائے جو انسان کو وحی کی رُو سے ملتی ہیں۔ جب انسان جذبات سے الگ ہو کر' علم و بصیرت کی رُو سے غور و فکر کرے تو ان اقدار کی اہمیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور یوں اس کی عقل' ان کی حفاظت اور نگہداشت کو اپنا فریضہ قرار دے لیتی ہے۔ عقلِ انسانی کا اس طرح' مستقل اقدار کی اہمیت کا قائل ہو جانا' ایمان کہلاتا ہے۔

(۶) یوں انسان کے جذبات اور اس کی عقل (دونوں عظیم قوتیں) ایمان کے متعین کردہ نصب العین کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں' اور اس طرح فطرت کی قوتیں' انسانیت کی تباہی کی بجائے' اس کی تعمیر اور تہذیب کا موجب بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہ مقامِ مومن ہے۔ یعنی اپنے جذبات کو عقل کے تابع اور عقل کو وحی کے ماتحت رکھنے والا انسان۔ اس طریقِ عمل سے اس کی ذات مناسب نشوونما حاصل کر کے' زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہی قرآن کا منشاء ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کی عمارت "مستقل اقدار" کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ان اقدار کا تفصیلی بیان آئندہ ایک باب میں ملے گا۔

باب پنجم
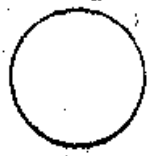
"قانون" کی کارفرمائی

ہم پہلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ خدا کا ایک تصور وہ ہے جسے ذہنِ انسانی نے تراشا تھا اور دوسرا وہ جسے وحی کے ذریعہ خود خدا نے دیا۔ انسانی ذہن کا تراشیدہ خدا، انسان کے اُس دَور کی یادگار ہے جب اس کا شعور ناپختہ UN-DEVELOPED اور اس کی فکر عہدِ طفولیت میں تھی۔ اُس زمانے کے انسان کے سامنے سب سے بڑی صاحبِ اقتدار ہستی راجہ، حاکم یا بادشاہ کی ہوتی تھی۔ اس لئے اس نے خدا کو بھی بادشاہ کے قالب میں ڈھال دیا۔ وہ خدا کے متعلق اس کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے بادشاہوں کے متعلق دیکھا کہ وہ کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ وہ جو جی میں آئے حکم دے دیں ہر ایک کو اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ ان سے کوئی اتنا بھی نہیں پوچھ سکتا کہ اس حکم کی مصلحت اور غایت کیا ہے۔ اگر کوئی ان سے ایسی بات پوچھنے کی جراَت بھی کرلے اور وہ اس (MOOD) میں ہوں کہ اس کا جواب دے دیا جائے، تو ان کا جواب بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا کہ یہ ہماری مرضی ہے۔ ہم ایسا چاہتے ہیں۔ یہی وہ "مزاجِ شاہاں" ہے جس کے متعلق (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) سعدی کہتا ہے کہ "گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند"۔ کبھی ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کوئی سلام کرے تو اس سے بگڑ جائیں اور کبھی یہ عالم کہ کوئی گالی دے تو اسے جاگیر بخش دیں۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کو اس شکل میں ڈھالا جائے اور اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہو کہ (بادشاہ کے مقابلہ میں) خدا کے اختیارات لامحدود ہوتے ہیں تو ایسا خدا آمرِ مطلق (DIRECTOR) ہوگا۔ اس کے متعلق یہ تصور کرنا بھی گستاخی (اور خدا کے لئے وجہِ تذلیل) سمجھا جائے گا کہ وہ کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ

خدا، آمرِ مطلق

وہ خدا کیا ہوا جو کسی قاعدے کا پابند ہو۔ پابندیوں میں گھرے ہوئے ہونا، شانِ خداوندی کے خلاف ہے۔ وہ خود حاکمِ مطلق ہے اور اس کے اوپر کوئی اور حاکم نہیں وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند کیسے ہو سکتا ہے، اس کا ہر حکم قانون؛ ہر اشارہ قاعدہ

ہو گا. وہ جو جی میں آئے کرے اور جو چاہے حکم دے. وہ جسے چاہے تباہ و برباد کردے اور جسے چاہے انعام واکرام بخش دے. جو اس کی خوشنودی حاصل کرلے اسے سب کچھ مل جائے، جس سے وہ ناراض ہو جائے وہ کہیں کا نہ رہے. خدا کے متعلق اس تصوّر کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ بھی تھا کہ انسان ہر وقت خدا سے ڈرتا رہے کہ معلوم وہ کب ناراض ہو جائے اور تباہ و برباد کرڈالے.

اس تصوّر کا دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ (جس طرح بادشاہوں کی خوشنودئ مزاج حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے اور ذریعے اختیار کئے جاتے ہیں) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے (بھی) کچھ ایسے ہی طریقے وضع کئے جائیں اور اسی قسم کے ذرائع اختیار کئے جائیں. بادشاہوں کو خوش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے حضور قصیدے پڑھے جائیں. ان کی مدح و ستائش کے گیت گائے جائیں. ان کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جائیں. اگر ان حربوں سے بھی کام نہ چلے تو (امراء و وزراء میں سے) جو لوگ ان کے مقرّب ہوں ان کے ذریعے ان تک سفارش پہنچائی جائے اور اس طرح اپنا کام نکلوا لیا جائے.

آپ تاریخِ انسانیت پر غور کیجئے. ذہنِ انسانی نے خدا کا جو تصوّر وضع کیا تھا اس میں خدا کی کیفیت ایسی ہی تھی اور یہی وہ تصوّر تھا جو نزولِ قرآن کے وقت ساری دنیا میں رائج تھا. ہم نے اوپر کہا ہے کہ خدا کا جو تصوّر وحی کی رُو سے (بوساطت انبیائے کرامؑ) ملا تھا وہ اس تصوّر سے مختلف تھا. لیکن خدا کی طرف سے جو وحی (مختلف اوقات میں) مختلف اقوام کی طرف آتی رہی نزولِ قرآن کے وقت وہ اپنی اصلی (اور غیر منزّہ) شکل میں کہیں موجود نہ تھی. اس لئے ان اقوام کے پاس بھی (جو آسمانی ہدایت کی حامل ہونے کی مدّعی تھیں) خدا کا تصوّر اسی قسم کا تھا جو ذہنِ انسانی نے تراشا تھا.

قرآن کا تصوّر

قرآن آیا اور اس نے خدا کے متعلق ذہنِ انسانی کے تراشیدہ تصوّر کی ہر گوشے سے تردید کی اور اس کی جگہ خدا کا صحیح تصوّر پیش کیا. خدا کا یہی وہ (صحیح) تصوّر ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہے اور جس سے انسانی زندگی کا ہر گوشہ متاثر ہوتا ہے. یہی وجہ ہے کہ اس نے "خدا پر ایمان" کو خشتِ اوّل" قرار دیا ہے اور اس تصوّر کے صحیح یا غلط ہونے کو کفر اور ایمان کا معیار ٹھہرایا ہے. بالفاظِ دیگر اگر کوئی شخص خدا کا وہ تصوّر رکھتا ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے تو قرآن اُسے مومن (خدا کو ماننے والا) قرار دیتا ہے. اس کے برعکس اگر کسی شخص کا خدا کا وہ تصوّر نہیں جسے قرآن پیش کرتا ہے تو قرآن کی رُو سے وہ مومن (خدا کو ماننے والا) قرار نہیں دیا جائے گا' خواہ وہ بزعمِ خویش اپنے آپ کو خدا کا پرستار ہی کیوں نہ سمجھتا ہو. اس سے ظاہر ہے کہ دین (اسلامی نظامِ زندگی) میں خدا کے تصوّر کو کس قدر اہمیت حاصل ہے.

اب دیکھئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے.

قرآن کی رُو سے خدا کی کارفرمائی کے تین دائرے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ ہم سب سے پہلے دائرۂ اوّل کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔

پہلا گوشہ — مشیّت

اس وقت کائنات میں جو نظام چل رہا ہے اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آجائے گی کہ یہاں علّت اور معلول (CAUSE AND EFFECT) کا سلسلہ جاری ہے۔ یعنی کائنات میں ہر حادثہ کے نمودار ہونے کے لئے کسی نہ کسی سبب کی ضرورت ہوتی ہے۔ سبب (CAUSE) کے بغیر کوئی واقعہ نمودار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب ہم اس سلسلۂ علّت و معلول کو پیچھے کی طرف لے جائیں گے تو آخر الامر ایک ایسا مقام آجائے گا جہاں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس زنجیر کی پہلی کڑی کسی نہ کسی طرح بلا سبب وجود میں آگئی تھی۔ اسے کہتے ہیں کسی شے کا عدم (NON-EXISTENCE) سے وجود (EXISTENCE) میں آجانا۔ یہ کس طرح سے ہوا تھا' یہ بات انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن اس کے متعلق اتنا ہی کہتا ہے کہ خدا بدیع السمٰوٰت والارض (۲/۱۱۷) ہے یعنی تمام سلسلۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ ظاہر ہے کہ جس مقام میں علّت اور معلول کا سلسلہ ہی نہ ہو وہاں آغازِ کار کے لئے کسی قاعدے اور قانون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ علّت اور معلول' قانون اور قاعدے ہی کا دوسرا نام ہے۔ قرآن نے اس مقام کو عالمِ امر سے تعبیر کیا ہے اور وہاں کی کارفرمائی کے متعلق بس اتنا بتایا ہے کہ اِنَّمَآ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ (۳۶/۸۲) اس گوشے میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کسی شے کو عدم سے وجود میں لایا جائے گا تو اس کے متعلق یہ بھی طے کیا جائے گا کہ اسے کیا ہونا چاہیے؟ اسے اپنی زندگی کی مختلف منازل طے کر کے آخر الامر کیا بننا ہے۔ اس کی خصوصیات کیا ہوں گی، اس کے خواص و اثرات کیا ہوں گے۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب کسی شے کا وجود ہی خدا کے امر (اختیارِ مطلق، ارادہ، مشیّت) کے مطابق عمل میں آیا ہے تو اس کی خصوصیات وغیرہ بھی اس کی مشیّت کے مطابق متعیّن ہوں گی۔ شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں ملی؟ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایک خاص نسبت سے باہم ملنے سے پانی کا قطرہ کیوں بنتا ہے؟ پانی نشیب کی طرف کیوں بہتا ہے۔ وہ ہمارے لئے ممدِ حیات کیوں ہے اور سنکھیا قاطعِ زندگی کیوں؟ یہ وہ امور ہیں جنہیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اشیاء کی خصوصیات' خدا کی مشیّت اور اس کے ارادے کے مطابق متعیّن ہوتی ہیں۔ ان میں WHY کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گوشہ (یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے اور اس کے خواص و اثرات متعیّن کرنے کا گوشہ) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَفۡعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ "اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یُرِیۡدُ (۲۲/۱۴) "اللہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جو چاہتا ہے"۔ اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ (۵/۱) وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا فیصلہ

چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کو اس کا حق نہیں کہ پوچھے کہ اس نے فلاں چیز کو ایسا کیوں بنایا اور فلاں فیصلہ ایسا کیوں کیا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا اور وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ اس کے سوا اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔

یہ ہے خدا کے "امر" کا وہ دائرہ جس میں اس کا اختیار و ارادہ مطلق حیثیت سے کارفرما رہتا ہے اور جہاں وہ کسی قاعدہ اور قانون کا پابند نہیں۔

اب دوسرے دائرے کی طرف آیئے جس میں کائنات سرگرم عمل ہے۔ ہم نے (دائرۂ اوّل میں) دیکھا ہے کہ خدا نے اپنے اختیارِ مطلق سے اشیائے کائنات کے خواص و اثرات مرتب کئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس کے امر کی رُو سے ہوا ہے۔ لیکن

دوسرا گوشہ۔ قوانینِ فطرت

اشیائے کائنات کے خواص و اثرات مرتب کرنے کے بعد خدا نے اپنے امر کی کیفیت بدل دی ہے۔ گوشۂ اوّل میں اس کا امر ضابطوں کا پابند نہیں تھا۔ لیکن اب وہی امر ضابطوں میں ڈھل گیا۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸) "خدا کا امر مقررہ پیمانوں کا پابند ہو گیا" (قدر کے معنی اندازے اور پیمانے کے ہیں)۔ دوسری جگہ ہے کہ اس نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳) یہ پیمانے اور اندازے وہی چیز ہیں جنہیں قوانینِ فطرت LAWS OF NATURE کہا جاتا ہے اور جو غیر متبدل ہیں۔ مثلاً پانی کے لئے یہ پیمانہ مقرر کیا گیا وہ عام حالات میں NORMALLY مائع (LIQUID) رہے۔ جب اسے ٹھنڈک پہنچائی جائے تو وہ ایک خاص درجہ تک پہنچنے کے بعد ٹھوس (برف) میں تبدیل ہو جائے۔ اسی طرح جب اسے حرارت پہنچائی جائے تو ایک معین مقام پر پہنچ کر بخارات (VAPOURS) بن جائے۔ اس کا کیمیاوی تجزیہ کیا جائے تو وہ پھٹ کر ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پانی کے لئے یہ قوانین (مقدرات) اس قدر محکم اور اٹل ہیں کہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ انسان جہاں جی چاہے اس کا تجربہ کر لے۔ اس میں کہیں فرق نہیں پائے گا۔ ان محکم قوانین کو خدا نے "سنت اللہ" (اللہ کی عادت یا روش) کہہ کر پکارا ہے۔ اور ان کے متعلق کہا ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲) "تم سنتہ اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے"۔

غور کیجئے کہ وہی خدا جو (دائرۂ اوّل میں) کہہ رہا تھا کہ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (وہ جو جی میں آئے کرتا ہے)۔ وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (جو کچھ اس کے ارادے میں آئے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے) اب کہہ رہا ہے کہ تم اس کی روش، عادت، سنت، قانون میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ یہ کتنی بڑی پابندی ہے جسے خدا نے اپنے اختیارِ مطلق پر عائد کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ جو

پابندی کوئی شخص اپنے اوپر از خود عائد کرتا ہے اس سے اُس شخص کے اختیار وارادہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ جب خدا نے از خود اپنے امر و مشیت کو قانون کے پیمانوں میں مقیّد کر دیا، تو اس سے اس کے صاحبِ اختیار وارادہ ہونے میں کوئی کمی نہیں آگئی۔ نہ ہی اس کے یہ کہنے سے کہ "ہم نے جو پابندیاں اپنے آمر پر عائد کی ہیں ان میں ہم کوئی تبدیلی نہیں کریں گے" اسے محکوم ومقیّد قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے کہ کائنات۔ لگے بندھے قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہے اور ان میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ یہ سب کچھ اس کے اپنے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق ہو رہا ہے۔ اُس نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ سلسلۂ کائنات نظم وضبط اور حسن وخوبی سے چلتا رہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ پانی کبھی تو آگ بجھائے اور کبھی خود ہی شعلے بن کر بھڑک اُٹھے۔ آگ کبھی پانی کو کھولا دے اور کبھی یخ بستہ کر دے تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ اس دوسرے گوشے (یعنی خارجی کائنات) میں خدا کا آمر ایک غیر متبدل قانون کی شکل میں کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ قوانین بھی خدا کے آمر، ارادہ، مشیت کے مطابق ہی سرگرم عمل رہتے ہیں اس لئے ان قوانین کی کارفرمائی کو بھی مشیّت اور آمر ہی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب اس گوشے میں یہ کہا جائے گا کہ "اللہ یوں کرتا ہے" تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ اپنے قانون کے مطابق یوں کرتا ہے"۔ یا "اللہ کا قانون یوں کرتا ہے"۔ مثلاً قرآن میں ہے "وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ ..... بِاَمْرِهٖ (۱۶/۱۲) خدا نے رات دن اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے اور (اسی طرح) ستارے بھی اس کے "امر" سے مسخر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجرامِ فلکی (چاند، سورج، ستارے) فطرت کے غیر متبدل قوانین کے مطابق مصروفِ نقل وحرکت ہیں۔ یہ قوانین ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ معمولی سے حسابی قاعدے کی رُو سے سینکڑوں برس پہلے بتایا جا سکتا ہے کہ چاند یا سورج کو فلاں وقت گہن لگے گا۔ اور فلاں وقت فلاں ستارا زمین سے اتنے فاصلے پر ہوگا۔ یہی وہ غیر متبدل قوانین ہیں جن پر علم الافلاک (ASTRONOMY) کی ایسی محیّر العقول عمارت استوار ہے لیکن ان قوانین کے لئے "امر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے عام معنی "حکم" کے ہیں۔ دوسری جگہ اس کے لئے "اذن" کا لفظ آیا ہے (۲۳/۶۵) جس کے عام معنی "اجازت" کے ہیں۔

لہٰذا خارجی کائنات کے نظم ونسق کے سلسلے میں جہاں جہاں امر، اذن، مشیّت وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں۔ ان سے مفہوم غیر متبدل قوانینِ فطرت ہیں۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ خارجی کائنات میں ہر شے کے لئے غیر متبدل قانون مقرر ہے جسے اس شے کی تقدیر کہتے ہیں۔ یعنی اُس چیز کے خواص واثرات اور تگ وتاز کا پیمانہ یا حلقہ۔ یہ قانون اٹل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کی کوئی شے اپنی تقدیر بدلنے پر اختیار نہیں رکھتی۔ اسے اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ جی چاہے تو ان قوانین کی اطاعت

کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ یا جی چاہے تو کسی حد تک ان قوانین کا اتباع کرے اور باقی ماندہ حصہ کے لئے کسی اور قانون کی اطاعت اختیار کرلے ۔ بالکل نہیں ۔ کائنات کی ہر شے اس قانون کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے جو اس کے لئے خالقِ کائنات نے مقرر کر رکھا ہے۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱۶/۴۹) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔"

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) پہلے دائرے میں، خدا اپنے غیر محدود اور غیر مقید اختیار و ارادہ کے تحت اشیائے کائنات، کو پیدا کرتا ہے اور ان کے لئے قوانین متعین کرتا ہے۔ اس دائرہ میں وہ سب کچھ اپنی مرضی اور ارادے سے کرتا ہے۔

(۲) دوسرے دائرے میں، خدا کے متعین کردہ قوانین محکم، اٹل اور غیر متبدل شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دائرے میں ہر ہر شے ان متعین قوانین کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہے۔ کسی شے کو ان قوانین سے سرِمو انحراف یا تجاوز کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے اور ان کے مطابق اشیائے کائنات کو اپنے کام میں لاسکتا ہے۔ اسے "تسخیرِ فطرت" کہتے ہیں جو مقامِ آدمیت کی بنیادی شرط ہے۔ "ملائکہ" کا آدم کے سامنے سجدہ ریز ہونا اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس دائرے میں خدا کی حکومت کی ایک آمر ناطق (ڈکٹیٹر) کی حکومت نہیں رہی بلکہ قانون کی حکومت[1] قرار پاجاتی ہے۔ البتہ اشیائے کائنات اس قانون کی پابندی پر مجبور ہوتی ہیں۔

تیسرا گوشہ — انسانی دنیا

اب تیسرے دائرے کی طرف آیئے۔ یعنی انسانی زندگی۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ تو وہ ہے جس کا تعلق قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) سے ہے۔ اس گوشے میں انسان اور دیگر حیوانات پر ایک ہی قسم کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے "عالمِ انسانیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) سے ہے۔ جس طرح خدا نے انسان (اور دیگر حیوانات) کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اسی طرح اس نے انسان کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی قوانین متعین کر دیئے ہیں۔ (یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور مستقل اقدار کہلاتے ہیں)۔ یعنی انسان کی طبیعی زندگی ہو یا ذات سے متعلق زندگی، اس پر بھی خدا کی کارفرمائی اس کے مقرر کردہ قوانین کی رُو سے ہوتی ہے جن کا علم انسان

---

[1] عالمِ امر (۲۱/۲۲) کے برعکس عالمِ خلق میں اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں (قوانین) کے لئے جواب دہ ہے۔ (۱۶/۲۵)

کو دے دیا گیا ہے۔ طبیعی زندگی سے متعلق علم، عقل و بصیرت اور تجربہ و مشاہدہ کی رُو سے اور انسانی ذات کے متعلق علم، وحی کی رُو سے۔

انسان کی صورت میں ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اشیائے کائنات ان قوانین پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں جو ان کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن انسان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق

انسان صاحبِ اختیار ہے

زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے انحراف اور سرکشی برت لے۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) "ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے محکم اور اٹل قانونِ حیات آچکا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔"

آپ نے دیکھا کہ ان تین دائروں میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا چلا گیا ہے۔ گوشۂ اوّل میں خدا کا مطلق اقتدار کارفرما تھا اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں تھا۔ وہاں مشیتِ ایزدی کے معنی یہ تھے کہ جس طرح خدا نے اپنی مرضی کے مطابق چاہا کر دیا۔ دوسرے گوشے میں مشیتِ خداوندی نے خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں اور ان پابندیوں نے غیر متبدل قوانین کی شکل اختیار کر لی۔ دوسری طرف جن اشیاء پر ان قوانین کا اطلاق ہوتا ہے انہیں بھی اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ ان سے سرتابی برت سکیں۔ تیسرے گوشے میں خدا کا قانون تو بدستور غیر متبدل رہا لیکن انسان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔

لیکن انسان کے اس اختیار کے ساتھ جبر کا پہلو بھی ہے۔ انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی مُنہ میں ڈال لے

وہ نتائج نہیں بدل سکتا

یا مصری کی۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھانے کے نتائج کو بدل ڈالے۔ خدا کا وہ قانون (جس کی رُو سے اس نے سنکھیا کو قاطعِ حیات بنایا ہے) اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا۔ اس لئے اس نے جہاں انسان سے یہ کہا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔ تم جس طرح جی چاہے عمل کرو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴۱/۴۰) "خدا کا قانون اچھی طرح دیکھ رہا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔" عمل کا انتخاب تو تمہارے اختیار میں ہے لیکن یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ تم اس کا نتیجہ بدل ڈالو۔ نہ تم اس کا نتیجہ بدل ڈالو۔ نہ تم اس کا نتیجہ بدل سکتے ہو اور نہ ہی اس نتیجہ کی زد سے بچ سکتے ہو۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵/۱۲) یقیناً تیرے رب کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ کائنات میں خدا کے بے شمار قوانین (تقدیرات) بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کی مرضی ہے کہ جس قسم کا قانون (تقدیر) اپنے لئے چاہے اختیار کر لے۔ انسان کے اس اختیار میں خدا کبھی مخل نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

جب میرے سامنے ایک سے زیادہ راستے ہوں اور ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو) تو اس باب میں میرے لئے خدا بھی فیصلہ یا انتخاب نہیں کرسکتا۔ (اس نے مجھے اس معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا ہے)۔

(خطبات انگریزی، صفحہ ۹۵)

جب میں زندگی کے کسی دوراہے پر کھڑا ہوں تو خدا کا قانونِ مکافات اس کا انتظار کرتا ہے کہ میں کونسا راستہ اختیار کرتا ہوں میں جس راہ پر چل پڑوں اس راستہ سے متعلق قانون میرے پیچھے لگ جاتا ہے اور میرے عمل کا نتیجہ مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے۔

تقدیر کے معنی

بالفاظِ دیگر انسانی دنیا میں سررشتۂ اختیار یا آغازِ کار (INITIATIVE) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن میں ہے۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵) "جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا"۔ دوسری جگہ ہے۔ یُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (۵۱/۹) "اس (صحیح راستے) سے اس کو پھیرا جاتا ہے جو خود اس سے پھر جاتا ہے"۔ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (۲/۲۸۴) "جو شخص تباہی سے محفوظ رہنا چاہتا ہے اُسے خدا کا قانون تباہی سے محفوظ کر دیتا ہے اور جو تباہ ہونا چاہتا ہے اسے تباہ کر دیتا ہے"۔ جو شخص جیسا اپنے لئے چاہتا ہے ویسا ہی خدا کا قانون اس کے لئے کر دیتا ہے۔ جو جیسا بن جاتا ہے اس کے مطابق اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

حرفے بار یکش بہ رمزے مضمر است ۔۔۔ تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو نذرِ ہوا سازد ترا ۔۔۔ سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی افگندگی تقدیرِ تست ۔۔۔ قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

جب کیفیت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ اگر ہم ایسے حالات میں گھر گئے ہیں جو ہمارے لئے ناساعد ہیں تو اُس میں رونے کی کوئی بات نہیں ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لیں اور حالات کو سازگار بنالیں تو اس سے خدا کا دوسرا قانون ہم پر منطبق ہو جائے گا۔ ہماری تقدیر بدل جائے گی۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر ۔۔۔ خواہ از حق حکم تقدیرے دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست ۔۔۔ زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہا است

سوال یہ ہے کہ یہ قوانین، یہ تقدیرات انسان کو ملیں گے کہاں سے؟ قرآن نے کہا ہے کہ وہ وحی کے ذریعے ملیں گے۔ چنانچہ وحی کو "اَمْرٌ مُّنَزَّلٌ مِّنَ اللّٰهِ" کہا گیا ہے۔ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَیْكُمْ (۶۵/۵) "یہ اللہ کا اُمر ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کر دیا ہے"۔ یعنی وہی امر جو گوشۂ اوّل میں اللہ کے اختیارِ مطلق کی حیثیت سے کارفرما تھا پھر وہ گوشۂ دوم میں مختلف

اشیائے کائنات کی اٹل تقدیرات کی حیثیت سے نافذ ہوگیا۔ (اور جس کا علم انسانی عقل و بصیرت اور تجربہ و مشاہدہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے) تیسرے گوشے میں وہی امرِ وحیٔ خداوندی کی حیثیت سے قرآن میں محفوظ کر کے دے دیا گیا۔ ایک ہی امر ہے جو کہیں (گوشۂ اوّل) میں مشیت کہلاتا ہے۔ کہیں (گوشۂ دوم میں) اشیائے کائنات کی تقدیرات بن جاتا ہے۔ اور کہیں (گوشۂ سوم میں) احکامِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

خدا کا قرآنی تصوّر

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآن نے خدا کا جو تصوّر دیا ہے وہ خدا کے اس تصوّر سے یکسر مختلف ہے جسے ذہنِ انسانی نے تراشا تھا۔ اور جسے مختلف مذاہب نے (خدا کی طرف سے دی ہوئی ہدایت کو پسِ پشت ڈال کر) اپنا لیا تھا۔ اس تصوّر کی رُو سے خدا (معاذ اللہ) ایک آمرِ مطلق (ڈکٹیٹر) کی طرح جو جی میں آئے کرتا تھا اور انسان اُس کے سامنے مجبور تھا۔ خدا کا جو تصوّر قرآن نے دیا ہے اس کی رُو سے کائنات میں خدا کا قانون کارفرما ہے۔ اور اس قانون میں وہ کبھی استثنا نہیں کرتا۔ نہ ہی اس میں تغیر و تبدل کرتا ہے۔ اس نے ہر عمل کا ایک نتیجہ مقرر کر دیا ہے اور اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ وہ عمل متعیّنہ نتیجہ پیدا کر کے رہے۔

"قانون کے مطابق نظم و نسق چلانے والا خدا"۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ تصوّر۔ اس تصوّر کے مطابق آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والی قوم خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا میں کس قدر قانون کی پابند ہوگی۔ خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی کو "سائنس" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کی اسٹیج سے قرآن کی آواز منفرد آواز تھی جس نے یہ بتایا کہ کائنات کا عظیم کارخانہ لگے بندھے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس طرح اس نے دنیا کو سائنٹیفک تحقیقات کی طرف متوجہ کیا۔ اوسپنسکی نے کہا تھا کہ

> جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہوتے ہیں۔
>
> (TERTIUM ORGANUM)

قرآن کا دیا ہوا مذہب (الدّین) وہ ہے جو سائنس کی تکذیب نہیں کرتا بلکہ اس پر بڑی شدت سے زور دیتا ہے۔ یہ اس کی صداقت کی بیّن دلیل ہے۔ باقی رہا سائنس کا مذہب کی تکذیب کرنا۔ سو کائنات کے متعلق جو کچھ قرآن نے کہا ہے، سائنس کی اس وقت تک کی تحقیقات نے اس کی تائید ہی کی ہے، تکذیب نہیں کی۔ ڈاکٹر (OTTO) نے کہا ہے کہ

> جب تک کوئی مذہب عقل و بصیرت کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے وہ تعصب اور توہم پرستانہ باطنیت کی سطح پر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی وہ مذہب ہے جو انسانیت کا مذہب بن سکنے کے قابل ہے۔
>
> (THE IDEA OF THE HOL.)

اس معیار پر وہی مذہب پورا اُتر سکتا ہے جس میں خدا کا تصوّر "قانون کے مطابق حکومت کرنے والے" کا تصور ہو اور یہ تصوّر قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا.

یہ تو رہا کائنات میں قانون کی کارفرمائی کا تصوّر. جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے، جو قوم ایسے خدا پر ایمان رکھے جو ہر فیصلہ قانون کے مطابق کرتا ہو اس کے ہاں جس قدر قانون کا احترام اور عدل و انصاف کی پابندگی ہو گی اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں.

یہ ہے خدا کے متعلق اس تصوّر کا عملی نتیجہ جسے قرآن پیش کرتا ہے. یعنی خارجی کائنات میں سائنٹیفک تحقیقات اور مادی ترقی. اور انسانوں کی دنیا میں قانون کا احترام اور عدل و انصاف کی کارفرمائی.

"الدّین" اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس کی بنیاد خدا کے اس تصوّر پر ہو.

QUOTED IN "FOREIGN AFFAIRS, JULY 1952.

QUOTED BY "STEBBING" IN "IDEALS AND ILLUSION, P - 14

باب ششم

مکافاتِ عمل

سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کا سارا تصوّر اس محور کے گرد گردش کرتا ہے کہ انسان کا ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی) نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اور یہ نتائج قوانینِ خداوندی کے مطابق مرتّب ہوتے ہیں یعنی جس کام کے متعلق قانونِ خداوندی نے بتا دیا ہے کہ اس کا یہ نتیجہ ہوگا' اس کام کا وہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں کبھی فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً جو شخص سنکھیا کھاتا ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ خدا نے اپنے قانونِ طبیعی کے مطابق سنکھیا کو ہلاکت انگیز بنایا ہے۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ سنکھیا کھائیں اور آپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہو۔ یا آپ کے لئے وہ ممدِ حیات بن جائے[1]۔ عمل اور اس کے نتیجے کا جو نظام' طبیعی دنیا (PHYSICAL WORLD)[2] میں جاری و ساری ہے اُسی قسم کا نظام خود انسانی دنیا کے لئے بھی مقرّر ہے۔ اس قانون کو جس کی رُو سے انسان کا ہر عمل اور ارادہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے' خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

قانونِ مکافات کیا ہے؟

انسانی زندگی میں قانونِ مکافات ایسی بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے بغیر دنیا کا نظم و نسق چل نہیں سکتا۔ ایک غیر مہذّب وحشی معاشرہ میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون (یا لاقانونیت) کارفرما ہوتا ہے۔ اور مہذّب معاشرہ میں اس کا فیصلہ قانون کی رُو سے ہوتا ہے کہ بھینس کس کی ہے۔ اور جو شخص اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرتا ہے اسے اس کی سزا ملتی ہے۔

---

[1] بعض لوگ بہم مشق اور ممارست سے سنکھیا کھانے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ انہیں اس مقدار تک سنکھیا فوراً ہلاک نہیں کرتا۔ (ان کی ہلاکت بتدریج ہوتی ہے) لیکن اگر وہ اس مقدار سے زیادہ سنکھیا کھالیں تو وہ بھی فوراً ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر جس مقدار میں سنکھیا دیتے ہیں وہ مفید نتیجہ پیدا کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ مقدار مہلک ہوتی ہے۔

لیکن انسانی نظم و نسق کے تحت قانونِ مکافات میں بہت سے رخنے رہ جاتے ہیں. مثلاً

انسانی نظم و نسق میں قانونِ مکافات

(i) ایک شخص چوری کرتا ہے لیکن اس انداز سے کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے. وہ اپنے جرم کی سزا نہیں پا سکتا　یا

(ii) اگر وہ پکڑا جائے لیکن وہ پولیس کو اپنے ساتھ ملا لے. یا عدالت تک "رسائی" حاصل کرلے تو اس صورت میں بھی وہ سزا سے بچ سکتا ہے.　یا

(iii) اربابِ حکومت یا مجالس قانون ساز قوانین ایسے بنالیں جو کسی خاص طبقہ کی بدعنوانیوں کو جرم ہی قرار نہ دیں۔ جیسے نظامِ سرمایہ داری میں (جب مجلسِ قانون ساز میں اس طبقہ کے نمایندوں کی اکثریت ہو۔ اور ایسے نظام میں بالعموم یہی ہوتا ہے)۔ قوانین اس قسم کے وضع کرلئے جاتے ہیں جن کی رُو سے محنت کشوں کو ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دینا کوئی جرم قرار نہیں دیا جاتا　یا

(iv) ایک قوم ایسے قوانین مرتب کرے جن کی رُو سے دوسری قوموں کو لوٹنا کھسوٹنا جرم قرار نہ پا سکے. اس دَور میں، جب انسانوں کی تقسیم نیشنلزم کی رُو سے ہوتی ہے دنیا کی ہر قوم اس قسم کے قوانین مرتب کرلیتی ہے جن کی رُو سے ان کی اپنی قوم کی فلاح وبہبود "حسنِ عمل" قرار پائے، خواہ اس کے لئے دوسری قوموں سے کیا کچھ نہ کرنا پڑے. عصرِ حاضر کی "میکیاولی سیاست" کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے. اس سیاست کی رُو سے سب سے بڑا انسان وہ محبِّ وطن (PATRIOT) ہوتا ہے جو اپنی قوم کے مفاد کے تحفظ کے لئے دوسری اقوام کی کھال تک اتار لائے. چنانچہ اس باب میں اٹلی کا مدبر (CAVOUR) کہا کرتا تھا کہ

> اگر وہی کچھ ہم اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

اور والپول کا عقیدہ تھا کہ

> نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو نہیں بچا سکتے. اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

انسانی نظم و نسق کے ماتحت قانونِ مکافات کی یہ حیثیت رہ جاتی ہے. لیکن خدائی نظم و نسق میں قانونِ مکافات میں اس قسم

خُدائی نظم و نسق میں قانونِ مکافات

کا کوئی سقم یا رخنہ نہیں رہتا. طبیعی دنیا میں آپ دیکھئے. ایک شخص کمرے کی تنہائی میں سنکھیا کھا لیتا ہے. اُسے نہ کسی نے دیکھا. نہ پولیس نے پکڑا. نہ عدالت نے سزا دی. لیکن سنکھیا کا اثر اس پر خود بخود ہوگیا. اُس کا یہ عمل اپنی نتیجہ خیزی کے لئے کسی

گواہ، محتسب یا عدالت کا محتاج نہیں۔ یہ عمل خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے از خود نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ کائنات کا یہ محیر العقول سلسلہ اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر عمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب ہوتا چلا جائے۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳/۳۱)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اور اس سے مقصد یہ ہے کہ جو لوگ غلط روشِ زندگی اختیار کریں انہیں ان کے کاموں کا بدلہ ملے۔ اور جو لوگ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کریں انہیں اس کا خوشگوار بدلہ ملے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۱/۷)

اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مختلف ادوار میں تکمیل تک پہنچایا اور زندگی کے سرچشمے پر پورا پورا کنٹرول اسی کا ہے۔

یہ سب اس لئے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ تم میں سے کون حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔

اس مقصد کے لئے ساری کائنات میں "خدا کے لشکر" (۴۸/۴) موجود ہیں جو ایک ایک فرد کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں۔ سورۂ رعد میں ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۹-۱۱)

خدا جانتا ہے جو کچھ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے۔ اس کا قانونِ مکافات بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اور ایسے بلند مقام پر متمکن کہ اس تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا جو اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکے۔ اس قانون کی نگاہ اس قدر باریک بین ہے کہ تم میں کوئی شخص کسی بات کو چھپائے یا ظاہر کرے۔ کوئی شخص دن کی روشنی میں چلے پھرے یا رات کی تاریکیوں میں کچھ کرے۔ اس کے نزدیک سب یکساں ہے۔ ہر شخص کے آگے پیچھے ایسی نگران قوتیں تعینات کر دی گئی ہیں جو اس کے ہر عمل کا پیچھا کر کے اسے اس کے نتیجہ تک پہنچا

دیتی ہیں اور اس طرح اس کا ہر کام خدا کی تدبیر کے مطابق محفوظ ہوجاتا ہے۔

جو کچھ افراد کے ساتھ ہوتا ہے وہی کچھ اقوام کے ساتھ بیتتا ہے. جب تک کوئی قوم اپنے اعمال سے خود اپنے اندر تبدیلیاں پیدا نہیں کر لیتی جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہوتا۔

یوں سمجھو کہ

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ (۹-۱۰/۸۲)

تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسے معزز اور محترم منشی متعین ہیں جو تمہارے ایک ایک کام کو ضبطِ تحریر میں لاتے چلے جاتے ہیں.

ظاہراً اعمال ہی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک بھی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰/۱۶)

ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں کہ اس کے دل میں کس قسم کے خیالات گزرتے ہیں. ہم اس سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اس ریکارڈ کا نام وہ اعمال نامہ ہے جو ہر ایک کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ○ (۱۳-۱۴/۱۷)

اور ہم نے ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن کے ساتھ چپکا رکھا ہے۔ یہ لپٹی ہوئی کتاب ظہورِ نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجاتی ہے. اور اس شخص سے کہا جاتا ہے تو اپنی کتاب آپ پڑھ۔ آج خود تیری اپنی ذات تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قانونِ مکافات کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے انسانی نظام میں تو یہ ہوسکتا کہ انسان اپنے جرائم پر کسی نہ کسی طریق سے پردہ ڈال لے لیکن خدا کے قانون کی رُو سے ان جرائم کے جو

ہر عمل اثر مرتب کرتا ہے

اثرات اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں جب ان کے ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو وہ کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکیں گے. بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ○ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ○ (۱۴-۱۵/۷۵) اس وقت عقل کی فریب کاریوں کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں اور نگاہیں ایسی

تیز ہو جاتی ہیں کہ بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ (۵۰/۲۲)

ان تصریحات سے جہاں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے انسان کا کوئی عمل نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہاں یہ چیز بھی واضح ہو گئی کہ اعمال کی جزا یا سزا کہیں خارج سے نہیں ملتی۔ یہ ان اعمال کا فطری اور لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آپ

اعمال کی جزا اور سزا

کسی مزدور سے کہتے ہیں کہ وہ آپ کی چٹھی فلاں شخص کو دے آئے جس کا مکان تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے لئے آپ اُسے آٹھ آنے کے پیسے دیتے ہیں۔ اس مزدور کو نہ اُس چٹھی سے کوئی واسطہ ہے، نہ اس سے کوئی تعلق کہ آپ نے وہ چٹھی اس شخص کے پاس کیوں بھیجی ہے۔ اُسے اپنی مزدوری سے واسطہ ہے۔ اس کے کام کا یہ معاوضہ ایسا ہے جو اسے خارج سے ملتا ہے۔ ان معاملات میں عمل اور اس کے نتیجے میں کوئی اندرونی ربط یا تعلق نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس آپ صبح کی سیر میں تین میل کا چکر لگا کر آتے ہیں۔ اس سے آپ کی صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ یہ اُس عمل (یعنی تین میل کی سیر) کا فطری نتیجہ ہے۔ بالفاظِ دیگر اس عمل کا نتیجہ آپ کو کہیں خارج سے نہیں ملتا۔ یہ نتیجہ اس عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے۔

دوسری طرف یہ مثال لیجئے کہ ایک طالب علم اسکول سے غیر حاضر ہو جاتا ہے۔ اور ماسٹر اسے جرمانہ کر دیتا ہے۔ اسکول کی غیر حاضری سے اس بچے کی تعلیمی استعداد پر جو اثر پڑا ہے اس جرمانے کا اس سے کوئی تعلق اور ربط نہیں۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بچہ جرمانے کی رقم اپنے باپ سے لے کر ادا کرے۔ اس صورت میں وہ سزا بچہ کو نہیں، بلکہ بچے کے باپ کو ملی۔ لیکن اگر ایک بچہ آگ میں ہاتھ ڈال لیتا ہے تو اس سے اسے جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس کے اس عمل کا براہِ راست، فطری اور لازمی نتیجہ ہے۔ اس کی یہ تکلیف اس کے باپ (یا کسی اور) کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی۔ اس کے عمل کی یہ سزا خود اس کے عمل کے اندر پوشیدہ تھی اور خود اسے ہی بھگتنی پڑتی ہے۔

تیسری مثال یہ سمجھئے کہ ایک شخص اپنی محنت و مزدوری کر کے کچھ کما کر لاتا ہے۔ اور اس کمائی سے گھی خرید کر کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ گھی سے اس کے جسم میں طاقت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے برعکس ایک شخص گھی چرا کر کھاتا ہے۔ اس گھی کا اس کے جسم پر بعینہٖ وہی اثر ہوگا جو اثر اس شخص کے جسم پر ہوتا ہے جو اپنی محنت کی کمائی سے گھی خرید کر کھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک طبیعی قوانین کا تعلق ہے ان پر اخلاقیات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسانیت کی میزان میں بھی حلال کی کمائی سے خریدے ہوئے اور چوری کے گھی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس عمل کا اثر انسان کی ذات پر پڑتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اس قانونِ مکافات کا دائرہ شروع ہوتا ہے جس کا تعلق دنیائے انسانیت سے ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(i) انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔

(ii) مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

(iii) ان اقدار کی خلاف ورزی کرنے سے انسانی ذات تباہ ہو جاتی ہے۔

(iv) یہ نتائج انسانی اعمال کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں یعنی ان کا لازمی اور فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔

(v) یہ نتائج کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس باب میں قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ

اعمال کے نتائج کوئی اور بھگت نہیں سکتا

مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱)

جس نے کوئی ایسا کام کیا جس سے اس کی ذات مضمحل ہوتی ہو تو اس کا اثر خود اس کی اپنی ذات پر پڑے گا۔

دوسری جگہ ہے۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷)

اگر تم نے حسن کارانہ انداز سے (مستقل اقدار کے مطابق) زندگی بسر کی تو اس سے تمہاری اپنی ذات میں حسن پیدا ہو جائے گا۔ اور اگر تم نے ناہمواریاں پیدا کرنے والی روش اختیار کی تو اس کا نقصان بھی تمہاری ذات کو ہوگا۔

بالفاظِ دیگر:۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۴۶)

جو شخص صلاحیت بخش کام کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا جو اس کے خلاف چلے گا اس کا وبال اس کی ذات پر پڑے گا۔

یہی وجہ تھی کہ زبانِ وحی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (۶/۱۰۴)

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے واضح حقائق و دلائل آگئے۔ جو کوئی ان کی روشنی میں دیکھ کر راہ چلے گا تو اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا۔ جو آنکھیں بند کرلے گا اس کا نقصان اسی کو ہوگا میں تم پر نگران مقرر نہیں کیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ دوسرے باب میں بتایا جا چکا ہے) انسانی ذات (PERSONALITY) کی انفرادیت اور یکتائی (UNIQUENESS) کے معنی یہی ہیں کہ جو اثرات اس پر مرتب ہوں اس میں کوئی دوسرا شریک و سہیم نہ ہو۔ ہر شخص کی ذات اپنی جگہ منفرد ہے۔ یہ اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ہے جس سے اس کا وجود قائم ہے۔ اس لئے اس کے اثرات کسی کی طرف منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ (ذات کے اثرات و نقوش تو ایک طرف۔ کوئی کسی دوسرے کے سر درد کو بھی اپنی طرف منتقل نہیں کر سکتا)۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۵)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

اور ایسا محکم اور اٹل قانون ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ ایک بار پھر اس مثال کو سامنے لائیے جسے ابھی ابھی پیش کیا گیا تھا۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے جس سے آپ کو سخت درد ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس دس ہمدرد دوست بھی ایسے ہوں جو آپ کی خاطر اپنی جان دینے تک سے دریغ نہ کریں، تو بھی ان میں سے کوئی دوست آپ کا درد بٹا نہیں سکتا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ہاتھ آپ کا جلے اور درد آپ کے دوست کو ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ ہزاروں روپے رشوت دے کر اپنے درد کو دور کرا لیں۔ یا بڑی سے بڑی سفارش "آپ کے حق میں فیصلہ کرا دے" اور آپ کا درد دور ہو جائے۔ آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالنے سے قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس کی سزا آپ کو بھگتنی پڑے گی۔ یہی ہے وہ قانونِ مکافات جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)

تم اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو۔ جب صورت یہ ہو گی کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی فدیہ دے کر چھٹکارا حاصل کر سکے گا۔ نہ ہی (مجرم کی) کوئی مدد کر سکے گا۔ ــــ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

اس وقت ہم نے قانونِ مکافات کے اس گوشے کے متعلق گفتگو کی ہے جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی (ذات) سے ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ایک طرف فرد کی ذات کی نشوونما اجتماعی زندگی کے اندر ہوتی ہے اور دوسری طرف افراد ایسا معاشرہ تشکیل کرتے ہیں جو نوعِ انسان کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جانے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ لہٰذا "قانونِ مکافات"

قوموں کے اعمال

افراد کی طرح اقوام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوئے ہے۔ جو قومیں مستقل اقدار کے احترام و تنفیذ کے لئے سرگرمِ عمل رہتی ہیں انہیں زندگی کی خوشگواریاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں۔ جو ان کے خلاف چلتی ہیں وہ ذلیل و رسوا اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں (تفصیل اس اجمال کی دوسرے مقام میں ملے گی) ایک فرد کی ذات پر مرتسم شدہ نقوش و اثرات دوسروں کی نظروں میں محسوس و مرئی نہیں ہوتے۔ (اگرچہ اس کی سیرت و کردار اس کے آئینہ دار ہو جاتے ہیں) لیکن قوموں کی روشِ زندگی کے نتائج محسوس و مرئی طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ (جیسا کہ باب چہارم۔ عقل و ایمان ـــ میں بتایا جا چکا ہے) قرآن اپنے تجویز کردہ پروگرام کی صداقت کی پہچان کے لئے طریقہ یہ تجویز کرتا ہے کہ ایک جماعت اس پروگرام کو عملاً متشکل کرے اور اس کے بعد دیکھ لے کہ اس کے نتائج وہی برآمد ہوئے ہیں جن کا وعدہ قرآن کرتا ہے یا وہ اس کے دعوے کی تکذیب کرتے ہیں؟ وہ نبی اکرمؐ سے کہتا ہے کہ

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ (۶/۱۳۵)

ان سے کہہ دو کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق اپنی جگہ کام کرو۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق اپنی جگہ کام کرتا ہوں۔ تمہیں (نتائج سے) خود معلوم ہو جائے گا کہ آخر الامر کامیابی کسے نصیب ہوتی ہے۔

استنتاجی طریق

قانونِ مکافات کو اس کے نتائج سے پہچاننے کا طریق (جسے (PRAGMATIC TEST) کہتے ہیں) سب سے بہتر ہے۔ اس سے زیادہ حتمی اور یقینی طریق اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ لیکن اس میں وہ دشواری پیش آجاتی ہے جس کے متعلق باب اول ـ دین کی بنیاد ـــ میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ یعنی اس قانون کو اگر کائناتی رفتار پر چھوڑ دیا جائے تو اعمال اور ان کے نتائج کے ظہور کے وقت میں کافی لمبا عرصہ لگ جاتا ہے جو ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ کا ہو سکتا ہے۔

پھر اس عرصہ کو کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسانی جماعت، قانونِ خداوندی کی رفیق و معاون بن جائے۔ اس صورت میں وہ نتائج، انسانی حساب و شمار سے مرتب ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

جہاں تک فرد کی ذات کا تعلق ہے عمل اور اس کے نتیجہ کے ظہور کے درمیان کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ انسانی زندگی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی اس کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اس لئے ان اثرات کی نمود اگر یہاں نہیں ہوتی تو موت کے بعد ہو جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے سامنے بعض ایسے تصورات آتے ہیں جن کا مذہب کی دنیا میں عام طور پر چرچا ہوتا ہے۔ یعنی نجات، ثواب، مغفرت، توبہ، جنت، جہنم وغیرہ۔

آئندہ باب میں ان کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔

رحم کا تصوّر اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات خالص عدل کے اصول پر کارفرما ہوتا ہے جس میں کسی قسم کی رو رعایت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ اس میں "رحم" (یا معافی) کی بھی گنجائش ہے یا نہیں۔ اس کی گنجائش ضرور ہے لیکن اس "رحم" کا تصوّر مختلف ہے۔ "رحم" کا ایک تصوّر تو یہ ہے کہ قانون کی رُو سے مجرم سزا کا مستحق قرار پاچکا ہے لیکن وہ روتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ حاکم کو اس کی حالت پر رحم آجاتا ہے اور وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ یہ "رحم" کا جذباتی تصوّر ہے جس کا خدا کے قانونِ مکافات سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کا دوسرا (اور صحیح) تصوّر یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ جل جانے سے آپ کو شدّت کا درد ہوتا ہے۔ جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ جلاتی ہے اور جلنے سے درد پیدا ہوتا ہے' اسی خدا نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کی ہیں جن سے درد کو آرام آجاتا ہے۔ اگر آپ' پہلے جرم (آگ میں ہاتھ ڈالنے) کے بعد' خدا کے اس دوسرے قانون کی طرف رجوع کریں گے اور جو دوائیاں اس نے پیدا کی ہیں ان کا استعمال کریں گے تو آپ کو جرم کی سزا سے "معافی" مل جائے گی۔ یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے "خدا کے رحم" کا تصوّر۔ یعنی خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی کے لئے خدا ہی کے دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنا۔ جس طرح خدا کا پہلا قانون عالمگیر UNIVERSAL ہے — انفرادی نہیں — اسی طرح اس کا یہ دوسرا قانون بھی عالمگیر ہے۔ کسی قانون کی خلاف ورزی کے بعد' خدا کے اس قانون کی طرف رجوع کرنا جس سے اس نقصان کی تلافی ہوجائے "توبہ" کہلاتا ہے۔ اور اس (دوسرے) قانون کی اطاعت سے پہلے قانون کی خلاف ورزی کی پیدا کردہ تباہی سے حفاظت مل جانا' مغفرت ہے۔ (مغفرت کے معنی ہی حفاظت کے ہیں) خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے "جاؤ. تمہیں معاف کیا" کا تصوّر غلط ہے۔

خدا کا یہ "توبہ اور مغفرت" کا قانون جس طرح افراد کے حق میں کارفرما رہتا ہے اسی طرح اقوام پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم سے خدا کے کسی قانون کی خلاف ورزی ہوجاتی ہے تو اس کے تباہ کن نتیجہ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وہ خدا کے اُس قانون کی اطاعت (جس کے نتائج تعمیری اور منفعت بخش ہوں) اور شدّومد سے کرے۔ اس قانون کے تعمیری نتائج' سابقہ لغزش کے تخریبی نتائج سے حفاظت (مغفرت) کا سامان بہم پہنچا دیں گے۔

اس مقام انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی آئندہ باب میں ملے گی۔

1. QUOTED IN "FOREIGN AFFAIRS", JULY 1952

2. QUOTED BY "STEBBING" IN "IDEALS AND ILLUSIONS" , P - 14

بابِ ہفتم

نجات

دنیا میں آپ کسی سے پوچھئے کہ وہ مذہبی احکام و رسوم کی بجا آوری میں اس قدر مشقتیں کیوں اٹھاتا اور اس قدر تکالیف کیوں برداشت کرتا ہے؟ وہ جاڑے کی راتوں میں پچھلے پہر اُٹھ کر یخ بستہ پانی میں غسل کر کے ننگے فرش پر بھگتی کے لئے کیوں بیٹھتا ہے؟ وہ گرمی کے زمانے میں پہاڑ جیسے لمبے دنوں میں بھوک اور پیاس کی مشقت کیوں برداشت کرتا ہے؟ وہ اپنی مفلسی اور ناداری کے باوجود، اپنی کمائی میں سے خیرات کر کے اپنے آپ کو تنگی میں کیوں رکھتا ہے۔ وہ انتہائی بے سر و سامانی کے عالم میں کسی خاص مقدس مقام کی زیارت (یا یاترا) کے لئے سینکڑوں میل کا سفر کیوں کرتا ہے؟ ان تمام جانکاہ مشقتوں اور صبر آزما مرحلوں سے بالآخر مقصود کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ مذہب کے ہر گوشے سے (یعنی ہر مذہب کے پیرو کی طرف سے) ان سوالات کا ایک ہی جواب ملے گا۔ اور وہ یہ

مقصود نجات ہے

کہ ہم یہ کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ ہماری نجات ہو جائے۔ ہمیں مکتی مل جائے۔ ہماری (SALUATION) ہو جائے۔ زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ الفاظ مختلف ہیں۔ لیکن ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی انسان مذہبی احکام کی فرماں پذیری میں اس قدر مشقتیں اس لئے اٹھاتا ہے کہ اس کی نجات ہو جائے۔

نجات کس سے؟

ہندو شاستر (شریعت) کی رُو سے ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش کے وقت اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ عمر بھر ان گناہوں کی آلودگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اس آلودگی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مر جاتا ہے تو پھر اپنی آلودگیوں کو لئے ہوئے دوسرا جنم لیتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسے آواگون (تناسخ) کا چکر کہتے ہیں۔ زندگی کا

نجات کا مفہوم

مقصد منتہیٰ یہ ہے کہ انسان آواگون کے اس چکر سے مکتی (نجات) حاصل کرلے۔ اس کے لئے مذہبی احکام و رسوم کی جانکاہ مشقتیں اٹھائی جاتی ہیں۔

(ہندو) ویدانت (یعنی طریقت یا معرفت) کی رُو سے انسان کی آتما (روح) ' پرماتما (خدا) کی روح کا جزو ہے جو اپنے کُل سے جُدا ہو کر پراکرتی (مادہ) کی کثافتوں میں جکڑے ہوئے 'مصروفِ آہ و فغاں ہے'۔ زندگی کا مقصود آتما کو مادہ کی ان بندھنوں سے نجات دلانا ہے۔ یہ مقصد یوگ کی صبر آزما اور جانگسل ریاضتوں کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

بدھ مت کی رُو سے انسان کی ہر آرزو ایک نئی تکلیف کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ انسان کے دل کو آرزوؤں کے فریب سے نجات دلانا مقصودِ حیات ہے۔ اس سے اُسے نروان حاصل ہوجاتا ہے جس کے معنی کلّی فنا کے ہیں۔

عیسائیوں کے عقیدہ کی رُو سے ہر انسانی بچہ اپنے اوّلین ماں باپ (آدم وحوّا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پشت پر لاد کر پیدا ہوتا ہے۔ اُسے اس بوجھ سے نجات دلانا مذہب کا مقصود ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی "صلیب اور کفارہ" پر ایمان لانے سے حاصل ہوسکتی ہے۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ بنی اسرائیل کا ہر بچہ ختنے کے بعد جنتی ہوجاتا ہے۔ لیکن کسی زمانے میں اس قوم کے آباؤ اجداد سے کچھ گناہ سرزد ہوگئے تھے۔ ان کی پاداش میں یہ قوم کچھ دنوں کے لئے جہنم میں بھیج دی جائے گی۔ اس جہنم کے عذاب سے چھوٹ جانے کا نام نجات ہے۔

نجات کے اس تصور کو سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ اس کی اصل و بنیاد میں ایک عنصر ہر جگہ بطور قدرِ مشترک موجود ہے وہ یہ کہ انسان اچھا بھلا کہیں تھا۔ اسے بعض وجوہات کی بنا پر دنیا کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا۔ جب وہ اس جیل خانے میں چکّی پیستے پیستے اپنے آپ کو "شریف انسان" ثابت کرے گا تو اسے جیل خانے سے نکال کر پھر اس کے اصلی مقام میں بھیج دیا جائے گا۔ یہی نجات ہے۔ زیادہ محسوس مثال میں یوں سمجھئے کہ ایک شخص صبح کو اچھا بھلا اٹھا (اُس وقت اس کا ٹمپریچر ۹۸ درجہ تھا) دس بجے کے قریب اُسے بُخار ہوا۔ دن بھر بخار رہا۔ ڈاکٹر نے دوائی دی۔ شام کو اسے نجات مل گئی۔ اس کا درجہ حرارت پھر ۹۸ ہوگیا۔ یعنی وہ پھر ویسا ہی ہوگیا جیسا صبح کے وقت اٹھا تھا۔ اس دن بھر کی محنت اور مشقت اور تگ و دو سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ پھر "ویسے کا ویسا" ہوگیا۔ یہی ہے وہ تصور (یعنی انسان کا (AS YOU WERE) ہوجانا) جو نجات کی اساس[1]

---

[1] رومی کا یہ پیغام کہ بشنو از نے چوں حکایت می کند از جدائیہا شکایت می کند
اسی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے۔

بنیاد ہے۔ کپڑا سفید تھا۔ گرد و غبار سے میلا ہو گیا۔ اسے دھوبی کی بھٹی چڑھایا گیا۔ میل کٹ گیا۔ کپڑا پھر ویسے کا ویسا سفید ہو گیا۔ یہ ہے نجات کا مفہوم۔

آپ سوچئے کہ کیا یہ بات عقل و بصیرت کو اپیل کرتی ہے کہ یہ عظیم الشان کارگہِ کائنات — انسانی پیدائش کا محیّر العقول پروگرام — آسمانی رشد و ہدایت کا ایسا بلند و بالا سلسلہ محض اس لئے ظہور میں لایا گیا ہو کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر ویسا ہی بن جائے۔ اس سے کوئی ترقی (PROGRESS) کوئی مفاز (ACHIEVEMENT) کوئی تعمیری مقصد (CONSTRUCTIVE PURPOSE) مقصود نہ ہو۔ ہر صاحبِ بصیرت پکار اٹھے گا کہ یہ بچّوں کا کھیل ہے جو خدائے حکیم و خبیر کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوۡنَ۔ قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کا منتہیٰ مکتی نہیں، دین سے مقصود "نجات" نہیں۔ انسان نہ اس دنیا کے جیل خانے میں پھنسا ہوا چکّی پیس رہا ہے۔ نہ اس سے نجات اس کی

قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود

تگ و دو کا مقصود ہے۔ نہ اس کی روح اپنی اصل سے جدا ہو کر مادہ کی کثافت میں ملوّث ہو گئی ہے۔ نہ یہ اپنی پشت پر کسی سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ نہ اپنے اوّلین ماں باپ کے جرائم کی پاداش میں یہاں بھیجا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر انسانی بچّہ ایک صاف اور سادہ لوح (CLEAN SLATE) لے کر دنیا میں آتا ہے۔ اسے کچھ امکانی صلاحیتیں (REALISEABLE POSSIBILITIES) دی جاتی ہیں جن کی نشوونما اس کا مقصودِ زندگی ہوتا ہے۔ آئندہ سطور میں آپ کو اس اجمال کی تفصیل ملے گی۔

یونانی حکماء کے نزدیک کائنات کی حرکت دَوری (CYCLIC) تھی۔ یعنی وہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں گردش کئے چلی جاتی تھی۔ اس مسلسل سفر میں اس کا کوئی قدم آگے نہیں بڑھتا تھا۔ آپ ذرا بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آجائے گی کہ ہندوؤں کا آواگون کا چکّر یا نجات کا عقیدہ کائنات کے متعلق اسی حرکتِ دَوری کے نظریہ کے نتائج ہیں۔ ہندو فلسفۂ زندگی، بیشتر یونانی فکر سے مستعار لیا گیا ہے۔ قرآن نے آکر اس تصوّر کو باطل قرار دیا اور کہا کہ زندگی ایک دائرے میں گردش نہیں کرتی بلکہ وہ سیدھی اور متوازن راہ پر جا رہی ہے۔ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (۱۱/۵۶) "ان سے کہہ دو کہ میرا نشوونما دینے والا ایک سیدھی اور توازن بدوش راہ پر جا رہا ہے"۔ یعنی خدا اپنے قانون کے مطابق کائنات کو سیدھی راہ پر لئے جا رہا ہے۔ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ (۴۲/۵۳) "یہ اُس خدا کی راہ ہے جس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے ساری کائنات سرگرمِ عمل ہے"۔ لہٰذا کائنات بھی ایک سیدھی اور

توازن بدوش راہ پر چل رہی ہے. سیدھی اور توازن بدوش ہی نہیں بلکہ بلندیوں کی طرف جانے والی. اس خدا کی راہ جو ذِی الْمَعَارِجِ (۷۰/۳) ہے یعنی بلندیوں کی طرف جانے والا "سیڑھیوں والا". لہٰذا کائنات سیدھی اور توازن بدوش راہ پر بھی چل رہی ہے اور اس کے ساتھ اوپر کو بھی اُٹھتے جا رہی ہے. یہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہی ہے. بالفاظِ دیگر، قرآن کی رو سے کائنات (PROGRESSIVE) اور (DYNAMIC) ہے جامد (STATIC) اور ایک ہی چکر میں گردش کرنے والی نہیں. یہی وہ راہ ہے جس پر چلنے کے لئے انسان کو تاکید کی جاتی ہے. چنانچہ سورۃ فاتحہ میں نوعِ انسانی کو دعا ہی یہ سکھائی گئی ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵) "ہمیں سیدھی اور متوازن راہ کی طرف راہ نمائی عطا کر دے". اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کی تگ و تاز سے مقصود کسی مصیبت سے نجات حاصل کر کے (AS YOU WERE) ہو جانا نہیں بلکہ شاہراہِ حیات میں آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے. اسے ارتقاء (EVOLUTION) کہتے ہیں.

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، قرآن کی رُو سے انسان

(i) کسی قسم کا کوئی بوجھ لادے دنیا میں نہیں آتا. وہ صاف اور سادہ لوح (CLEAN SLATE) لے کر آتا ہے.

(ii) اسے فطرت کی طرف سے بہت سی ممکنات (REALISEABLE POTENTIALITIES) ملی ہیں.

(iii) اس کی زندگی کا مقصود ان ممکنات کو مشہود بنانا. اپنی مضمر صلاحیتوں کو نمودار کرنا. اپنی ذات کی نشوونما کرنا. اور اس طرح اس زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کے قابل بن جانا ہے. زندگی کی ان ارتقائی منازل کے متعلق قرآن نے

زندگی کے ارتقائی منازل

کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) "تم طبقاً طبقاً، درجہ بدرجہ، زینہ بہ زینہ STAGE BY STAGE اوپر چڑھتے چلے جاؤ گے. لہٰذا زندگی کا مقصد کسی بندھن سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں. ارتقائی منازل طے کر کے بلند سے بلند تر ہوتے جانا ہے. اس کے لئے دین ایک عملی پروگرام دیتا ہے. ظاہر ہے کہ ہر پروگرام کے دو حصے ہوتے ہیں. ایک وہ نظریہ، وہ قانون، وہ فارمولا جو اس پروگرام کی بنیاد ہے اور دوسرے وہ طریقِ کار جس کے مطابق وہ پروگرام تکمیل تک پہنچ سکتا ہے. پروگرام کی کامیابی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ جس فارمولا پر وہ مبنی ہو، خود اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود ہو. اگر وہ فارمولا ہی غلط یا منفی نتائج پیدا کرنے کا حامل ہے تو اس پر متفرع پروگرام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا. اس کے بعد اس طریقِ کار میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ اس فارمولا کو پروان چڑھائے. دیکھئے! قرآن نے اس بنیاد اور اس پر اٹھی ہوئی عمارت کو چند الفاظ میں کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے. وہ کہتا ہے کہ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ. خوشگوار نظریۂ زندگی (جو وحی کی رو سے ملتا ہے)

اس میں اُبھرنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵/۱۰) "اور عملِ صالح اسے اوپر کو اٹھاتا ہے۔" قرآن اس مجرّد حقیقت کو کھیتی کی محسوس مثال سے سمجھاتا ہے۔ (یہ قرآن کا عام انداز ہے)۔ کھیتی میں بنیادی چیز وہ تخمِ طیّب ہے جس میں بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت موجود ہو۔ (یہ وہ آئیڈیالوجی ہے جسے قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں)۔ اس کے بعد وہ طریق کار ہے جس سے اس تخم کی نشوونما اس انداز سے ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت پر برگ و بار لاتا اور ثمردار ہوتا ہے۔ اگر وہ تخم (بیج) مٹی کے تودے کے نیچے دبا رہے تو اس سے کونپل تک بھی نہیں پھوٹتی۔ اس مثال کی رُو سے قرآن انسانی زندگی کے مقصود و منتہیٰ کے متعلق کہتا ہے کہ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا "جس نے اپنی ذات کی نشوونما کرلی اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی"۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ہ (۹-۱۰/۹۱) "لیکن جس نے اسے دبائے رکھا وہ تباہ و برباد ہوگیا"۔ لہٰذا (جیسا کہ سابقہ عنوان میں کہا جاچکا ہے) انسان کو اس کے اعمال کے بدلے میں خارج سے دی جانے والی جزا یا سزا کا سوال ہی نہیں۔ اعمال کی جزا اور سزا خود ان اعمال کے اندر پوشیدہ اور ان کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ انسانی ذات کی نشوونما اور بُرے کاموں کا نتیجہ اس میں ضعف و اضمحلال یا انتشار (DISINTEGRATION) ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے اظہار کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۷/۱۴۷) "ان کے اعمال خود اپنا بدلہ آپ بن کر ان کے سامنے آجاتے ہیں۔

ایمان اور اعمالِ صالح

انسانی ذات کی نشوونما یا یوں کہئے کہ انسانی معاشرہ میں مستقل اقدار کو نافذ العمل کرنے کے راستے میں تخریبی قوتیں اور مفاد پرست عناصر روک بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان قوتوں کا مقابلہ ضروری ہے۔ اسی کو کشمکشِ حق و باطل کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سرکش عناصر کو راستے سے ہٹانے کے لئے قوت صَرف ہوگی۔ اب، اگر صورت یہ ہو کہ جمع شدہ قوت صَرف ہوتی رہے لیکن نئی قوت پیدا نہ ہو تو کچھ وقت کے بعد انسان میں تخریبی قوتوں کے مقابلہ کی تاب ہی نہیں رہے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ جو نظامِ عمل اس نے تجویز کیا ہے اس میں اس کی صلاحیت ہے کہ جس قدر قوت اس مقصد کے حصول میں صرف ہو وہ اسے واپس لے آئے۔ عربی زبان میں اسے "ثواب" کہتے ہیں۔ ثاب کے معنی ہیں لوٹ آنا۔ جتنا خرچ ہوا اتنا ہی واپس آجانا۔ استثاب' کا انگریزی میں ترجمہ (RESTORATION) ہوگا۔ لہٰذا قرآنی نظامِ عمل میں جس قدر توانائیاں حق کی مدافعت اور باطل کی شکست کے لئے صرف ہوتی ہیں وہ ساتھ ہی ساتھ (RESTORE) ہوتی رہتی ہیں۔

کشمکشِ حق و باطل

ثواب کے معنی

اب ایک اور مثال لیجئے۔ وبائی امراض (مثلاً انفلوئنزا وغیرہ) میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ اس کا فوراً شکار ہوجاتے ہیں اور بعض اس سے مامون رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جن لوگوں میں قوتِ مدافعت کی کمی ہوتی ہے وہ مرض

کے جراثیم سے بہت جلد مغلوب ہو جاتے ہیں. جن میں یہ قوت زیادہ ہوتی ہے تخریبی جراثیم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے.

ایسے وبائی امراض کی صورت میں ڈاکٹر کیا کرتا ہے؟ وہ ایسی تدابیر تجویز کرتا ہے جن سے لوگوں کی قوتِ مدافعت بڑھ جائے اور وہ تخریبی جراثیم کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے. اسی طرح جب کوئی شخص ان جراثیم سے مغلوب (یعنی بیمار) ہو جاتا ہے تو

مغفرت کے معنی

ڈاکٹر اس کی قوتِ مدافعت کو بڑھاتا ہے. یہ قوت اس مریض کی تخریبی عناصر سے حفاظت کرتی ہے. اس عمل کو قرآن کی اصطلاح میں "مغفرت" کہتے ہیں. مغفرت کے معنی حفاظت کے ہیں. مِغفَر اس خُود (HELMET) کو کہتے ہیں جسے سپاہی سر کی حفاظت کے لئے میدانِ جنگ میں پہنتے ہیں.

اس سلسلہ میں ایک اور مثال سامنے لائیے. آپ کسی گاؤں کی طرف جا رہے ہیں. راستے میں ایک مقام پر ایک دوراہا آتا ہے جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ جاتا ہے. میل بھر چلنے کے بعد آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں. ظاہر ہے کہ آپ کی جس قدر توانائی اور وقت اس میل بھر کی مسافت طے کرنے میں صرف ہوا وہ سب رائیگاں گیا. قرآن سفرِ حیات میں انہی غلط رَو مسافروں کے متعلق کہتا ہے: فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۱۸/۱۰۵) "یہ وہ ہیں جن کے کام بے نتیجہ رہے. رائیگاں گئے".

توبہ کے معنی

اپنی غلطی معلوم ہو جانے کے بعد آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ پھر اُسی دوراہے پر واپس آجاتے ہیں جہاں سے آپ کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا. عربی زبان میں اس قسم کی واپسی کو **توبہ** کہتے ہیں.

لیکن ظاہر ہے کہ میل بھر کی واپسی کا یہ عمل منفیانہ (NEGATIVE) ہے. اس کا مثبت پہلو اس وقت شروع ہوگا جب آپ اُس دوراہے پر پہنچ کر صحیح سمت کی طرف چلنا شروع کر دیں گے. اگر آپ پہلے پیدل چلتے تھے اور اب کوئی سواری لے لیں، تو جو وقت اور توانائی غلط راستے پر چلنے میں صرف ہوئی تھی اس کی بچت ہو جائے گی. اب پورے طریق کار PROCESS کو قرآن تَابَ وَ اَصْلَحَ سے تعبیر کرتا ہے. یعنی غلط روش سے باز آجانا اور اپنے اندر صحیح راستے پر چلنے کی مزید صلاحیت پیدا کر لینا.

اگر ہم اسے مرض کی مثال کی رُو سے سمجھنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ "مغفرت" حفاظتی تدبیر (PREVENTIVE) اور "توبہ" اصلاحی تدبیر (CURATIVE) ہوتی ہے. یا مناسب تدبیر سے **مرض** کے حملہ کے بعد اس کے نقصان رساں اثرات سے محفوظ ہو جانا، بھی مغفرت کہلائے گا. یہ ظاہر ہے کہ اس تمام طریق کار کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ اگر تعمیری نتائج مرتب کرنے والی تدابیر زیادہ مؤثر ہوں گی تو وہ تخریبی نتائج پیدا کرنے والے عناصر پر غالب آجائیں گی اور ان کے مضرت رساں اثرات کا ازالہ کر دیں گی. اس حقیقت کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے. اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴) "یاد

رکھو حسن پیدا کرنے والے اعمال، بگاڑ پیدا کرنے والی تدابیر کے اثرات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔" دوسری جگہ ہے۔

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا (۴/۳۱)

اگر تم ان بڑے بڑے غلط کاموں سے بچتے رہو گے جن سے ہم نے تمہیں منع کیا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے مضر اثرات کا ازالہ کر دیں گے اور تمہیں باشرف مقام میں داخل کر دیں گے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

(۱) مقصدِ زندگی کسی عذاب سے چھٹکارا (نجات) نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشوونما سے موجودہ سطحِ زندگی سے بلند تر سطح کی طرف عروج و ارتقاء ہے۔

(۲) اس مقصد کے لئے انسان کو فرشتہ تصور نہیں کیا جاتا کہ اس سے کوئی لغزش سرزد نہ ہو۔ وہ انسان کے کمزور پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تمہاری صلاحیتوں کا پلڑا جھکتا رہا تو وہ تمہاری کمزوریوں کا ازالہ کر دے گا اور تم زندگی کی سیڑھی کے ایک درجہ اور اوپر چڑھ جاؤ گے۔ اس باب میں وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۝ (۲۳/۱۰۲-۱۰۳)

جس کسی کا پلڑا جھک جائے گا تو اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی اور جس کا پلڑا ہلکا رہے گا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی ذات میں کمی رہے گی۔ یہ اگلے درجہ میں جانے کے قابل نہیں ہوں گے۔ اس لئے جہنم میں رہیں گے۔

اس حقیقت کو طالب علم کی مثال سے سمجھنا چاہیئے۔ اگر سالانہ امتحان میں (مثلاً) ساٹھ فی صد "پاس مارکس" رکھے گئے ہیں تو جو لڑکا ساٹھ فیصد نمبر حاصل کر لیتا ہے اسے اگلی جماعت میں ترقی مل جاتی ہے۔ اس کی چالیس فی صد غلطیاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ لیکن جو لڑکا پچاس فی صد نمبر حاصل کرتا ہے اسے ترقی نہیں ملتی۔ اس کے حاصل کردہ نمبر اسے کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ یہ اس لئے کہ آیندہ درجہ میں جانے کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے وہ اس پر پورا نہیں اترتا۔ اسے وہیں روک دیا جاتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسکول کی مثال میں فیل شدہ طالب علم کے لئے اس کا موقع ہوتا ہے کہ وہ اسی کلاس میں رہ کر آئندہ سال کامیابی حاصل کر لے لیکن انسانی ذات کے سلسلے میں صورت یہ نہیں۔ اس میں بنیادی شرط یہ ہے کہ جس شخص نے اس ارضی زندگی میں اتنی صلاحیت حاصل کر لی جس سے وہ اگلی زندگی میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا اسے ترقی مل جائے گی۔ جس نے اتنی صلاحیت حاصل نہ کی وہ ہمیشہ کے لئے رُک جائے گا۔

جنّت اور جہنّم قرآن نے آگے بڑھ جانے والوں کی کیفیت کو "جنّت" سے تعبیر کیا ہے اور رُک جانے والوں کی حالت کو "جہنّم" سے. جہنّم تو عبرانی لفظ ہے (اس کے معنی ہیں وہ وادی جس میں انسان ذبح کیے جاتے تھے)۔ عربی زبان میں جہنّم کے لئے (قرآن نے) "جحیم" کا لفظ استعمال کیا ہے. جس کے بنیادی معنی روک دیئے جانے کے ہیں. کائنات میں نظریۂ ارتقاء کی رُو سے بھی یہی ہوتا ہے. جو نوع (SPECIES) کسی منزل میں پہنچ کر آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے، وہیں رُک جاتی ہے. لہٰذا یہ تصوّر کہ مجرمین کو کچھ عرصہ جہنّم میں بھیج کر سزا دی جائے گی اور وہ اپنی سزا کی مدت ختم کر لینے کے بعد جنت میں چلے جائیں گے، غیر قرآنی ہے. قرآن کی رُو سے جہنّم سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. سورۃ حج میں ہے کہ

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (۲۲/۲۲)

جب اہلِ جہنّم اس مصیبت سے نکلنے کا ارادہ کریں گے تو انہیں اُسی میں لوٹا دیا جائے گا.

اس کے برعکس "اہلِ جنّت" کو شروع ہی سے اس سے دُور رکھا جائے گا. وہ جہنّم کی سنسناہٹ تک نہیں سُن پائیں گے (۲۱/۱۰۱-۱۰۲). یعنی جو لوگ اپنی ذات کو اس قدر نشوونما دے لیں گے جس سے وہ موجودہ زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گی وہ اہلِ جنّت ہوں گے. جن میں اتنی صلاحیت نہیں ہوگی وہ آگے بڑھنے سے روک دیئے جائیں گے. انہیں اہلِ جہنّم کہیں گے.

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i) یہ تصوّر غلط ہے کہ زندگی کا مقصود انسان کا کسی عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے.

(ii) جزا اور سزا کا یہ تصوّر بھی صحیح نہیں کہ جزا سے مراد کہیں خارج سے کوئی انعام ملنا اور سزا سے مراد (PUNISHMENT) ہے. جزا اور سزا اعمال کے فطری نتائج ہیں. ان کا اثر انسانی ذات پر مرتّب ہوتا ہے.

(iii) جحیم سے مراد یہ ہے کہ انسان زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل نہیں ہوگا. اس لئے اس کی نشوونما رک جائے گی. اور چونکہ وہ اس نقصان کے نتائج کو بڑی شدّت سے محسوس کرے گا اس لئے اس کی زندگی عذاب میں ہوگی.

(iv) اہلِ جنّت وہ ہوں گے جو اپنے اندر زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا کر چکے ہوں گے. یہ اتنی بڑی کامیابی و کامرانی ہوگی جسے دیکھ کر ان کی روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے گی.

جزا اور سزا کے اس فلسفہ کے مطابق کسی کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا، یا کسی کا دوسروں کے گناہوں کا کفارہ

بن جانا. یا محض ایمان (بلا عمل) سے نجات حاصل ہو جانا. یا خدا کا "گناہوں کو بخش دینا" غیر قرآنی تصور ہے. زندگی کی سرفرازیاں
انسانی اعمال کے فطری نتائج کا نام ہیں. یہ بطور "بخشش" کہیں سے نہیں مل سکتیں.

آں بہشتے کہ خدائے بہ تو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست

"سفارش" اور "بخشش" کا تصور اس ذہنیت کا پیدا کردہ ہے جس کی رُو سے خدا کو ارضی بادشاہوں کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے. قرآن نے جس خدا کا تصور دیا ہے اس کی ہر بات قاعدے اور قانون کی رُو سے ہوتی ہے. اور قاعدے اور قانون میں سفارش اور بخشس کا کوئی سوال نہیں ہوتا.

گندم از گندم بروید، جو ز جو

کا اٹل قانون کارفرما رہتا ہے.

اس قانون کی رو سے بخشش نہیں بلکہ "مغفرت" ہو سکتی ہے. اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مغفرت سے مراد یہ ہے کہ انسان بڑے بڑے اعمالِ حسنہ کے ذریعے چھوٹی چھوٹی لغزشوں کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا ہے. لہٰذا جسے عرفِ عام میں "بخشش" کہا جاتا ہے وہ بھی انسان کے اپنے اعمالِ حسنہ کا نتیجہ ہوتی ہے. (اسے بخشش کے بجائے حفاظت کہنا زیادہ صحیح ہوگا. بلکہ "بخشش" کہنا ہی نہیں چاہیئے. مغفرت بمعنی حفاظت کہنا چاہیئے).

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے بھی "نجات" کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن نجات کے معنی کسی عذاب سے چھوٹ جانے کے ہی نہیں، کسی عذاب (تباہی) سے بالکل محفوظ رہنے کے بھی ہیں. اور یہی مفہوم قرآنی نجات کا ہے، یعنی انسان کا اعمالِ صالحہ کے ذریعے تباہی سے محفوظ رہنا.

قرآن کریم نے جنّت کی زندگی کو "حیاتِ جاوداں" سے بھی تعبیر کیا ہے.
آئندہ باب میں اس کے متعلق گفتگو کی جائے گی.
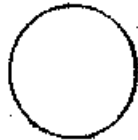
باب ہشتم

حیاتِ جاوداں

دُنیا میں کوئی انسان (سوائے اس کے جو اپنا دماغی توازن کھودے) مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) حیوانی جبلّت کا تقاضا ہے۔ حیوانات کو چونکہ موت کا تصور ہی نہیں ہوتا اس لئے ان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہنے کا خیال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صرف تحفظِ خویش چاہتے ہیں۔ انسان موت کا احساس رکھتا ہے اس لئے ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ قرآن نے قصۂ آدم میں بتایا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس جذبہ کو (EXPLOIT) کیا۔ ضمناً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن میں بیان کردہ قصۂ آدم کسی خاص فرد (آدم نامی کسی انسان) کی سرگزشت نہیں۔ وہ تمثیلی انداز میں خود آدمی کی سرگزشت ہے۔ وہ داستان ہے اس کے احوال و کوائف، جذبات و عواطف اور اس کی نفسیاتی اور تمدنی زندگی میں متضاد قوتوں کی کشمکش کی جسے قرآن نے نہایت خوبصورت استعاروں میں نہایت دل نشین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اس داستان میں ابلیس انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اُسے قوانینِ خداوندی (یا مستقل اقدار) کے سامنے جھکنے سے روکتے ہیں اور یوں اسے تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں کھینچ کر لے جاتے ہیں[1]۔ اس قصہ کے ضمن میں قرآن نے استعارہ کے انداز میں بیان کیا ہے کہ۔

حیاتِ جاوید کی آرزو

قَالَ یٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ (۲۰/۱۲۱)

---

[1] ان امور کی تفصیل میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

ابلیس نے آدم سے کہا۔ کیا میں تمہیں ایک درخت کا پتہ نشان بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوداں اور ایک ایسی مملکت مل جائے جس پر کبھی زوال نہ آئے؟

آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت کا پھل کھایا۔ اس سے ان کا جنسی شعور پیدا ہو گیا جس سے انہیں شرم محسوس ہوئی اور وہ اپنے بدن کو باغ کے درختوں کے پتوں سے ڈھانپنے لگ گئے۔

اولاد کی شکل میں حیاتِ جاوید

قرآن نے اس تمثیل میں بتایا ہے کہ انسان کے دل میں ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو مچلتی رہتی ہے۔ وہ کبھی مرنا نہیں چاہتا۔ لیکن وہ اپنی ہزار کوششوں کے باوجود موت کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے وہ موت کے بعد زندہ رہنے کی ہوس کی تسکین اولاد کی شکل میں حاصل کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا نام میری اولاد کے ذریعے روشن رہے گا۔ اس درخت کے پھل پھول میرے ہی پھل پھول ہوں گے۔ (چنانچہ خاندانی تسلسل کے نقشے کا نام ہی "شجرۂ نسب" ہوتا ہے)۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ فریب ہے جس سے انسان اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے — ہر شخص — کی زندگی منفرد —— (INDIVIDUAL) ہے۔ اس لئے کسی دوسرے فرد کے زندہ رہنے سے وہ شخص خود زندہ نہیں رہ سکتا خواہ وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ حیاتِ جاوداں انسانی ذات کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔

اس مقام پر اتنی وضاحت ضروری ہے کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ حیاتِ جاوید اولاد کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن بیوی بچوں کی محبت کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ ان چیزوں کو وجہ جاذبیت بتاتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ (۳/۱۴)

انسانوں کے لئے بیوی بچوں کی محبت، مال و دولت، پلے ہوئے گھوڑے، مویشی، کھیتی باڑی۔ (غرضیکہ دنیا کی متاع و زیبائش کی چیزوں) کو وجہ جاذبیت بنایا ہے۔ (لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ چیزیں زندگی کا مقصود و منتہیٰ نہیں۔ یہ) طبعی زندگی کی متاع ہیں۔ لیکن حقیقی زندگی کا خوشگوار ٹھکانہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے حاصل ہوتا ہے (نہ کہ طبعی قوانین کے ذریعے)۔

وہ اس سے واضح یہ کرنا چاہتا ہے کہ بیٹے کی زندگی سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی حیاتِ جاوید حاصل

ارتقائے ذات سے حیاتِ جاوید

کرنے کا طریقہ اور ہے۔ یہ انسانی ذات کی نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔ اور موت اس کا ٹسٹ TEST ہے۔ قرآن میں ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲)

ہم نے موت اور زندگی کو اس لئے بنایا ہے تاکہ تمہیں نمود (ذات) کے مواقع مل جائیں۔ اور یہ دیکھا جا سکے کہ تم میں کون ایسے اچھے کام کرتا ہے جس سے اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔

موت انسان کے طبعی جسم کو منتشر (DISINTIGRATE) کر دیتی ہے۔ لیکن اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو وہ جسم کی طبعی موت سے فنا نہیں ہوتی۔ سورۂ نمل میں ہے:۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ خَیْرٌ مِّنْھَا ج وَ ھُمْ مِّنْ فَزَعٍ یَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ٥ (۲۷/۸۹)

جو حسنِ عمل کو ساتھ لائے گا اسے (اس کے عمل سے) بہتر بدلہ ملے گا۔ یعنی یہ لوگ جسم کی موت کے وقت فنا کی دستبرد سے محفوظ رہیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ موت کا جھٹکا بہت بڑا جھٹکا ہے۔ اس سے انسان کی حیاتِ طبعی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے (کیونکہ اس دنیا میں دوبارہ آنا نہیں)۔ لیکن جس کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہو چکی ہوں، یہ جھٹکا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ (۲۱/۱۰۳) اتنا بڑا انقلاب انگیز حادثہ انہیں افسردہ نہیں کر سکے گا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ حیاتِ جاوداں (IMMORTALITY) عمل اور ارادہ سے حاصل کی جاتی ہے، یونہی ہر فرد کو بطور استحقاق نہیں مل جاتی۔ صحیح عمل اور ارادہ (یعنی بطیب خاطر، بلند اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا) حیوانی سطحِ زندگی کی چیز نہیں، اس لئے اس سطح پر حیاتِ جاوداں کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پروفیسر گیلووے اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

> یہ خیال کہ ہر وہ مخلوق جو انسانی پیکر میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی غیر نشوونمایافتہ یا وحشی کیوں نہ ہو۔ حیاتِ جاوید کی مستحق ہے، ایسا ہے جس کی ہم تائید نہیں کر سکتے۔ ایسا خیال کرنے کے لئے، خدا کی "اقتصادی اسکیم" کے متعلق اس علم سے کہیں گہرے علم کی ضرورت ہو گی جتنا علم انسان کو حاصل ہے ہم (LOTZE) کے اس خیال سے متفق ہیں کہ ہر مخلوق اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اس کا زندہ رہنا کائنات کے مفہوم و مدعا کے لئے ضروری ہو۔ جن چیزوں کا وجود، کائناتی اسکیم کے محض عبوری دور کے لئے ضروری ہو گا وہ بالآخر ختم ہو جائیں گی۔ (صفحہ ۵۷۲ – ۵۷۳)

موت کے بعد کی زندگی قرآن کی رُو سے ایک حقیقتِ ثابتہ ہے. لیکن اس زندگی کی نوعیت و کیفیت کس قسم کی ہوگی، اسے انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھا نہیں جا سکتا. سورۂ واقعہ میں ہے:۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَکُمُ الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۙ عَلٰۤی اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَکُمْ وَ نُنْشِئَکُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۵۶/۶۱-۶۰)

ہم نے تمہارے درمیان موت کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری موجودہ ہیئت کو بدل کر تمہیں ایسی صورت میں پیدا کریں جس کا تمہیں علم نہیں۔

حیات بعد الممات

جسم کے گل سڑ جانے سے انسانی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا. اس لئے کہ انسانی ذات نہ جسم کا حصہ ہے نہ ہی قوانینِ طبعی کے تابع. چنانچہ قرآن، مادی تصورِ حیات کو سامنے لاتے ہوئے کہتا ہے:۔

قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ۝ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا ۙ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۱۷/۵۱-۴۹)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیوں کے ڈھانچے رہ جائیں گے اور اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر بھی از سرِ نو پیدا کئے جائیں گے؟

ان سے کہو کہ تم (ہڈیاں تو ایک طرف) اگر پتھر ہو جاؤ یا لوہا. یا ان سے بھی زیادہ کسی سخت شے میں تبدیل ہو جاؤ جس کے متعلق تم خیال کر سکتے ہو کہ اس کا زندہ ہونا بہت مشکل ہے تو پھر بھی زندہ کئے جاؤ گے۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کون از سرِ نو زندہ کرے گا؟ ان سے کہو کہ وہی خدا جو تمہیں پہلی بار عدم سے وجود میں لایا تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ زندگی پہلی بار طبعی قوانین کے مطابق عدم سے وجود میں نہیں آئی تھی. یہ اس تدبیر کے ماتحت وجود میں آئی تھی جس کا تعلق خدا کے عالمِ امر سے ہے. یعنی حیات (LIFE) مادی قوانین کی پیداوار نہیں. یہ خدا کے "امر" سے وجود میں آئی تھی. اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی بھی طبعی قوانین کے مطابق وجود میں نہیں آئے گی. خدا کے امر کے مطابق ظہور میں آئے گی. یہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی ہے. جس میں انسانی ذات میں مزید استحکام اور ارتقاء پیدا ہو جائے گا. اور وہ موجودہ سہاروں سے بے نیاز ہو جائے گی. سورۂ نوح میں ہے کہ خدا نے تمہیں مختلف منازل سے گزارتے ہوئے پیدا کیا ہے. اب زندگی کی موجودہ سطح کے بعد تم اس میں مزید وقار کے خواہاں کیوں نہیں ہوتے (۷۱/۱۴-۱۳). وقار کے معنی بھاری پن کے ہوتے ہیں.

یعنی ذات کا ارتکاز (CRYSTALLISATION) یا استحکام (SOLIDARITY) ۔ یہ چیز مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ ہوگی انسان کے اپنے حسنِ عمل کا۔

عمل اور ارادہ

"عمل" کے سلسلے میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ عمل نام ہے ارادے کو مشہود بنانے (MANIFEST) کرنے کا۔ جس میں ارادہ نہیں اس کا عمل، عمل ہی نہیں۔ یا جس عمل کے پیچھے ارادہ نہیں، اس کے نتائج کا وہ شخص ذمہ دار نہیں۔ نہ مجبوری کی نیکی، نیکی ہوتی ہے، نہ بدی، بدی۔ لہٰذا جو صاحبِ ارادہ نہیں، اس کی ذات کے ضعف و استحکام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو صاحبِ ارادہ، اپنے اختیار و ارادہ سے غلط روش اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی ذات کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ طبعی موت کے بعد وہ بھی زندہ ہوگا لیکن، جیسا کہ سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی۔ اسے جہنم کی زندگی کہا گیا ہے جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی (۸۷/۱۳) "اس میں نہ وہ مُردوں میں شمار ہوں گے، نہ زندوں میں۔ نہ موت آئے گی، نہ زندگی نصیب ہوگی۔" موت اس لئے نہیں کہ وہ طبعی موت کے بعد زندہ کر دیئے گئے۔ زندگی اس لئے نہیں کہ زندگی نام ہی حرکت و ارتقاء کا ہے۔ جس زندگی میں نشوونما نہیں وہ زندگی، زندگی نہیں۔ قرآن میں ہے کہ ایسا شخص حسرت سے کہے گا کہ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۸۹/۲۴) "اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیج دیا ہوتا۔" ان کے برعکس اہلِ جنت حیاتِ جاوداں کے مالک ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ

اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ (۳۷/۵۸)

ہم پہلی موت کے بعد (جو دنیا کی زندگی میں آگئی) مرنے والے نہیں۔

وہ زندہ اور متحرک ہوں گے۔ اور زندگی کی مزید ارتقائی منزلیں ان کے سامنے روشن ہوتی چلی جائیں گی۔ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ (۵۷/۱۲) "ان کا نور آگے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔" انگریزی زبان میں یوں سمجھو کہ اہلِ جہنم کی زندگی محض (SURVIVAL AFTER DEATH) ہوگی، اور اہلِ جنت کی زندگی (IMMORTALITY) جو ہر انسان کو بطور استحقاق نہیں ملے گی بلکہ اسے اپنے حسنِ عمل سے حاصل کرنا ہوگا (SURVIVAL) غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج کے احساس شدید کے لئے ہے اور (IMMORTALITY) زندگی کی مزید اور نہایت خوشگوار ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانے کے لئے۔

مادی تصورِ حیات انسان کو یہی بتاتا ہے کہ

مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵/۲۴)

زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے ہیں اور پیدا ہوتے ہیں اور مرورِ زمانہ ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔
لیکن قرآنی تصورِ حیات یہ سکھاتا ہے کہ اگر تم اپنی ذات کی قوتوں کو بیدار کر لو تو تم "مادی چار دیواریوں سے نکل کر بہت آگے جا سکتے ہو"۔ (۵۵/۳۳)

دونوں زندگیاں یکساں نہیں

یہ بنیادی وجہ ہے کہ ان دو متضاد نظریاتِ زندگی رکھنے والوں کی نہ زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے، نہ موت۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ (۴۵/۲۱)

جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں وہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا بنا دیں گے جو مستقل اقدار پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔
قطعاً نہیں! نہ ان کی زندگی ایک جیسی ہو سکتی ہے نہ موت۔ کتنا غلط اور بُرا ہے وہ فیصلہ جو یہ لوگ اپنے متعلق کرتے ہیں۔

یہ وجہ ہے کہ مومن کے نزدیک موت کوئی خوف کی چیز نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے کہ سانس کے بند

مومن موت سے نہیں ڈرتا

ہو جانے سے انسان مر نہیں جاتا اس کے سامنے زندگی کی مزید ارتقائی منازل کے راستے کھل جاتے ہیں۔ لہٰذا، موت اس کے نزدیک بلندیوں کا زینہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

دِل اندر سینہ گوید دلبرے ہست ۔۔۔ متاعِ آفرینش غارت گرے ہست
بگوشم آمد از گردونِ دمِ مرگ ۔۔۔ شگوفہ چوں فرو ریزد برے ہست

اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے موت کو معیارِ صداقت قرار دیا ہے۔ وہ یہود (مخالفین) سے کہتا ہے کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲/۹۴) "اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو حق کی مدافعت میں مرجانے کی تمنا کر کے دکھاؤ"۔ کسی مستقل قدر کی حفاظت میں جان وہی دے سکتا ہے جسے اس امر کا یقین ہو کہ اس طرح مرجانے سے انسان کو حیاتِ جاوید حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (۲/۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں جان دے دیں ان کے متعلق یہ مت کہو کہ وہ مر گئے۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ

سطح پر ان کی زندگی کی کیفیت و ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے۔

یہ ہے وہ طریق جس سے انسان کی 'ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو' پوری ہوتی ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کی "حیاتِ جاوداں" اس طرح ابدی نہیں ہو سکتی جس طرح ذاتِ خداوندی ابدی ہے۔ لیکن اپنے شعور کی موجودہ سطح پر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسانی ذات کا منتہیٰ کیا ہوگا۔ اور جب یہ ذاتِ خداوندی کی طرح ابدی نہیں اور نہ ہی خدا کی ذات کا جزو ہے۔ تو پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں قرآن کریم صرف اتنا بتاتا ہے کہ انسانی جسم کے فنا ہو جانے کے بعد انسانی زندگی اپنے مزید ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے بعد کی کیفیات سے نہ وہ بحث کرتا ہے اور نہ ہی ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ یہ سوال ہمارے ادراک کی موجودہ حد سے ماوراء ہے۔ ایسے ہی جیسے زندگی اور کائنات کے آغاز کا مسئلہ ہمارے سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ حیات بعد الممات ایک حقیقت ہے جس پر 'ایمان' اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔ یہ درحقیقت قانونِ مکافاتِ عمل ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ زندگی اگر اسی دنیا کی زندگی ہو تو پھر دین کا سارا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی عمارت اٹھتی ہی انسانی ذات' قانونِ مکافاتِ عمل اور تسلسلِ حیات کے ایمان پر ہے۔

اس دنیا میں جنت اور جہنم

اس وقت تک ہم زندگی کے اس گوشے کے متعلق بحث کر رہے ہیں جس کا تعلق مرنے کے بعد کی دنیا سے ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانی اعمال کے نتائج کی نمود اسی دنیا کی زندگی میں شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی جنت اور جہنم کی تعمیر کے سلسلہ کا آغاز یہیں سے ہو جاتا ہے۔ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے اور یہ وہ جنت ہے جسے قرآن کم اہمیت نہیں دیتا۔ لیکن یہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے جن کی ذات کی صلاحیتیں ابھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا' ہم آئندہ باب میں بتائیں گے کہ انسانی ذات کی نشوونما کس طرح سے ہوتی ہے۔ اور جن افراد کی ذات کی نمود شروع ہو جاتی ہے ان کے ہاتھوں جنتی معاشرہ کا قیام کس طرح عمل میں آتا ہے۔

بابِ نہم

انسانی ذات کی نشوونما کا اصول

سابقہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ دین کا نقطۂ ماسکہ ہے انسانی ذات پر یقین اور اس کا مقصود ہے اس ذات کی نشوونما۔ عربی زبان میں نشوونما کو ربوبیت کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ تدبیر یا طریقِ کار ہوتا ہے جس کی رُو سے کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے آہستہ آہستہ بتدریج اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیا جائے۔ آپ خارجی کائنات میں دیکھئے، ہر طرف اس قانونِ ربوبیت کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ (قرآن کی پیش کردہ کھیتی کی مثال میں) ایک بیج میں، اسی قسم کا درخت

قانونِ ربوبیت

بن جانے کی صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں جس کا وہ بیج ہے۔ اگر اس بیج کی مناسب نشوونما (ربوبیت) کی جائے تو یہ مضمر صلاحیتیں مشہود ہوتی چلی جائیں گی۔ بیج سے کونپل پھوٹے گی۔ کونپل سے پودا بنے گا۔ پودا پروان چڑھ کر تناور درخت کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس کے بعد — (اس کے لئے مختلف بیجوں کے فرق کے سمجھنے کی ضرورت ہے)۔ پیپل کے بیج کا منتہیٰ پیپل بن جانا ہے۔ جس میں صرف پتے ہی پتے ہوتے ہیں۔ چنبیلی میں پتوں کے علاوہ پھول بھی ہوں گے۔ آم کے پیڑ میں پھل بھی لگیں گے — اس طریق عمل کا منتہیٰ یہ ہوگا کہ ان پیڑوں میں پھر بیج پیدا ہوں جن سے یہ سلسلہ بدستور قائم رہے۔ یعنی بیج کا منتہیٰ اپنے جیسے بیج بنانا ہے۔ نباتات سے آگے بڑھئے تو حیوانات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ حیوانی زندگی کا منتہیٰ بھی یہی ہے کہ ایک حیوان اپنے جیسا اور حیوان پیدا کرے۔ گویا زندگی کی حیوانی سطح تک ایک گردشِ دولابی (CYCLIC ORDER) قائم رہتا ہے۔ یہی اس سلسلہ کی آخری حد ہے، کوئی شے اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۱۷/۸۴) "ہر شے اس حد تک جا سکتی ہے جس تک جانا اس کے لئے مقصود ہے۔" یہی حد اس شے کی (DESTINY) کہلاتی ہے۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے جب اس کی زندگی محض حیوانی سطح تک رہے تو اس میں بھی سلسلۂ تولید و تناسل

(PROCREATION) سے ایک چکر (CYCLE) قائم ہوجاتا ہے۔ جس میں ہر فرد کی زندگی کا منتہیٰ اپنے جیسا فرد

انسانی زندگی کا مقصود

(بیٹا یا بیٹی) پیدا کرنا رہ جاتا ہے[1]۔ لیکن جب زندگی کو (حیوانی سطح سے بلند کرکے) انسانی سطح پر لائیں تو اس میں مقصود و منتہیٰ عملِ تولید کے ذریعے اپنے جیسا اور فرد پیدا کرنا نہیں ہوتا، انسانی ذات کی نشوونما سے آگے بڑھنا اور بلند ہوتے چلے جانا ہوتا ہے۔ خدا نے جب اپنے متعلق کہا تھا کہ لَمۡ یَلِدۡ ۙ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ (۱۱۲/۳-۲) "نہ وہ سلسلۂ تولید سے اپنے جیسا اور پیدا کرتا ہے اور نہ خود سلسلۂ توالد کی پیداوار ہے۔" تو اس سے ذات کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ لہٰذا، جب زندگی، انسانی سطح پر پہنچ جاتی ہے تو اس میں کاروانِ حیات کسی چکر میں سفر نہیں کرتا۔ صراطِ مستقیم (سیدھی اور توازن بدوش راہ) پر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کائنات میں نظامِ ربوبیت کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ بیج کی نشوونما کے لئے مٹی، پانی، ہوا، حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی بیج کو میز پر ایک طرف رکھ دیں۔ دوسری طرف تھوڑی سی مٹی ڈال دیں۔ ایک کٹورے میں پانی بھر کر رکھ دیں۔ ہوا اور حرارت (سورج کی روشنی) کمرے میں موجود ہی ہوگی۔ ان تمام عناصر کی موجودگی کے باوجود اس بیج سے کونپل نہیں پھوٹے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ عناصر ایک دوسرے میں مدغم ہوجائیں۔ اس سے واضح ہے کہ نظامِ ربوبیت میں کسی شے کی نشوونما کے لئے مختلف عناصر کا باہمی تعاون بلکہ ادغام ضروری ہے۔

ذات کی نشوونما اجتماعی نظام میں ہوتی ہے

انسانی ذات کی نشوونما بھی خانقاہیت کی انفرادی زندگی میں نہیں ہوسکتی۔ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کی رُو سے، فرد کی ذات کی ربوبیت، معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے، باہمی تعاون و تناصر بلکہ قلوب کے باہمی ائتلاف (ایک دوسرے میں جذب ہوجانے ۳/۱۰۲) سے ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے قرآن ایک اُمت کی تشکیل کرتا ہے (۲/۱۴۳) اور اس اجتماعی نظام میں افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

اشیائے کائنات کے نشوونما کے سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔ (بیج والی مثال میں) اگر بیج پر مٹی زیادہ

---

[1] جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے سلسلۂ تولید افزائش و بقائے نسلِ انسانی کے لئے ضروری ہے۔ جو کچھ ہم اس مقام پر کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ افزائشِ نسلِ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ نہیں۔ اس کا منتہیٰ انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

توازن و تناسب کی ضرورت

پڑ جائے۔ پانی کم یا زیادہ دے دیا جائے۔ ہوا تیز چل پڑے۔ حرارت کی کمی بیشی ہو جائے تو بھی بیج کی نشوونما نہیں ہو سکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان تمام عناصر میں خاص توازن اور تناسب رہے۔

یہی صورت انسانی ذات کی نشوونما کی ہے۔ بنگاہِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ایک تو انسانی ذات مختلف صفات کی جامع ہے۔ انسانی ذات کیا، خود خدا کی ذات، جس کی صفات کا پرتو انسانی ذات میں منعکس ہوتا ہے۔۔ مختلف صفات کی حامل ہے۔ بالفاظِ دیگر، ذات میں مختلف صفات مضمر رہتی ہیں۔ ان صفات میں خاص تناسب و توازن کا ہونا ضروری ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کے لئے "الاسمار الحسنٰی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ حُسن بہترین تناسب ہوتا ہے اس لئے انہیں حسین ترین (الحسنٰی) قرار دیا گیا ہے۔ اس جہت سے قرآن نے ان اعمال کو جن سے انسانی ذات کی صفات کی نمود خاص تناسب کے ساتھ ہو، اعمالِ حسنہ یا الحسنات سے تعبیر کیا ہے۔

طبیعی جسم کی پرورش کے لئے قانون یہ ہے کہ ہر فرد کے جسم کی پرورش اس شئے سے ہوتی ہے جسے وہ خود کھاتا ہے۔

ذات کی نشوونما کا بنیادی اُصول

یہ ناممکن ہے کہ اچھی خوراک تو میں کھاؤں اور پرورش میرے بھائی کے جسم کی ہوتی جائے۔ یہ وہ "خود غرضی" (SELFISH NESS) ہے جس پر طبیعی زندگی کا دارومدار ہے۔ طبیعی سطح پر کوئی فرد اس سے مستثنٰی نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ، دوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے حیوانی (یعنی طبیعی) زندگی اور انسانی (یعنی ذات کے تصوّر پر مبنی) زندگی کے راستوں میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ طبیعی زندگی میں جسمِ انسانی کے لئے "لینا" ضروری ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کا اصول "دینا" ہے۔ اوّل الذکر کے لئے اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔ اگر آپ اور آپ کا ہمسایہ بھوکے ہوں اور روٹی ایک ہی ہو تو جب تک آپ اپنے آپ کو ہمسایہ پر ترجیح دے کر وہ روٹی خود نہ کھائیں گے آپ کے جسم کی پرورش نہیں ہو سکے گی۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما کے لئے دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینا ضروری ہوتا ہے۔ جو لوگ اس نہج پر زندگی بسر کرتے ہیں ان کے متعلق قرآن میں ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ (۵۹/۹)

جو اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے انہیں خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینے سے بچ جاتا ہے تو انہی لوگوں کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹/۹) جو "شحِ نفس" سے بچ جائے وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ "شحِ نفس" کسے کہتے ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس منظر کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہے

شحِ نفس کسے کہتے ہیں

پانی کا نل صرف دو گھنٹے کے لئے کھلے گا اور اس سے پانی بہت کم مقدار میں نکلے گا۔ پانی لینے والوں کو دیکھئے تو یہاں سے وہاں تک خالی برتنوں کی قطار نظر آئے گی۔ ایسے میں ہر شخص کی خواہش (بلکہ کوشش) یہ ہو گی کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی بھر لے۔ اس جذبہ کو "شحِ نفس" کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص اس جذبے سے محفوظ رہے اور دوسروں کو پیچھے دھکیلنے کی بجائے خود پیچھے ہٹ جائے اور زیادہ ضرورت مند کو پہلے پانی لے لینے دے، اس کی کھیتی پروان چڑھے گی۔ طبیعی قانون کی رُو سے کھیتی اس کی پروان چڑھتی ہے جس کی زمین کو بروقت پانی مل جائے۔ (اس کے لئے گاؤں میں قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے) لیکن قرآنی نظامِ ربوبیت کی رُو سے اُس فرد کی ذات کی کھیتی برگ و بار لاتی ہے جو پانی کا رُخ دوسروں کی کھیتیوں کی طرف موڑ دے۔ "دوسروں" سے مراد صرف اپنی جماعت، اپنی پارٹی، اپنی

نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش

قوم، اپنے ملک، اپنے مذہب کے افراد نہیں۔ اس میں تمام نوعِ انسان کے وہ افراد (بلالحاظِ مذہب، رنگ، زبان، قوم، ملک سب شامل ہیں) جن کی ضرورت زیادہ ہو۔ اس کے لئے قرآن کا بنیادی اصول یہ ہے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اس عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے انسانی ذات کی نشوونما کا بنیادی اصول۔ اس اصول کے مطابق قرآن ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہو گی۔ اور یہی اس کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہے۔

مغربی مفکرین کی تائیدات

یہی وہ حقیقت ہے جسے اب مغرب کے مفکرین اور محققین نمایاں طور پر سامنے لا رہے ہیں۔ راشڈل (HASTINGS RASHDALL)

جس کی کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور جو اخلاقیات کے موضوع پر اہم مقام رکھتی ہے، اس ضمن میں لکھتا ہے۔

راشڈل | مثالی نہجِ زندگی یہ ہے کہ میں کسی دوسرے کی بہبود کے لئے کچھ کروں اور اس میں اپنی منفعت محسوس کروں اور وہ میری بہبود کے لئے کچھ کرے اور اس میں اپنی بھلائی دیکھے۔

بس یہ ہے حقیقی مثالی زندگی۔ (جلد دوم، صفحہ ۷۷)

انسانی تہذیب کا مشہور مؤرخ (ROBERT BRIFFAULT) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے کہ

برفا | حقیقت یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کے جو مخصوص طریقے اور شرائط ہیں ان کا تقاضا ہے کہ ایک فرد کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب تمام انسانیت کی نشوونما ہو رہی ہو۔ (صفحہ ۲۶۰)

یہی مصنف دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

انسانی ارتقاء کا حقیقی مفہوم "تعمیرِ انسانیت" ہے۔ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کی تعبیر "قانونِ اخلاق" کی اصطلاح سے نہیں ہو سکتی۔ اسے مفادِ غیر کا جذبہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی یہ وہ چیز ہے جسے عام طور پر "نیکی کی خاطر" یا احسان، احسان کی خاطر" جیسے الفاظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ تو خود انسان کی اپنی ذات کی نشوونما کی لاینفک شرط اور غیر متبدل تقاضے کا نام ہے۔ (صفحہ ۲۶۱)

"دوسروں کی نشوونما" کی اہمیت کس قدر ہے اس کے متعلق یہ مفکر دوسری جگہ لکھتا ہے۔

فطرت کی میزان میں وہی عمل، عملِ خیر ہے جو انسانیت کی نشوونما میں ممد و معاون ہو۔ اور وہ عمل عملِ شر ہے جو اس کی نشوونما کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرے، اس کی ترقی میں مانع ہو اور اس سے ٹکرائے۔ وہی زندگی زندگی کہلانے کی مستحق ہے جو انسانیت کی نشوونما کا ساتھ دیتی ہو۔ جو اس راہ سے ہٹی ہوئی ہو، وہ زندگی بیکار ہے اور جو اس راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائے وہ مردود و مطرود ہے۔ اخلاقی اقدار کا یہی فطری، مطلق اور حقیقی معیار ہے۔ فطرت اُس ولی کی زندگی کو پرِ کاہ جتنا وزن بھی نہیں دیتی جو نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ (اس کے زہد و عبادت کی پوری کی پوری زندگی) اس فرد کے ایک عمل کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی جو نسلِ انسانی کے مستقل ارتقاء کے لئے کوشاں ہو۔ (فطرت ایسے ولی کے اعمال

کے لئے میزان ہی کھڑی نہیں کرتی)۔ فطرت جس عمل کی قیمت مقرر کرتی ہے وہ عمل ہے جو انسانی سطح کو بلند کرنے میں معاون ہو۔ وہ ایسے عمل کو نقشِ دوام عطا کر دیتی ہے۔ (صفحہ ۳۵۲)

جیسا کہ پہلے لکھا ہے قرآن اُسی عمل کو بقائے دوام کا مستحق قرار دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب ہی عالمِ انسانیت ہے۔ اس پروگرام کا منتہیٰ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان کو ایک امّت بنا دیا جائے۔

تمام انسانیت کا ارتقاء

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً (۱۰/۱۹) "تمام نوعِ انسان ایک امّت ہیں۔" اس کا انقلاب آفریں اعلان اور زندگی بخش نصب العین ہے۔ وہ پورے کے پورے عالمِ انسانیت (HUMANITY) کو ایک فرد تسلیم کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) "تمہاری ــ پوری نوعِ انسان کی ــ تخلیق اور نشاۃ ایک فرد کی طرح ہے۔" اس مقصد کے حصول کے لئے وہ جس نظامِ ربوبیت کا نقشہ پیش کرتا ہے اس کے مرکز (کعبہ) کے متعلق کہتا ہے کہ اُسے قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷) بنایا ہے۔ یعنی پوری انسانیت کے قیام کا موجب۔ لہٰذا جب وہ یہ کہتا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ دوسروں کی نشوونما کی فکر کرے تو یہ نشوونما اپنی جماعت تک محدود نہیں ہوتی۔ اس میں عالمِ انسانیت کے تمام افراد (بلاتفریقِ مذہب و ملّت اور بلاتمیز رنگ و نسل) شریک ہوتے ہیں۔ پروفیسر وہائٹ ہیڈ (A.N. WHITE HEAD) نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ

وائٹ ہیڈ

زندگی کی تکمیل کا راز اپنے مقاصد کے ماوراء مقاصد کے حصول میں ہوتا ہے۔ یعنی اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسان کی تکمیل میں۔

(ADVENTURES OF IDEAS; P-373)

میسن (J.W.T. MASON) اس باب میں کہتا ہے۔

میسن

انسان کا ایک مقصد تو اپنی نشوونما ہے لیکن اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ دیگر افرادِ انسانیہ کی نشوونما بھی زیادہ حد تک ہو جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان پہلے مقصد کے حصول میں جذب ہو کر دوسرے مقصد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ آپ ایسے شخص کو انفرادی طور پر نیک کہنا چاہیں تو کہہ لیں لیکن انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے یہ کبھی نیک نہیں کہلا سکتا۔ بلند ہستیاں وہ ہیں جو ان دونوں مقاصد کو باہمدگر مدغم کر دیں۔

(CREATIVE FREEDOM; P-226)

انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قرآن جو پروگرام تجویز کرتا ہے اس کی رُو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کی تکمیل میں ایسا جذب ہو جائے کہ وہ دوسروں کی نشوونما کو نظرانداز کر دے۔ اس کا پروگرام ہی یہ ہے کہ جس قدر کوئی فرد دوسروں کی نشوونما کرتا ہے اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ کانٹ نے کہا تھا کہ

> تم ایک ایسے معاشرے کے فرد بن جاؤ جس میں ہر فرد دوسرے افراد کے مفاد کی قیمت اپنے مفاد کی قیمت کے برابر سمجھتا ہے۔ (QUOTED BY RASHDAL, VOL. 1; P-133)

لیکن قرآن اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) کا اصول پیش کرتا ہے۔ یعنی دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دینا۔

ہکسلے (JULIAN HUXLEY) جو انسانوں کے خود ساختہ لیکن خدا کی طرف منسوب کردہ مذاہب کے ہاتھوں جس قدر تنگ آچکا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جس کی بنیاد وحی پر نہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ہی (RELIGION WITHOUT REVELATION) رکھا ہے۔ اسے جس مذہب کی تلاش ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

ہکسلے

> میرا عقیدہ ہے کہ انسان کے تمام فرائض کو ان چند الفاظ میں سمٹایا جا سکتا ہے یعنی بہت زیادہ زندگی۔ جتنی اپنے لئے، اتنی ہی اپنے ہمسایہ کے لئے۔ میرا یقین ہے کہ مشقت، پریشانیوں اور تکالیف کے ساتھ ہی سہی، انسان اس قابل ضرور ہے کہ وہ ایسا کر سکے۔
>
> جو مذہب اس اصول کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھے اور پھر انسانی ممکنات اور موانعات دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے، اس نصب العین کی کشادہ نگہی سے تعبیر کرے، وہی مذہب حق و صداقت پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب زندگی کے ساتھ دوش بدوش چلے گا۔ وہ زندگی کی نشوونما کی حوصلہ افزائی کرے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ خود اس کی اپنی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے گی۔
>
> میں اس قسم کے مذہب حیات بخش کا قائل ہوں۔ (صفحہ ۱۱۳)

ہکسلے کو کون بتائے کہ اس قسم کا مذہب اُسے "وحی" کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ اس کی دشواری یہ تھی کہ اس نے انسانوں کے خود تراشیدہ مذہب کو مبنی بر وحی مذاہب سمجھ لیا۔ آج اس آسمان کے نیچے وحی اپنی منزہ اور حقیقی شکل میں قرآن سے باہر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ خدا کا پیغام انہی کے لئے ہے جن میں زندگی کی صلاحیت ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) "اس کی آگہی کے لئے جس میں شرارِ زندگی موجود ہے۔" اور اس کے دیئے

نئی زندگی

ہوئے پروگرام کے اتباع سے اس زندگی میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۸/۲۴)

اے جماعتِ مومنین! خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی طرف بلا رہی ہے جو تمہیں زندگی عطا کرے۔

لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) زندگی اسی کو مل سکتی ہے جو دوسروں کے لئے سامانِ زندگی مہیا کرنے کی فکر کرے، اور اس کے لئے ان سے کسی معاوضہ کا طلبگار نہ ہو۔ معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کا بھی خواہاں نہ ہو۔ وہ جن کے لئے سامانِ زیست فراہم کرے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دے کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶/۹) "ہم تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتے حتّٰی کہ شکریہ تک بھی نہیں"، وہ ان سے کہہ دے کہ دوسروں کی کمی پوری کرنا میرا فریضہ تھا۔ میں نے جب کسی کی کمی کو پورا کر دیا۔ وہ کمی پوری ہوگئی اس کے بعد کسی صلہ یا معاوضہ کا سوال کیا؟ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰) "کسی کی کمی کو پورا کر دینے" اور اس طرح اس کے بگڑے ہوئے توازن کو قائم کر دینے کا صلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا توازن قائم ہو گیا" جو لوگ اس حقیقت کو اپنا نصب العین بنالیں وہ اپنی محنت کے ماحصل کو نوعِ انسان کی نشوونما (ربوبیتِ عامہ) کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ اور جن لوگوں کی نشوونما کرتے ہیں۔

ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى ۙ لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۲۶۳)

نہ کسی قسم کی طعن و تعریض سے ان کی دل شکنی کرتے ہیں نہ احسان جتا کر انہیں صدمہ پہنچاتے ہیں۔ ان کا اجر خدا کے نظامِ ربوبیت کے ذمے ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کے خوف و ہراس اور افسردگی و پژمردگی سے محفوظ و مامون ہو جاتے ہیں۔

معاوضہ طلب کرنا تو ایک طرف ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اسے لوگ دیکھیں تاکہ ہماری تعریف ہو۔ جو لوگ اس طرح تعریف و ستائش کے خواہاں ہوں قرآن کی رو سے وہ اس جماعت کے ممبر نہیں بن سکتے جو نوعِ انسان کی ربوبیت کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہے۔ چنانچہ وہ جماعتِ مومنین سے کہتا ہے کہ دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ کرنا۔

كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۲/۲۶۴)

جو لوگ اپنی دولت دوسروں کے دکھاوے کی خاطر خرچ کرتے ہیں نہ اس لئے کہ انہیں خدا کے قوانینِ ربوبیت اور زندگی کے مستقبل پر ایمان ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ جو اس نظامِ ربوبیت کی تشکیل کے اوّلین داعی ہوتے تھے اپنے لوگوں سے بالوضاحت کہہ دیتے تھے کہ

وَ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۶/۱۰۹﴾

میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں چاہتا۔ میرا اجر اس خدا (کے قانونِ ربوبیت) کے ذمے ہے جو تمام اقوامِ عالم کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے

(i) زندگی کا مقصود و منتہیٰ انسانی ذات کی نشوونما ہے اور

(ii) انسانی ذات کی نشوونما کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل (مال و دولت) کو دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا رکھے اور اس باب میں دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ (جیسا کہ باب چہارم ــ عقل اور ایمان ــ میں بتایا جا چکا ہے) انسانی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فرد کی (اور اس کی اولاد کی) ضروریاتِ زندگی مہیا کرے جس کی وہ عقل ہے۔ اگر اس عقل سے یہ کہا جائے کہ تو اس فرد اور اس کی اولاد) کی پرورش کا خیال چھوڑ دے۔ یہ اگر مرتا ہے تو اسے مرنے دے ــ اس کی اولاد بھوک سے تڑپتی ہے تو تڑپنے دے۔ تو دوسروں کی پرورش کی فکر کر، تو عقل اس کے لئے کبھی تیار نہیں ہوگی۔ اگر اسے اس طریقِ کار کے لئے مجبور کیا جائے گا تو (اوّل تو وہ اس چیز کو برداشت ہی نہیں کرے گی اور اگر اُسے کسی طرح طوعاً و کرہاً آمادہ بھی کر لیا جائے تو) اس سے جو نفسیاتی کشمکش پیدا ہوگی اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ لہٰذا وہ سوال جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' یہ ہے کہ

عقل کی تسکین کی صورت

عقل کو اس پر کیسے آمادہ کیا جائے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دے؟ آمادہ ہی نہیں بلکہ مطمئن کیا جائے؟ خانقاہیت کے تصوّف (رہبانیت) نے اس کا علاج یہ سوچا کہ انسانی جسم اور اس کے تقاضوں کو قابلِ نفرت قرار دے دیا جائے۔ اور ان کا فنا کر دینا انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ سمجھ لیا جائے۔ لیکن اوّل تو یہ تصورِ حیات اور فلسفۂ زندگی ناممکن العمل ہے۔ انسانی زندگی کے تقاضوں کو فنا نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس سے جس بُری طرح انسانیت کا گلا گھٹتا ہے اس پر تاریخ خانقاہیت شاہد ہے۔ خواہ وہ عیسائی راہبوں کے غاروں میں ہو یا مجوسی آتشکدوں میں۔ وہ ہندی ویدانت کے سنیاسی آشرم میں ہو یا تصوّف کی خلوت گاہوں میں۔ قرآن سر درد کا علاج سر کاٹ دینا نہیں بتاتا۔ وہ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے اس کے جسم کی پرورش کو نظرانداز نہیں کرتا۔ وہ جسم کی پرورش کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ وہ مثالی زندگی کے لئے "جسم اور

علم" دونوں کی فراوانی ضروری قرار دیتا ہے (۲/۲۴۷)۔ اس کی رُو سے مال و دولت، بیوی بچے، زیبائش و آرائش کی چیزیں وجۂ جاذبیت ہیں (۳/۱۴)۔ وہ مسلکِ خانقاہیت کے حاملین کو للکار کر کہتا ہے کہ "کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو اور خوشگوار سامانِ زیست کو جسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا حرام قرار دے (۷/۳۲)"۔

لہٰذا، سمٹ سمٹا کر پھر وہی سوال سامنے آجاتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ جسم کی پرورش کے لئے سامانِ زیست سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہو (اور قرآن اس کی بھی تائید کرتا ہے)۔ دوسری طرف انسانی ذات کی نشوونما کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دے۔

سوال یہ ہے کہ عقل کو اس کے لئے آمادہ کس طرح کیا جائے کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دے۔

قرآن اس کے لئے ایسا انتظام کرتا ہے کہ اس میں عقل نہ صرف اس مقصدِ عظیم کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے بلکہ اس میں عین راحت اور تسکین محسوس کرتی ہے۔

اس نظام کی تفصیل آئندہ باب میں ملے گی۔
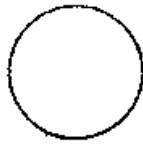
بابِ دہم

نظامِ ربُوبیّت

گذشتہ باب میں ہم نے کہا ہے کہ قرآن اس قسم کا انتظام کرتا ہے کہ جس سے ہر فرد کی عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ دوسرے افراد کو اپنے آپ پر ترجیح دینا صحیح فریضۂ زندگی ہے. ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی اس انداز کا اطمینان حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ اس طرف سے بالکل مطمئن نہ ہو جائے کہ ایسا کرنے سے اس شخص کی اپنی اور اس کی اولاد کی ضروریات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا. دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے قرآن کیا پروگرام تجویز کرتا ہے. اس پروگرام کے اطمینان بخش ہونے پر دین کی عمارت کے استحکام کا دارومدار ہوتا ہے. اس لئے اس سلسلہ میں یہ کڑی بڑی اہم ہے.

سابقہ ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ جو لوگ وحی کی رُو سے متعیّن کردہ مستقل اقدار پر یقین رکھتے ہیں وہ ایک معاشرہ قائم کرتے ہیں. معاشرہ سے مراد ہے ایک عمرانی نظام (SOCIAL ORDER) جس میں مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں. دورِ حاضر کی اصطلاح میں اُسے مملکت (STATE) کہا جاتا ہے. ظاہر ہے کہ (جس طرح ہر نظام میں ہوتا ہے) اس نظام میں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جن کے ذمے اس نظام کے قیام اور استحکام کے فرائض ہوں گے. باقی افرادِ معاشرہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں ان کے دست و بازو بنیں گے. اس مملکت میں حاکم اور محکوم کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا. اس لئے کہ قرآن کی رُو سے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حکومت چلائے. (اس کی تفصیل بارہویں باب میں ملے گی) اس نظام میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے گا. لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اطاعت خواہ قوانینِ خداوندی ہی کی کیوں نہ ہو ایک عملی نظام میں ہی ممکن ہے. اسے حکومت کی مشینری کہتے ہیں. اس حکومت میں کسی ہیئتِ اجرائیہ (EXECUTIVE) کا ہونا لاینفک ہے جو ان قوانین کو مملکت میں نافذ کرے. (اسے اس نظام کا مرکز کہہ لیجئے). قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی عملی شکل اس اجرائیہ کے نافذ کردہ احکام کی اطاعت ہوگی. افرادِ معاشرہ اس مرکز کے احکام کی اطاعت

کریں گے، اور یہ مرکز ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے گا جو خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ اور جن کا وعدہ (یا ذکر) قرآن میں کیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھئے کہ قرآنی نظام کا قیام افراد اور مرکز میں ایک معاہدہ کی رُو سے ہوتا ہے۔ وہ معاہدہ یہ ہے۔

معاہدہ | اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ ...... فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ (۹/۱۱۱)

یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور مال خرید لئے ہیں بعوض جنت...... سو تم اپنی اس بیع (فروخت) پر جو تم نے خدا سے کی ہے خوش ہو جاؤ۔

اس معاہدہ "خرید و فروخت" کے چار اجزاء ہیں جو ہر بیع و شریٰ کے معاملہ میں ہونے چاہئیں۔ یعنی

(۱) مشتری (خریدار) ______ اللہ
(۲) بائع (بیچنے والے) ______ مومنین
(۳) جو شے فروخت کی گئی ______ مومنین کے جان و مال۔ اور
(۴) قیمتِ فروخت ______ جنت

ان اجزاء میں مومن اور ان کی جان و مال محسوس اجزاء ہیں جن کے متعلق ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیا ہیں۔ لیکن دوسرے دو اجزاء (یعنی خریدار ___ اللہ، اور قیمتِ خرید ___ الجنّۃ) غیر محسوس ہیں۔ ظاہر ہے کہ خرید و فروخت کا یہ معاملہ مرئی طور پر سامنے نہیں آسکتا جب تک ان دو غیر محسوس اجزاء کے متعلق اچھی طرح سے سمجھ نہ لیا جائے کہ ان سے مراد کیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کہہ دے کہ میں نے اپنی جان اور مال اللہ کے ہاتھوں بیچ رکھے ہیں تو یہ بات محض نظری یا ذہنی ہو گی۔ اس کی جان اور مال اس کے اپنے پاس ہی رہیں گے اور اس سودے کا معاملہ محض اعتقادی حد تک رہے گا۔ دوسری طرف اگر وہ کہے کہ اس کے عوض اللہ مجھے جنّت عطا کرے گا تو اس (قیمتِ فروخت) کا معاملہ بھی (جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے) اعتقاد کی حد سے آگے نہیں بڑھے گا۔ اسلام چونکہ ایک عملی ضابطۂ حیات ہے اس لئے اس میں یہ چیزیں محض نظری یا اعتقادی حد تک نہیں رہ سکتیں۔ ان کی عملی اور محسوس شکل سامنے آنی چاہیئے۔ قرآن نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ان سے عملاً کیا مقصود ہے

الجنّۃ سے مقصود | سب سے پہلے قیمتِ فروخت (یعنی الجنّۃ) کو سمجھئے۔ قرآنِ کریم نے نشوونما یافتہ ذات DEVELOPED PERSONALITY کی مرنے کی بعد کی ارتقائی حالت کو جنّت

کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن چونکہ انسانی شعور اپنی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتا کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے کوائف و احوال کیا ہوں گے اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہاں کی جنت سے متعلق تمام بیانات تمثیلی ہیں۔ سورۂ رعد میں ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ (۱۳/۳۵؛ ۴۷/۱۵)

اس جنت کی مثال جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے یوں سمجھو جیسے ایک باغ ہو جس کے نیچے پانی کی ندیاں رواں ہوں اور اس کے پھل اور آسائشیں سدا بہار۔

اس باغ کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ

عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۵۷/۲۱) نیز (۳/۱۳۳)

اس کی وسعت عرض و سماء کی وسعت کی طرح ہے۔

اس قسم کے تمثیلی بیانات کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۲/۱۷)

کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کے اعمال کے بدلے (نتیجے) میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان اس کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہے اس کی ماہیت و کیفیت کیا ہے۔

لیکن اور یہ لیکن بہت اہم ہے اُس نے، اس زندگی کو بھی جو قرآنی نظام کے مطابق اِس دنیا میں حاصل ہو، جنت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے اور اس جنتی زندگی کی ایسی تفاصیل بیان کر دی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے، اور اس کے نتائج کیا۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ عرب، جو اس پیغام کے اوّلین مخاطب تھے اور جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، ایک صحرا نشین قوم تھی ان کے نزدیک پُرفضا باغات، تازہ، شیریں، ٹھنڈے پانی کے چشمے، سایہ دار درخت، پھلوں کی افراط، دودھ اور شہد کی نہریں اور اسی قسم کی دیگر اشیاء سے بڑھ کر زندگی کی آسائشیں اور کیا ہو سکتی تھیں۔ ان کے نزدیک باغات کی اہمیت کس قدر تھی اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ نبی اکرمؐ کے مخالفین یہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ واقعی خدا کا برگزیدہ انسان اور اس کا رسول ہے تو يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (۲۵/۸) "اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جاتا یا اس کا کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ کھاتا پیتا۔" اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ تھوڑی دیر تک انتظار کرو۔ اس نظام کو متشکل ہو لینے دو۔ ایک باغ کیا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝ (۲۵/۱۰) "وہ تجھے بہت سے باغات عطا کرے گا جن کے نیچے پانی کی ندیاں جاری ہوں گی۔ اور تجھے رہنے کو محل عطا کرے گا۔"

اس مقام پر باغات کے علاوہ محلات کا بھی ذکر آیا ہے۔ عرب بادیہ نشین قوم تھی جو بالعموم خیموں میں زندگی بسر کرتی تھی۔ ان کے دائیں بائیں' ایران اور روم کی ایسی سلطنتیں تھیں جو دنیا کی عظیم تہذیبوں کی وارث تھیں۔ ان کا معیارِ زیست خانہ بدوش عربوں سے کہیں بلند تھا۔ یہ ممالک (یا کم از کم ان کا بیشتر حصہ) عنقریب' نظامِ خداوندی کے نتیجے میں' ان عربوں کے قبضے میں آنے والا تھا۔ اس لئے قرآن نے ارضی جنت کی تفاصیل میں ان کے سامانِ آرائش و آسائش کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اس پس منظر میں آپ دیکھئے کہ قرآن نے الجنۃ (یعنی جنتِ ارضی) کا ذکر کس کس انداز سے کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ حتمی اور یقینی طور پر کہتا ہے کہ ایمان و عملِ صالح کا نتیجہ اس دنیا کی حکومت و سلطنت ہوگی۔ سورۂ نور میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (۲۴/۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور خدا کے مقرر کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے ان کے لئے اللہ نے اس دنیا میں حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے جس طرح ان اقوام کو حکومت عطا کی تھی جو ان سے پہلے ہو گذری ہیں نیز یہ وعدہ کہ وہ (استخلاف فی الارض کے ذریعے) ان کے اس دین کو متمکن کردے گا جسے اس نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ انہیں خوف کی جگہ امن عطا کردے گا تاکہ وہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ اور جو لوگ اس کے بعد پھر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو یہ لوگ بے راہ رو ہوں گے[1]۔

استخلاف فی الارض

---

[1] ضمناً ان آیات سے یہ بھی واضح ہے کہ

(i) ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی اور حتمی نتیجہ استخلاف فی الارض (دنیا کی حکومت) ہوتا ہے۔

(ii) دین کے تمکن کے لئے اپنی حکومت کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ دین نام ہی اس اجتماعی نظامِ زندگی کا ہے جس میں قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہو۔

(iii) خدا کی "عبادت" اور شرک سے بچنے کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے "عبادت" کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی قوانینِ خداوندی کی محکومیت۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ چنانچہ جب انہیں اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل ہوا تو ان سے کہا گیا کہ

وَ اَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ وَ اَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ؕ (۳۳/۲۷)

اس نے تمہیں تمہارے مخالفین کی زمینوں، شہروں اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا۔ اور ان زمینوں کا مالک بھی جن پر ابھی تمہارے پاؤں بھی نہیں پڑے۔

خدا کے وعدوں کو اس طرح پورا ہوتے دیکھ کر وہ لوگ فرطِ مسرت سے جھومتے اور جذب و وجد کے عالم میں پکار اٹھتے تھے کہ

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (۳۹/۷۴)

در خورِ حمد و ستائش ہے وہ ذات جس نے اپنے ان وعدوں کو جو اس نے ہمارے ساتھ کئے تھے پورا کر کے دکھا دیا۔ اور ہمیں زمین کی حکومت عطا کر دی۔ یہ وہ الجنّۃ ہے جس میں ہر طرف ہمارا اختیار کارفرما ہے۔ کام کرنے والوں کا یہ کیسا عمدہ بدلہ ہے۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن میں "الجنّۃ" کا استعمال کس مقام پر ہوا ہے؟ اس "الجنّۃ" نے سب سے پہلے ان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو پورا کیا جس کی ان کے ہاں اس قدر کمی تھی۔ جنت کی یہ وہ پہلی خصوصیت ہے جس کا ذکر "آدم" سے ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۙ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝

(۲۰/۱۱۹-۱۱۸)

اس میں تجھے نہ بھوک کی فکر ہے نہ لباس کی، نہ پیاس کا ڈر نہ دھوپ کا۔

یعنی اس میں کھانے پینے کی چیزوں، لباس، مکان وغیرہ ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بالکل اطمینان ہوتا ہے۔ اطمینان بھی ایسا کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) "اس میں جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ"۔

بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا ہونے کے بعد آسائش و آرائش کے تمام سامان:۔

سونے کے کنگن، جواہرات سے مرصّع، ریشمی لباس (۲۲/۲۳)۔ (کھانے کی میز پر) سونے کی پلیٹیں اور پیالے لئے ہوئے گردش کرنے والے (۴۳/۷۰) اس کے بعد تفکّہاً کھانے کی چیزوں کے ڈھیر (۴۳/۷۱)۔ بیٹھنے کے لئے صوفے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالوں کو لئے گھومنے والے (خدام) باریک ریشمی ملبوسات، دبیز ریشم (کے پردے)

(۲۱-۶۷/۱۷)پسندیدہ پرندوں کا گوشت (۵۶/۲۱). تہ بہ تہ کیلے، گھنے سائے، آبشاریں. (۳۲-۲۸/۵۶).
آپ ان تفاصیل پر غور کیجئے، اور زیادہ نہیں تو صرف مدائن کی فتح پر جو مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا تھا، کتبِ تاریخ میں اس کی فہرست پر نظر ڈالیے، صاف دکھائی دے گا کہ الجنّۃ کی جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا وہ کس طرح اس سامان میں موجود تھیں. اور ایک ایران پر ہی کیا موقوف ہے، شام کے سرسبز و شاداب باغات؛ مصر کی سونا اگلنے والی زمین. عراق عجم (جو اس زمانے میں ایران ہی کا حصہ تھا) کی پُر بہار فضائیں. یہ سب کچھ اسی الجنّۃ کی مشہور تفسیر تھی جو اُن کے سامنے آگئی. پھر اس میں

لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ ○ (۳۵/۳۵)

نہ جسمانی مشقت کی تکان، نہ ذہنی اور نفسیاتی کشمکش.

چونکہ اس معاشرہ میں ہر طرف قوانینِ خداوندی کا دور دورہ تھا. اس لئے اس میں کوئی لغو بات کان میں نہیں پڑتی تھی اور ہر طرف سے سلامتی کی حیات بخش صدائیں اُبھرتی تھیں (۱۹/۶۲). اس میں سب حقیقی بھائیوں کی طرح پورے خلوص اور محبت کے ساتھ رہتے تھے (۱۵/۴۷). نہ کسی کے دل میں کوئی کدورت تھی نہ بغض و عداوت کے چھپے ہوئے جذبات. (۷/۴۳).

یہاں تک اس الجنّۃ کے صرف اس گوشے کا ذکر آیا ہے جس میں جسمانی پرورش کا سامان بافراط موجود ہوتا ہے. لیکن قرآن کی رُو سے مقصودِ حیات صرف جسمانی پرورش نہیں. حقیقی نصب العین انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما (انسانی ذات کا ارتقاء) ہے. اس لئے اس کے لئے بھی اس میں تمام اسباب و ذرائع میسّر ہوتے ہیں.

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ○ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶/۵)

ایسا چشمۂ حیات جسے خدا کے بندے اپنے اعماقِ قلب سے بہا کر لاتے ہیں. وہ ان تمام واجبات کو پورا کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہوتا ہے.

کارگہِ حیات کے اس وسیع میدان میں انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جو چاہے آگے بڑھ جائے. جو چاہے پیچھے رہ جائے (۷۴/۳۷). کسی کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی. سب کے لئے یکساں مواقع ہوتے ہیں. آگے بڑھنے والوں کی پیشانی کا نور، ان کے آگے اور دائیں (بائیں) جارہا ہوتا ہے. اور ان کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس روشنی میں اور اضافے ہوتے چلے جائیں (۶۶/۸). ارتقائی منازل کی بلندیوں پر بلندیاں ان کے سامنے آتی چلی جاتی ہیں. وہ بلندیاں جن کے نیچے سامانِ حیات، جوئے رواں کی طرح بہے چلا جاتا ہے (۳۹/۲۰).

یہ ہے وہ الجنّۃ جو قرآنی معاشرہ کے افراد کو ان کے مال و جان کے عوض بطور "قیمتِ فروخت" ملتی ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ خرید و فروخت کے اس معاملے میں جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے تیسرا جزو (یعنی قیمتِ فروخت) کا معاملہ بھی ذہنی اور قیاسی یا محض نظری اور اعتقادی نہیں۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔

اب آئیے اس معاہدے کے چوتھے رکن کی طرف۔ اس معاہدے میں کہا گیا ہے کہ مومن اپنا جان اور مال "اللہ" کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس سے عملاً کیا مراد ہے؟ مومن اپنی جان اور مال کس کے ہاتھ بیچتے ہیں؟ اور اس کے تبادلے میں انہیں کون الجنّۃ دیتا ہے؟ جن افراد کی ذات میں نشو و نما شروع ہو جاتی ہے وہ نظامِ کائنات میں خدا کے رفیق بن جاتے ہیں۔ اور انسانی دنیا میں قوانینِ خداوندی انہی کی وساطت سے نفاذ پذیر ہوتے ہیں۔ یہی وہ افراد ہیں جن کے ہاتھوں وہ ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کر رکھا ہوتا ہے (ہم نے انہیں مرکزِ نظامِ خداوندی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے)۔ لہٰذا بیع و شریٰ کے اس معاملے میں جس کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ یہ بیع (فروخت) خدا کی طرف سے (ON BEHALF OF ALLAH) اس معاشرہ کے اربابِ حل و عقد یا بالفاظِ دیگر مرکزِ نظامِ خداوندی کے ہاتھوں طے پاتی ہے۔ نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں یہ مرکز خود حضورؐ کی ذات تھی۔ لہٰذا افرادِ معاشرہ کی یہ بیع (فروخت) حضورؐ کے ہاتھوں پر ہوتی تھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے (سورۃ الفتح میں) ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸/۱۰) "اے رسولؐ! جو لوگ تیرے ہاتھ پر اپنی جانیں بیچ رہے ہیں وہ دراصل خدا کے ساتھ اپنا معاملہ کر رہے ہیں۔ معاملہ کو پختہ کرتے وقت، دیکھنے کو تو اُن کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ خدا کا ہاتھ ہوتا ہے" اس لئے کہ مرکزِ نظامِ خداوندی اس معاملہ کو اپنی ذاتی حیثیت سے طے نہیں کرتا بلکہ اسے بحیثیت نمائندۂ خداوندی طے کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ان تمام معاملات میں قرآنی نظامِ معاشرہ، خدا کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ (اسلامی نظام کے سلسلہ میں یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے جس کے متعلق ہم نظامِ سیاست و حکومت سے متعلق باب میں تفصیل سے گفتگو کریں گے)۔ اس سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب قرآن کہتا ہے فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، یا: وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (۷۳/۲۰) (اللہ کو قرضِ حسنہ دو) تو اس سے مراد کیا ہوتی ہے؟ اس سے مراد قرآنی نظام کا مرکز ہوتا ہے۔ وہی مرکز افرادِ ملت سے یہ کچھ وصول کرتا ہے۔ اور وہی اسے عالمگیر انسانیت کی بہبود کے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔

اب ہمارے سامنے بیع و شریٰ کے اُس معاملہ کے (جس سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا) چاروں اجزاء محسوس و مشہود طور پر آ گئے۔ یعنی اس معاہدہ کی رُو سے افرادِ معاشرہ اپنا جان اور مال مرکزِ نظامِ خداوندی کے سپرد کر دیتے ہیں اور وہ ان کے

اموال (اور عند الضرورت جان) سے معاشرہ کو ان خطوط پر متشکل کر دیتا ہے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ زندگی نہایت فراوانی سے ملتا ہے. اور اس کے علاوہ ان کی ذات کی نشوونما اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے. جس سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اسی طرح انہیں اس دنیا میں بھی جنت مل جاتی ہے اور بعد کی زندگی میں بھی رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (۲/۲۰۱) سے یہی مراد ہے. یہ وہ نظام ہے

رزق کی ذمہ داری

جو افرادِ معاشرہ سے، اس حتم و یقین سے کہتا ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی.

اس لئے تمہیں سامانِ زیست کے متعلق کسی قسم کی پریشانی نہیں ہونی چاہیئے. تم مطمئن رہو. نہ تم بھوکے مر سکتے ہو اور نہ تمہاری اولاد۔

یہ ہے وہ عملی طریق جس سے افراد کی عقل، سامانِ زیست کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے. اور اپنی ساری توجہ نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے وقف کر دیتی ہے. اس سے ہر فرد کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے. یوں جسم اور ذات دونوں کی پرورش کا انتظام ہو جاتا ہے — یعنی دنیا میں بھی سرفرازیاں اور آخرت میں بھی خوشگواریاں. حال بھی درخشندہ اور مستقبل بھی تابندہ — وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. یہ بہت بڑی کامیابی ہے.

قرآنی نظام کی ذمہ داریوں کا دائرہ اپنے افراد کی نشوونما تک محدود نہیں رہتا. چونکہ یہ اُس خدا کا تجویز کردہ نظام ہے جو ربّ العالمین ہے (۱/۲). یعنی تمام اقوامِ عالم کو نشوونما دینے والا. اس لئے جوں جوں اس نظام کو تقویت حاصل

ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری

ہوتی جاتی ہے. اس کا دائرۂ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے یعنی سب سے پہلے یہ نظام اپنی مملکت کے اندر بسنے والے افراد کی پرورش کی ذمہ داری لیتا ہے — خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم — اور اس کے بعد اس کی ربوبیت دیگر افرادِ انسانیہ کو محیط ہوتی چلی جاتی ہے — بلا لحاظ مذہب و ملت اور بلا تفریق رنگ و نسل — اس ربوبیت کو ساری دنیا میں عام کر دینا اس نظام کا نصب العین ہے. اس طریق سے قرآن کا یہ عظیم القدر اعلان کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (۱۱/۶)

روئے زمین پر کوئی چلنے والا (یا متنفس) ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو.

ایک حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے. قرآن نے اپنے اس اعلان میں دآبّہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو انسانوں اور حیوانوں

سب کو اپنے اندر شامل کر لیتا ہے اس لئے تمام جانداروں کے رزق کی ذمہ داری اس نظامِ ربوبیت کے سر پر عائد ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس ذمہ داری کو پورا کرتا ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس معاشرہ کے تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی خود بخود (نظامِ معاشرہ کی طرف سے) پوری ہوتی رہیں گی تو ان افراد کو کام کرنے کی ضرورت کیا ہوگی؟ اگر آپ انہیں کسی کام پر لگا بھی دیں گے تو وہ اس میں اپنی پوری محنت صرف کیوں کریں گے؟ مثلاً اگر کسی کاریگر کو معلوم ہو کہ وہ دن بھر جتنا کام کرے گا اسے

کام کرنے کا جذبہ کیا تھا

اتنی ہی اُجرت مل جائے گی تو وہ دن بھر جان مار کر کام کرے گا تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ اُجرت مل جائے۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ وہ (مثلاً) دس روپے روز کا کام کرے لیکن اس کی ضروریات دو روپے میں پوری ہو جاتی ہوں تو اسے دو ہی روپے ملیں گے۔ بقایا آٹھ روپے کسی اور کو دے دیئے جائیں گے۔ تو وہ دس روپے کا کام کیوں کرے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال معاشیات (ECONOMICS) میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو چاہتے تھے کہ رزق کی تقسیم افرادِ انسانیہ کی ضرورتوں کے مطابق ہو تاکہ جو لوگ زیادہ کمانے کے قابل نہ ہوں لیکن ان کی ضروریات زیادہ ہوں (یعنی اُن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری

معاشیات کا اہم سوال

نہ ہوتی ہوں) انہیں بھی پورا پورا سامانِ زیست ملتا جائے۔ اس کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ جو لوگ زیادہ کمانے کے اہل ہوں لیکن ان کی ضروریات کم ہوں، ان کی محنت کا فاضلہ ماحصل دیگر افراد کی ضروریات پورا کرنے کے کام میں لایا جائے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اس کے لئے تجربے بھی کئے گئے۔ (سب سے پہلے خود افلاطون (PLATO) نے اس پر تجربہ کیا تھا) لیکن وہ تجربے ہمیشہ ناکام رہے۔ اور یہی وہ ناکامیاں تھیں جن کی بنا پر ماہرینِ معاشیات اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک کسی کو اس کی محنت کے پورے کے پورے ماحصل کا مالک قرار نہ دیا جائے وہ پوری پوری محنت کبھی نہیں کرے گا۔ اسے (PRIVATE ENTERPRISE) کہتے ہیں[۱] اور یہی نظامِ سرمایہ داری (CAPATALISM) کی بنیاد ہے۔ ہمارے زمانے میں اس نظام کے خلاف کمیونزم (اشتراکیت)

اشتراکیت

نے سر اٹھایا۔ اس تحریک کے بانیوں نے غریبوں اور ناداروں کو یہ کہہ کر ابھارا کہ تم اٹھو اور دولتمندوں کی دولت چھین لو۔ چنانچہ وہ اُٹھے اور انہوں نے ان کی دولت چھین لی۔ اس سے ہنگامی طور پر انقلاب کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد اب وہاں بھی وہی سوال درپیش ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر آمادہ

---

[۱] اکنامکس میں اس کے لئے (LAISS-EZ-FAIRE) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ کاروباری معاملات میں حکومت دخل انداز نہ ہو۔

کس طرح کیا جائے۔ وہ کون سا جذبۂ محرکہ پیدا کیا جائے جس سے وہ جان مار کر کام کریں اور اس کے ماحصل سے صرف اتنا لیں جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب مملکت کے حوالے کر دیں۔ جس فلسفۂ زندگی پر کمیونزم کی بنیاد اٹھی ہے اس میں طبیعی زندگی کے علاوہ انسان کی کسی اور زندگی کا تصور ہی نہیں' اس لئے طبیعی زندگی کے قوانین کے علاوہ اور کسی قانون اور قدر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا' انہیں وہ جذبۂ محرکہ کہیں سے نہیں مل رہا۔ اس لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ لوگوں سے زبردستی کام لیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریتوں نے اپنے ہاں (WELFARE STATE) کا تصور پیدا کیا ہے جس میں مملکت ضرورتمندوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کرنے کی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک مملکت کے پاس فراواں

روس اور جمہوریتیں

دولت نہ ہو وہ لوگوں کی ضروریات کیسے پوری کرے گی؟ اس کے لئے انہوں نے (TAXATION) پر زور دے رکھا ہے۔ چنانچہ اب ان ممالک میں حالت یہ ہے کہ ایک شخص کی آمدنی کا قریب اسی فیصد مختلف ٹیکسوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قدر ٹیکس بطیبِ خاطر کوئی نہیں دیتا۔ اسے حکومت قانون کے زور پر وصول کرتی ہے۔ اور لوگ قانون سے گریز کی راہیں نکالنے کے عجیب و غریب حیلے سوچتے اور وضع کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا' یہاں بھی وہی استبداد ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ کمیونزم میں یہ استبداد بے نقاب سامنے آتا ہے اور جمہوریتوں میں قانون کے نگاہ فریب پردوں میں۔ بات دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ چونکہ کوئی نظام جو استبداد پر مبنی ہو زیادہ دنوں تک چل نہیں سکتا۔ اس لئے کمیونزم کی طرح جمہوریتوں کے قصرِ حکومت میں بھی دراڑیں پڑتی چلی جارہی ہیں۔

اس کے برعکس قرآن کو لیجئے۔ اس کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ

(i) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ اسے ذات بھی دی گئی ہے۔

(ii) انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

(iii) انسانی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ وہ دیگر افرادِ انسانیہ کی نشوونما کے لئے کیا کچھ کرتا اور دیتا ہے۔ کوئی فرد دوسروں کی پرورش کے لئے جس قدر زیادہ دے گا' اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی۔

قرآنی نظام اُن افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو اس فلسفۂ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی افراد کو ان کی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے مستغنی کر دیا جائے گا تو وہ دن رات اس کوشش میں لگے رہیں گے کہ زیادہ سے زیادہ کمائیں' تاکہ دوسروں کی زیادہ سے زیادہ پرورش ہو سکے۔ اور اس طرح ان کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو۔ یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس سے انسان زیادہ سے زیادہ محنت کے بعد اپنا سب کچھ بطیبِ خاطر' دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے۔ اس میں نہ کسی استبداد کی ضرورت ہوتی ہے نہ مہمیز کی۔ استبداد تو ایک طرف وہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) دوسروں سے شکریہ تک

کے بھی خواہاں نہیں ہوتے۔

پروفیسر (HAWTREY) نے کہا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرے۔ (QUOTED BY E.H. CARR IN "THE NEW SOCIETY" : P-60)

جو جذبۂ محرکہ قرآنی نظام مہیا کرتا ہے آپ اس کا مقابلہ دیگر نظامہائے معیشت (ECONOMIC ORDERS) سے کیجئے اور سوچئے کہ کیا کوئی نظام، قرآنی نظام کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ آپ جوں جوں اس نکتہ پر غور کریں گے یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی کہ اس اہم مسئلہ کا حل قرآنی فلسفۂ زندگی کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ جس دن اقوامِ عالم نے اس حقیقت کو سمجھ لیا، کاروانِ انسانیت نجات و سعادت کی راہ پر چل پڑے گا۔

تصوّف اور اسلام

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک ضمنی نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ انسانی زندگی کا مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے اور اس کا طریق وہ جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ تصوّف کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ اس کا مقصد "تزکیۂ نفس" یا انسان کی "روحانی ترقی" ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ طریقہ یہ بتاتا ہے کہ انسان دنیاوی علائق سے کنارہ کشی اختیار کرتا چلا جائے اور اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو فنا کر دے۔ "تزکیۂ نفس" سے مراد ہے روح کو مادی آلائشوں اور کثافتوں سے پاک کرنا اور اس کا طریق یہ ہے کہ انسان مادی دنیا سے دُور بھاگے۔

تصوّف کی اصل کیا ہے اور اس کی تاریخ کیا؟ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ افلاطونی نظریۂ حیات ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اسے قرآن سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ قرآنی فلسفۂ حیات اور تصوّرِ زندگی کی بالکل ضد ہے۔ یہی وہ مدعیانِ تزکیۂ نفس ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ‎(۴/۴۹)

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو تزکیۂ نفس کے مدعی ہیں (ان سے کہہ دو کہ تزکیۂ نفس اس طرح نہیں ہوتا) یہ صرف اسے حاصل ہو سکتا ہے جو اسے قرآن کے قانون اور ضابطۂ حیات کے مطابق حاصل کرنا چاہے۔ جو اسے اس طریق سے حاصل کرنا چاہے گا۔ اس کی سعی و عمل کے نتائج میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

دوسری جگہ ہے۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ؀ (۵۳/۳۲)

تم خود ہی یہ خیال نہ کر بیٹھو کہ تمہارے نفس کا تزکیہ ہو رہا ہے خدا جانتا ہے متقی کون ہے۔

یہاں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ جس کا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو اُسے متقی کہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر بتا دیا کہ متقی کون ہے۔

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸)

جو اپنا مال بلکہ سب کچھ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رُو سے "تزکیہ نفس" اس کا ہوتا ہے جو پوری محنت سے کمائے اور پھر اپنا سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا چلا جائے۔ "تزکیہ نفس" اس کا نہیں ہوتا جو دوسروں کی کمائی پر زندہ رہے۔ روحانی ترقی کے مدعی کتنا ہی دنیا سے دُور بھاگیں جب تک وہ زندہ ہیں انہیں اپنے جسم کی پرورش کے لئے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے جسے (ظاہر ہے کہ) دوسرے لوگ پورا کرتے ہیں۔ جو شخص خود اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج ہو اس کا تزکیہ نفس کس طرح ہو سکتا ہے۔

پھر، قرآن کی رُو سے تزکیہ نفس انسانی معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے ہوتا ہے۔ انفرادی زندگی بسر کرنے سے نہیں ہوتا۔ اس لئے جو شخص خانقاہوں کے خلوت کدوں میں تزکیہ نفس تلاش کر رہا ہے۔ وہ قرآنی راستے سے مخالف سمت کی طرف جاتا ہے۔ یہی وہ رہبانیت ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۷)

اسے انہوں نے اپنے ذہن سے وضع کر لیا ہے۔ ہم نے اسے ان پر لازم نہیں ٹھہرایا۔

تزکیہ نفس (انسانی ذات کی نشوونما) صرف نظامِ ربوبیت کے قیام سے ہو سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمانا اور اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کے سپرد کر دینا۔ وہ نظام اس میں سے ان افرادِ کاسب (کمانے والوں) کی ضروریاتِ زندگی بھی پوری کرے گا۔ اور فاضلہ دولت دیگر افرادِ انسانیہ کی پرورش کے لئے صرف کرے گا۔ یہ نظام خدا کی صفتِ ربّ العالمین کا عملی مظہر ہوتا ہے۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآن کے پیش کردہ نظام کا ماحصل یہ ہے کہ انسان، فطرت کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ حد تک مسخر کرے، اور ان قوتوں کے ماحصل کو نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے عام کر دے۔ اس میں انسان اور انسان میں کسی قسم کی تخصیص اور تفریق نہ ہو۔
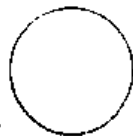
باب یازدہم

نظامِ ربوبیت کے عقلی دلائل

گزشتہ باب میں بتایا جاچکا ہے کہ نظامِ ربوبیت اس جماعت کے افراد قائم کرتے ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس نظام کے قیام سے ان کی ذات کی نشوونما ہوسکتی ہے۔ اور ذات کی نشوونما ہی مقصودِ حیات ہے۔ لیکن قرآن اس نظام کی تائید میں عقلی دلائل بھی پیش کرتا ہے تاکہ اس جماعت کے افراد بھی اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھیں اور اسے دوسروں کے سامنے بھی بدلائل و شواہد پیش کرسکیں۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ وہ اپنی ہنرمندی اور چابکدستی، استعداد اور صلاحیت کی بنا پر کماتا ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اس پر کسی دوسرے کا حق نہیں ہوسکتا۔ اُممِ سابقہ کی سرگزشت میں

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد

قرآن نے (بنی اسرائیل کے) قارون کو اسی نظام (سرمایہ داری) کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ وہ اس تمام (فاضلہ) دولت میں جو اس نے یوں جمع کر رکھی ہے اوروں کا حق کیوں نہیں سمجھتا تو اس نے جواب دیا کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (۲۸/۷۸) یہ دولت مجھے میری ہنرمندی کی بدولت ملی ہے۔ میں نے اسے اپنے علم اور ذاتی استعداد سے کمایا ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کے حق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے کہ یہ جواب ایک قارون ہی سے مختص نہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامل جہاں بھی ہوں ان کی طرف سے یہی جواب ملے گا۔ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ۔ ان لوگوں کی یہی ذہنیت ہے جو اصل مصیبت کا باعث ہے۔ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۹/۴۹) لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ یہ ذہنیت کس قدر غلط اور ان کا یہ دعویٰ کس طرح بے بنیاد ہے۔ دیکھئے کہ قرآن اس کے لئے دلائل کیا دیتا ہے۔

آپ غور کریں گے تو بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسان کی کمائی حسبِ ذیل عناصر کی مجموعی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یعنی

(i) دماغی صلاحیت جو ہر بچے کو پیدائشی طور پر ملتی ہے۔

(ii) ابتدائی ماحول، تعلیم، تربیت کے اثرات۔

(iii) صلاحیت اور استعداد کے استعمال کے مواقع اور

(iv) انسان کی ذاتی محنت۔

ان عناصر میں سے پہلا عنصر — یعنی دماغی صلاحیت — جو اس ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ فطرت کی طرف سے وہبی طور پر (مفت، بطورِ عطیہ) ملتی ہے۔ اسے نہ اُس فرد نے قیمتاً خریدا ہوتا ہے۔ نہ یہ قیمتاً مل سکتی ہے۔ دوسرے

قرآن کا فیصلہ

اور تیسرے عناصر کا تعلق اس معاشرہ سے ہے جس میں اُس بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ اس پر بھی اس کا ذاتی اختیار کچھ نہیں ہوتا۔ صرف چوتھا عنصر — یعنی انسان کی ذاتی محنت — ایسی چیز ہے جسے وہ فرد اپنے اختیار و ارادے سے صَرف کرتا ہے۔

اس مختصر سے تجزیئے سے ظاہر ہے کہ ایک فرد جو کچھ کماتا ہے اس میں اُس کا حق صرف اتنے حصے پر ہو سکتا ہے جو اس کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہو۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)

انسان صرف اسی کا حق دار ہے جس کے لئے وہ محنت اور کوشش کرے[1]۔

اس بنیادی اصول کی رُو سے قرآن محنت اور سرمایہ کی اس نزاع کا فیصلہ کر دیتا ہے جو آغازِ تاریخ سے آج تک انسانی معاشرہ کے لئے وجہِ اضطراب اور باعثِ ہزار فساد بنا رہا، اور بن رہا ہے۔

جہاں تک مختلف افراد میں دماغی استعداد کے فرق کا تعلق ہے، قرآن کہتا ہے کہ یہ اختلاف تقسیمِ کار کے لئے ہے۔

اختلافِ استعداد کیوں ہے

معاشرہ میں مختلف نوعیتوں کے کام ہوتے ہیں جو مختلف نوعیتوں کی استعداد چاہتے ہیں۔ اگر مختلف افراد کی استعداد میں فرق نہ ہو تو معاشرہ

---

[1] یہ اصول انسان کو یہ بات سمجھانے کے لئے ہے کہ سرمایہ کے زور پر دوسروں کی کمائی پر قبضہ کر لینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ورنہ جیسا کہ پچھلے ابواب میں بتایا جا چکا ہے قرآنی نظام میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اس لئے اس میں محنت اور سرمائے کی نسبت سے تقسیمِ رزق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کا کاروبار نہ چل سکے۔ اس نے کہا ہے کہ

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳/

افراد میں اختلافِ استعداد اس لئے ہے تاکہ ایک دوسرے سے مختلف نوعیتوں کے کام لئے جاسکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سائنٹیفک تحقیقات سے ان نقائص کو رفع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جن کی بنا پر ایک بچے کی دماغی صلاحیتوں میں کمی رہ جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ ایسا زمانہ آجائے جب بچوں کی ذہنی استعداد میں کچھ زیادہ فرق نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان ان امور میں اس قدر ترقی کرے گا تو اس معاشرہ کا معاشی نقشہ مختلف ہوجائے گا۔ لیکن جب تک استعداد کا اختلاف باقی ہے (اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ فرق بہرحال باقی رہے گا۔ انسان، دھات کی ڈھلی ہوئی مشین کا نام نہیں کہ ایک مشین اور دوسری مشین میں قطعاً کسی قسم کا فرق نہ ہو۔ یہ جیتا جاگتا، اختیار و ارادہ کا حامل انسان ہے جو سینکڑوں قسم کے عناصر سے اثر پذیر ہوتا ہے)۔ قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ یہ اختلاف صرف تقسیمِ کار کے لئے ہے، تقسیمِ رزق کے لئے نہیں۔ رزق کی تقسیم ضرورت کے لحاظ سے ہوگی۔ جن لوگوں کو کسبِ رزق کی زیادہ استعداد حاصل ہے وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ جس قدر کمائیں تمام کا تمام انہی کا حق اور حصہ ہے۔ ان کی کمائی کی زیادتی ان عناصر کی بنا پر ہے جن کے حصول میں ان کا ذاتی اختیار کچھ نہ تھا۔ اس لئے وہ ان عناصر کے ماحصل میں سے اپنی ضرورت کے مطابق لینے کے حق دار ہیں۔ باقی ان لوگوں کا حق ہے جو کم ذہنی استعداد کی بنا پر ان کے زیرِ ہدایت کام کرتے ہیں۔ سورۂ نحل میں ہے:۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۱۶/۷۱)

اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر اکتسابِ رزق کی استعداد میں فضیلت دی ہے۔ جنہیں یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ زیادہ رزق کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ماتحت کام کرتے ہیں تاکہ یہ سب رزق میں برابر نہ ہوجائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ انہیں استعداد کی زیادتی خدا کی طرف سے بطور نعمت ملی ہے۔ ان کے ذاتی کسب و ہنر کی پیدا کردہ نہیں۔

حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳) جو کچھ انہیں بطور نعمت ملا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اس لئے جو کچھ اس بنا پر حاصل ہوتا ہے وہ بھی اللہ کا ہونا چاہیئے۔ نہ کہ انسان کی ذاتی ملکیت۔

قرآن نے اس حقیقت کو (کہ رزق کی تقسیم ضرورت کے لحاظ سے ہونی چاہیئے نہ کہ کمانے کے اعتبار سے) سورۂ نحل کی آیت (۱۶/۷۱) کے سیاق و سباق کی آیات میں نہایت دل نشین انداز سے واضح کیا ہے۔ جو کچھ اس نے کہا ہے اس

کا ماحصل یہ ہے کہ تم اپنے گھر کی حالت پر غور کرو۔ اس میں بچے بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ کم کمانے

گھر کی مثال

والے بھی۔ اب دیکھو کہ گھر میں سامانِ زیست کی تقسیم' ہر فردِ خاندان کی ضرورت کے اعتبار سے ہوتی ہے یا کمائی کے لحاظ سے۔ اگر وہ کمائی کے لحاظ سے ہو تو بچوں کو بالکل محروم رکھا جانا چاہیئے لیکن تم ایسا نہیں کرتے۔ بچوں کی ضروریات سب سے پہلے پوری کرتے ہو۔ اسی طرح بوڑھے بزرگوں کی بھی۔ سو جو اصول تم اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ملحوظ رکھتے ہو اسے اپنے معاشرے (اور عالمگیر انسانیت) میں رائج کیوں نہیں کرتے؟ وہاں تقسیمِ رزق' ضروریات کی بجائے کمائی کی نسبت سے کیوں نہیں کرتے ہو؟ یہ اپنوں اور غیروں کا فرق تمہاری تنگ نظری کا پیدا کردہ ہے۔ خدا کا نہیں۔ خدا تمام نوعِ انسانی کے لئے "بزرگ خاندان" (ربّ العالمین) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا قانون یہ ہے کہ رزق کی تقسیم تمام افرادِ انسانیہ میں' ضرورت کے لحاظ سے کی جائے' نہ کہ کمائی کی نسبت سے۔

ذرائع پیداوار

اکتسابِ رزق میں ایک اور عنصر بھی شامل ہوتا ہے جسے ذریعہ پیداوار (SOURCE OF PRODUCTION) کہتے ہیں۔ قرآن اس باب میں ارض (زمین) کو بنیادی حیثیت دیتا ہے (اور اس کی حیثیت ہے بھی بنیادی) نزولِ قرآن کے زمانہ میں کارخانہ داری (INDUSTORY) کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے اس نے اس کا خصوصیت سے ذکر نہیں کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کارخانہ داری (صنعت) کی بنیاد بھی اسی خام پیداوار پر ہے جو زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جس اصول کا اطلاق ارض پر ہوگا اسی کا اس کی فرعات پر بھی ہوگا۔

زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی

ارض کے سلسلہ میں قرآن نے اصولاً بتا دیا ہے کہ اسے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰)۔ یہ معاش حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ (۱۵/۲۰)

اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اور ان کے لئے جنہیں تم رزق نہیں دیتے سامانِ معیشت پیدا کیا ہے۔

اس میں تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لئے سامانِ معیشت ہے۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۷۹/۳۳) اس سے تم تمتع حاصل کر سکتے ہو۔ یعنی فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ ذاتی ملکیت قرار نہیں دے سکتے۔ فطرت کی طرف سے جس قدر اسبابِ زیست بطور نعمت ملے ہیں (مثلاً ہوا' پانی' روشنی' حرارت وغیرہ) انہیں تمام انسانوں کی ضروریات کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ ان پر "ملکیت" صرف خدا کی ہے۔ جو شخص ان پر اپنی "ملکیت" کا دعویٰ کرتا ہے وہ خدا کا ہمسر بنتا ہے۔ اس

حقیقت کو قرآن نے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِيْهَا وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ (۴۱/۹-۱۰)

ان سے کہو کہ کیا تم خدا (کی خدائی) سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو مراحل میں (اس طرح) پیدا کیا (کہ وہ تمہارے بسنے کے قابل ہو گئی) خدا نے یہ اس لئے کیا کہ تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہوتی رہے لیکن تم خدا کے ہمسر تراشتے ہو!

اس ربوبیتِ عامہ کے لئے اس نے زمین کے اندر سے پہاڑوں کو ابھارا (تاکہ وہ آب رسانی کا ذریعہ بن سکیں) اور زمین میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔ پھر موسموں کے تغیرات سے اس میں چار فصلوں کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

لہٰذا اسے (زمین کو) تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ (کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بن جانا چاہیئے۔)

اس نے جس طرح دوسرے شعبوں کے متعلق کہا تھا کہ رزق میں تمہارا حصہ اتنا ہی ہے جتنی تم محنت کرو۔ اسی طرح اس نے زمین کے سلسلے میں بھی کہہ دیا کہ اس کی پیداوار میں مختلف عناصر و قویٰ شامل ہوتے ہیں۔ تم ان پر غور کرو گے تو یہ حقیقت خود بخود سامنے آجائے گی کہ اس میں تمہارا حصہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ اور "خدا" کا کس قدر۔ سورۂ واقعہ میں اس حقیقت کو بڑے شاداب انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ "کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے جو تم بوتے ہو؟" تم زمین میں ہل چلاتے ہو اور تخم ریزی کرتے ہو اس کے بعد۔ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ کیا اُس دانے (بیج) کو فصل میں تم تبدیل کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اگر ہمارا قانونِ مشیت یوں نہ ہوتا، دوسری طرح ہوتا، تو ہم اسے چورا چورا کر دیتے۔ اور پھر تم ششدر اور حیران رہ جاتے۔ اور غم و اندوہ سے پکار اٹھتے کہ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ۔ ہم پر یہ سب چٹی پڑ گئی۔ پیداوار کا ملنا تو ایک طرف، ہم بیج کے دانوں سے بھی محروم ہو گئے۔

اس سے آگے بڑھو اور اس پانی پر غور کرو جس پر زیست کا دارومدار ہے۔ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ۔ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم برساتے

ہیں لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اگر ہمارا قانونِ مشیّت یوں نہ ہوتا جس طرح وہ اب کارفرما ہے بلکہ دوسرے انداز کا ہوتا تو ہم اسے (سمندر کے پانی کی طرح جہاں سے اُٹھ کر وہ بادلوں کی شکل میں تبدیل ہوجاتا ہے) سخت نمکین بنا دیتے تو نہ تم اسے پی سکتے۔ نہ ہی اس سے کھیتی اگتی سو تم اس کی بھی قدر شناسی نہیں کرتے؟

اور آگے بڑھو۔ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ۔ کیا تم نے اس آگ پر بھی غور کیا ہے جسے تم روشن کرتے ہو اور جس سے زندگی کی حرارت قائم رہتی ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ۔ کیا ان درختوں کو جن کی لکڑیوں سے یہ آگ جلتی ہے تم نے اگایا یا ہم اگاتے ہیں!

اگر تم ان مختلف چیزوں پر جو زندگی کی اساس ہیں غور کرو گے تو یہ حقیقت تم پر کھل جائے گی کہ یہ سب خدا کی طرف سے بطور عطیہ ملتی ہیں۔ اس میں تمہارے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں۔ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً۔ یہ از خود موجود رہتی ہیں۔ تمہاری سعی و کاوش کی رہینِ منت نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا نے انہیں بلا مزد و معاوضہ کیوں دیا ہے؟ ان سے مقصد کیا ہے؟ مقصد ہے: مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ۔ تاکہ یہ بھوکوں کے لئے رزق کا سامان بن جائیں۔ یہ خدا کی رب العالمینی کی ذمہ داری کو پورا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝ (۵۶/۷۴-۶۳) سو تمہیں چاہیئے کہ خدا کی ربوبیتِ عظمیٰ کے پروگرام کی تکمیل کے لئے پوری طرح جدّوجہد کرو۔ یہ ایک مشترکہ کاروبار (BUSINESS) ہے جس میں سرمایہ خدا کا ہے۔ اور محنت تمہاری۔ اس کاروبار کے "منافع" (پیداوار) کو اسی نسبت سے بانٹ لو۔ اپنی محنت کا حصہ تم لے لو۔ اور "سرمایہ" کا حصہ خدا کو دے دو۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ خدا کا حصہ کیسے دیں۔ اس لئے وہ خود تو سامنے آتا نہیں۔ اس کے لئے خدا نے کہہ دیا ہے کہ ہمارا حصہ ان بھوکوں کو دے دو جن کی ضروریات زیادہ ہیں۔

اقبالؒ نے انہی آیات کے مضمون کو ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار　　خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں　　(بالِ جبریل صلا ۱۶)

یہ سب رِزْقًا لِّلْعِبَادِ (۵۰/۱۱) "خدا کے بندوں کے لئے سامانِ زیست ہے۔" اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّ نُفُوْرٍ ۝ (۶۷/۲۱)

(ان سے پوچھو) کہ اگر خدا رزق پیدا کرنا بند کردے تو وہ کون سی قوت ہے جو تمہیں سامانِ زندگی دے سکے؟ لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ یہ (اسباب و وسائل رزق کو اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر) سرکشی اور نفرت کے جذبات میں سرمست موج در موج آگے بڑھے چلے جاتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے:

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِهٖۤ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا ۝ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ۝ وَّ زَیْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ۝ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ ۝ (۲۴—۳۲/۸۰)

انسان کو چاہئیے کہ ذرا اپنے کھانے کی چیزوں پر غور کرے۔ ہم پانی برساتے ہیں جیسا کہ اسے برسانے کا حق ہے۔ پھر ہمارا قانون ہے جو زمین کو شق کر کے اس میں سے کونپل باہر نکالتا ہے۔ پھر اس سے اناج، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجوریں، گھنے باغات، پھل اور چارہ پیدا کرتا ہے۔ یہ سب تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے استعمال کی چیزیں ہیں۔

یہ سب اشیائے خوردنی تمہارے اور تمہارے جانوروں کے استعمال کے لئے ہیں۔ لیکن تم میں اور جانوروں میں ایک بیّن فرق ہے۔ جانوروں کی یہ حالت ہے کہ جب وہ پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں تو بقایا چارہ کو اٹھائے اٹھائے نہیں پھرتے۔ وہ ذخیرہ نہیں کرتے۔ وہ رزق کو روک نہیں رکھتے تاکہ ضرورتمندوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ ۖ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (۶۰/۲۹)

اور زمین میں چلنے والے (حیوانات) کتنے ہی ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ انہیں بھی رزق دیتا ہے۔ اور تمہیں بھی۔ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

لیکن انسان ہیں کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے زیادہ ہو اس کا ذخیرہ کرتا ہے تاکہ اس سے مال و دولت جمع کرے۔ یہی بنیاد ہے نظامِ سرمایہ داری کی جس سے انسان دنیا میں جہنم کی آگ بھڑکاتا ہے پھر اس میں خود بھی جلتا ہے اور دوسروں کو بھی جلاتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ

بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ (۹/۳۴)

جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ (نوعِ انسان کی بہبود) کے لئے کھلا نہیں رکھتے ؛ تو انہیں دردناک عذاب کی اطلاع دے دے۔ جس دن دھات کے ان سکوں کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھ کو داغ دیا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا سو اب اس ذخیرہ اندوزی کا مزہ چکھو۔

نظامِ سرمایہ داری شر ہے

اس نظام کو (جس میں فاضلہ سامانِ زیست کو جنس یا روپے کی شکل میں روک کر رکھا جاتا ہے) قرآن بُخل کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ یہ نظام خیر GOOD نہیں، شر EVIL ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (۳/۱۸۰)

جو لوگ اس سامانِ زیست کو جسے اللہ نوعِ انسانی کی معاشی سہولتوں کے لئے عطا کرتا ہے روک رکھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھ لیں کہ ان کا یہ طرزِ عمل موجبِ خیر ہے، نہیں ـــ یہ ان کے لئے شر ہے۔ جب اس غلط نظامِ معیشت کے نتائج برآمد ہوں گے تو یہ ذخیرہ کردہ مال ان کے گلے کا ہار ہو جائے گا۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کا اللہ کو علم ہے۔

وہ کہتا ہے کہ یہ نظام اور اس کی حامل قوم دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ نظام تباہ ہو کر رہے گا۔ اس کی حامل قوم کی جگہ دوسری قوم آئے گی جو اس نظام سے مختلف نظام کی حامل ہو گی۔

هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝ (۴۷/۳۸)

تم وہ ہو جن سے کہا جاتا ہے کہ تم (اپنی فاضلہ دولت کو) خدا کی راہ (نوعِ انسانی کی رُبوبیّت) کے لئے کُھلا رکھو۔ لیکن تم میں سے وہ بھی ہیں جو اُسے روک کر رکھتے ہیں۔ سو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو اس طرح دوسروں کو

سامانِ رزق سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو (زندگی کی مستقل شادابیوں سے محروم) رکھتا ہے۔
اللہ کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ وہ جس راستے کی طرف تمہیں
بلاتا ہے اس میں خود تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اگر تم اس راستے سے گریز کی راہیں اختیار کرو گے تو یاد رکھو وہ تمہاری
جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جن قوموں نے اپنے ہاں سرمایہ دارانہ نظام کو رائج کیا وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ وہ قوت اور دولت میں تم سے بڑھ کر تھیں (۲۱/۱۱)۔ جو حشر ان کا ہوا وہی تمہارا ہو گا۔ اس لئے کہ غلط نظامِ زندگی ہر جگہ ایک جیسا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ صحیح نظامِ زندگی یہ ہے کہ تم اکتسابِ رزق کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت کرو۔ اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رکھ لو اور باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دو۔

قُلِ الْعَفْوَ

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۝ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)

تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔

اس لئے کہ سامانِ زیست زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ہے نہ کہ ذخیرہ کرنے اور اس طرح دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے ہے۔

یہ ہے وہ نظامِ زندگی جسے قرآن تجویز کرتا ہے۔ لیکن وہ اس نظام کو اس مکمل اور آخری شکل تک بتدریج لے جاتا ہے۔ قرآن میں صدقہ، خیرات، وراثت وغیرہ کے احکام اسی عبوری دور سے متعلق ہیں جب یہ نظام ہنوز اپنی آخری شکل

عبوری دور کے احکام

میں متمکن نہ ہوا ہو۔ اس عبوری دور کے احکامات میں بھی آپ دیکھئے کہ قرآن کس طرح بتدریج، غیر شعوری طور پر معاشرہ کو مکمل نظامِ ربوبیت کی طرف لئے جاتا ہے۔

صدقات وخیرات، والدین واقربین سے احسان، وراثت میں ترکہ کی تقسیم سے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے چلے جانا، قرضہ دینے میں ربو کی ممانعت، قرضہ کی واپسی میں مقروض کی ہر طرح کی رعایت، دولت کے متعلق حکم کہ وہ اوپر کے طبقے میں ہی گردش نہ کرتی رہے (۵۹/۷)۔ قرآن ایک طرف ان احکام کی رُو سے ربوبیتِ عامہ کی راہیں صاف کرتا چلا جاتا ہے اور دوسری طرف نظامِ ربوبیت کے قیام کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کئے جاتا ہے۔ اسی طرح منفی اور مثبت، سلبی اور ایجابی طریق سے اپنے نظام کو متشکل کر دیتا ہے۔

جب یہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہو جاتا ہے تو پھر نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے نہ عبوری احکام کی

ضرورت۔ جو اپنا سب کچھ (زائد از ضرورت) خدا کی راہ میں دے دے اس سے یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی کہ وہ اپنے مال میں سے اتنے فیصد "زکوٰۃ" دے۔ یہی وجہ تھی کہ نبیٔ اکرمؐ نے ساری عمر زکوٰۃ نہیں دی۔ (کیونکہ حضورؐ فاضلہ دولت اپنے پاس رکھتے ہی نہ تھے) نہ ہی آپؐ نے کوئی چیز بطور ترکہ چھوڑی جسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔ یہ اسلام کی آخری اور مکمل شکل تھی جسے نبیٔ اکرمؐ نے اپنے اسوۂ حسنہ میں پیش کر دیا اور جس تک امت کو بتدریج پہنچانا مقصود تھا۔ اس نظام میں نوعِ انسانی کی نجات وسعادت کا راز مضمر ہے۔ نجات اس جہنم سے جس میں انسانیت غلط نظامِ زندگی کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کے حاملین کی مفاد پرستیاں کچھ ہی کیوں نہ کرلیں یہ انقلاب آکر رہے گا۔

إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ (۴۰/۵۹)

اُس دَور میں "جس طرح خدا کی بادشاہت آسمانوں پر ہے اسی طرح زمین پر بھی اس کا تختِ اجلال بچھے گا۔" اس وقت انسان اس حقیقت کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھ لے گا کہ

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳/۸۴)

"بیشک خارجی کائنات میں بھی اسی کا اقتدار و قانون کارفرما ہے اور انسانوں کی دنیا میں بھی اسی کا قانون۔"

یہ ہے اسلام کا منتہیٰ ومقصود۔ یعنی نظامِ ربوبیّت کا علیٰ وجہ البصیرت قیام۔ اِس نظام کی بنیاد اس آئیڈیالوجی (ایمان) پر ہے جس کا ذکر سابقہ ابواب میں آچکا ہے، اور یہی وہ بنیادی فرق ہے جو اسے مغرب کی جمہوریتوں اور روس کے اشتراکی نظام سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔
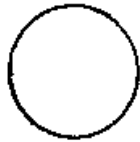
بابِ دوازدہم

سیاسی نظام

جب انسانوں نے مل جُل کر رہنا شروع کیا تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ اس ٹکراؤ سے باہمی تنازعات پیدا ہوئے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس بیدار ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے یہ ٹکراؤ پیدا نہ ہو اور اگر ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو باہمی کشمکش اور تنازعات کا فیصلہ عمدگی سے ہو جائے تاکہ معاشرہ فساد اور جنگ و جدل سے محفوظ رہے۔ اس سے نظامِ سیاست کے تصور کی ابتداء ہوئی۔ ابتداء ہوئی تو اس ضرورت کے ماتحت لیکن جن لوگوں نے جھگڑے نپٹانے اور فیصلے کرانے کا کام اپنے ذمہ لیا، انہوں نے محسوس کیا کہ دوسروں سے اپنا حکم منوانے میں بڑی لذت ملتی ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسی تدابیر سوچنی شروع کیں جن سے ان کے ہاتھ میں آیا ہوا اقتدار چھننے نہ پائے۔ اس سے معاشرہ میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک طبقہ وہ جو دوسروں سے اپنا حکم منواتا تھا اور دوسرا وہ جو ان کا حکم مانتا تھا۔ بعض اوقات حکمران طبقہ سے اس کا اقتدار اور اختیار چھیننے کے لئے کوئی دوسرا فریق کھڑا ہو جاتا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ محکوم طبقہ حکمران طبقہ کے خلاف سرکشی پر آمادہ ہو جاتا۔ آپ غور کیجئے تو انسانیت کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی داستان نظر آئے گی۔ یعنی

حاکم و محکوم کی کشمکش

(i) حکمران طبقہ کی کوشش کہ ان کے اقتدار و اختیار کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائیں۔

(ii) فریقِ مقابل کی خواہش کہ وہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے۔

(iii) محکوم طبقہ کی سرکشی اور حکمران طبقہ کی کوشش کہ انہیں دبا کر رکھا جائے۔

(iv) اور اربابِ فکر و بصیرت کی یہ کاوش کہ ایسی کون سی تدبیر کی جائے جس سے معاشرہ میں سیاسی نظام بھی قائم رہے اور حاکم و محکوم میں کشمکش بھی نہ پیدا ہونے پائے۔

قبل اس کے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن کریم نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس داستان کے اہم ٹکڑوں کو سامنے لایا جائے۔ اور یہ بھی دیکھا جائے کہ اربابِ فکر و بصیرت نے اس باب میں کیا کیا کوششیں اور کاوشیں کی ہیں۔

قبائلی نظامِ حکومت

شروع شروع میں انسان قبائلی زندگی بسر کرتا تھا یعنی ایک خاندان کے افراد مل جُل کر رہتے تھے۔ اسے ان کا قبیلہ کہا جاتا تھا۔ قبیلہ کا بزرگ، واجب الاحترام سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے باہمی نزاعات کے فیصلے کرنے کا فریضہ اسی کا ذمہ تھا۔ اس کا فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع تھا۔ رفتہ رفتہ ان "بزرگانِ خاندان" کے دل میں بھی جذبہ حکومت نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں اور وہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے اور پائیدار بنانے کی تدابیر سوچنے لگے۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ بزرگوں کی اطاعت ہر حالت میں فرض ہے۔ یعنی بچوں کے لئے ہی نہیں، بلکہ انسان عمر کے کسی حصے میں بھی کیوں نہ ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام معاملات کے فیصلوں کے لئے بزرگوں کی طرف رجوع کرے۔ بزرگوں کے یہی فیصلے، رفتہ رفتہ، قبائلی رسوم و رواج کی شکل اختیار کر لیتے تھے جن سے انحراف، سخت جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح، زندہ اور مردہ، دونوں قسم کے بزرگوں کی اطاعت، ایسی پابندی بن جاتی تھی جس سے کوئی شخص روگردانی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ حکومت کی اوّلین شکل تھی۔

خداوندی اختیارات کا عقیدہ

انسان کی ابتدائی زندگی میں مذہبی پیشواؤں (PRIESTS) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ (اب بھی جہاں جہاں جہالت اور توہم پرستی کا دَور دَورہ ہے، مذہبی پیشواؤں کی پرستش ہوتی ہے) وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا ان کے نائب تصور کئے جاتے تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کا تصور تک بھی دل میں نہیں لا سکتا تھا۔ ان مذہبی پیشواؤں نے عوام کی اس عقیدتمندی کا فائدہ اٹھایا اور اپنے دائرۂ اقتدار کو پرستش گاہوں کی چار دیواری سے آگے بڑھا کر، دنیاوی حکومت کے ایوانوں تک لے گئے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ خداوندی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کے حامل ہیں۔ یعنی انہیں خدا نے حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے احکام خود خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت، خدا کی اطاعت اور ان کی معصیت خدا کی معصیت ہے۔ جس کی سزا اس دنیا میں عبرتناک عذاب ہے اور اگلی دنیا میں جہنم کی عقوبت۔ جب "دنیاوی" حکمرانوں نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریقہ بڑا آسان اور نہایت کامیاب ہے ــــ اس لئے کہ اس میں جسموں کی بجائے دلوں

اور روحوں پر حکومت ہوتی ہے جس کے لئے نہ کسی پولیس کی ضرورت پڑتی ہے، نہ فوج کی حاجت — تو انہوں نے مذہبی پیشواؤں سے گٹھ جوڑ پیدا کیا۔ اس طرح، راجہ ایشور کا اوتار، اور بادشاہ ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار پا گیا اور وہ اپنے احکام و فرامین کو خدا کے احکام کی حیثیت سے منوانے لگا۔ (انسانوں کے خود ساختہ) مذہب نے حکومت کی اس شکل کو بڑی تقویت پہنچائی ہے۔ تاریخ کے خونی اوراق اس پر شاہد ہیں کہ ان "خدائی فوجداروں" کے

تھیا کریسی

ہاتھوں نوعِ انسانی پر جس قدر مظالم، خدا کے نام پر ہوئے ہیں، شیطان بیچارے کے حصے میں ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا ہوگا۔ اس نظامِ سیاست کو تھیا کریسی کہتے ہیں جسے عیسائیت نے خاص طور پر فروغ دیا تھا۔ دائی کونٹ سیموئیل، عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

اس نے بادشاہوں کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تاکید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر تباہیاں پھیلائیں۔ ان کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ (BELIEF AND ACTION)

یہ تو تھا مختلف تدابیر سے اپنے اقتدار کو قائم رکھنا۔ اس کے برعکس، ایسا بھی ہوا کہ کسی قبیلہ یا قوم میں جو شخص سب سے زیادہ جسمانی قوت رکھتا تھا، یا جس نے سب سے زیادہ مادی قوت فراہم کر لی، اس نے باقیوں کو دبا کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا غور کرنے سے یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ حکومت کا یہ نظریہ شروع سے آج تک مسلسل کارفرما

جس کی لاٹھی اس کی بھینس

چلا آ رہا ہے۔ اسلوب و انداز اور اسباب و ذرائع میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن "اصول" ہر جگہ یہی کارفرما ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ انسان کے عہدِ جہالت و بربریت میں بھی یہی ہوتا تھا اور آج زمانہ تہذیب و تمدن میں بھی یہی ہو رہا ہے۔

جب ان اربابِ فکر و نظر نے، جو حالات پر گہری نظر رکھتے تھے، یہ دیکھا کہ معاشرہ کے اجتماعی نظام کی ضرورت کس مقصد کے لئے پیش آئی تھی اور اس سے فائدہ کیا اٹھایا جا رہا ہے، تو انہوں نے اس نظام کو (اپنی دانست کے مطابق) صحیح خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ افرادِ معاشرہ کو باہمی رضامندی سے یہ طے کرنا چاہیئے

نظریۂ میثاق

کہ مملکت میں افراد کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے اور حکومت کے فرائض و واجبات کیا؟ فریقین کے ان طے شدہ حقوق و واجبات کی توثیق ایک معاہدہ کی رُو سے ہو جانی چاہیئے۔ اس نظریہ کو (THEORY OF CONTRACT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونان سے چلا آ رہا تھا لیکن اٹھارویں صدی (عیسوی) میں اسے یورپ میں ہابز (HOBBES)، لاک (LOCKE) اور روسو (ROUSSEAU) نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ ڈیماکریسی (جمہوریت) کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے۔ یعنی "لوگوں کی باہمی رضامندی سے حکومت۔"

نظامِ سیاست کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاملات کا آخری فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ اسے اقتدارِ اعلیٰ یا (SOVEREIGNTY) کہتے ہیں۔ جب زمامِ اقتدار مذہبی پیشواؤں یا بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی تو

اقتدارِ اعلیٰ

اس وقت یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (ہمارے زمانے میں، بادشاہوں کی جگہ، ڈکٹیٹروں نے لے لی ہے۔ اس لئے ان کی حکومت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا)۔ مذہبی پیشوا، بادشاہ یا ڈکٹیٹر، خود مقتدرِ اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اندازِ حکومت جمہوری قرار پایا، تو اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کر لی۔ روسو کے نزدیک "اقتدارِ اعلیٰ" مملکت کے تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ لیکن لاک کے خیال میں یہ اقتدار افرادِ کی اکثریت کے پاس ہونا چاہیئے۔ بینتھم بھی لاک کا ہمنوا ہے۔ ڈیماکریسی نے اسی اصول کو اختیار کیا ہے۔ اس کے برعکس، مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ، اس طبقہ کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس وسائلِ پیداوار ہوں۔ نظامِ سرمایہ داری میں سرمایہ دار طبقہ کو۔ اشتراکی نظام میں مزدوروں کو۔ ہمارے دَور میں جمہوری نظریہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اکثر متمدّن قومیں اس کی حامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نظریہ کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر ہے۔

جمہوری نظام

(i) اس اندازِ حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں "عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے" کا اصول کارفرما ہوتا ہے یعنی

(GOVERNMENT OF THE PEOPLE, BY THE PEOPLE, FOR THE PEOPLE)

(ii) عوام کا منشار ان نمائندگان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے۔

(iii) کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار، ان نمائندگان کی کثرتِ رائے ہوتا ہے۔

(iv) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔

یہ وہ نظامِ حکومت ہے جس پر انسان اپنی مدت العمر کے تجارب کے بعد پہنچا ہے اور مغربی مفکرین کے نزدیک اس نظام سے بہتر نظام کا تصوّر ناممکن ہے۔ اس نظام کو آیۂ رحمت اور ضامنِ ہزار برکات و سعادت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوعِ انسان کے ہمدرد و بہی خواہ اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو انسانیت کا مجرم خیال کیا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مغرب کے عملی تجربہ نے اس نظامِ حکومت کو فی الواقع ایسا ثابت کیا ہے یا وہاں کے مفکّرین و مدبّرین کسی اور نتیجے تک پہنچے ہیں۔ ان مفکّرین و مدبّرین سے مراد، ان ممالک کے اربابِ فکر و سیاست ہیں جہاں جمہوری نظام قائم ہے۔

لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کوبن (ALFRED COBBAN) اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILIZATION) میں تہذیبِ مغرب کے زوال کے اسباب پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا سبب ان کا جمہوری نظام ہے (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اس میں "حاکم اور محکوم" میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ پروفیسر کوبن اس مفروضہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

جمہوریت کی ناکامی

اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ عملاً، حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا، افراد کے دوسرے طبقہ کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ، اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادیٔ اختیارات پیدا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۶۸)

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (A.C. EWING) نے ۱۹۴۷ء میں ایک کتاب بہ عنوان (THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) شائع کی تھی جس میں اس نے ڈیماکریسی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ بحث کے دوران میں وہ کہتا ہے کہ روسو نے یہ سمجھا تھا کہ نظامِ جمہوریت میں استبداد یا غصبِ حقوق کا خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ لوگ خود اپنے اوپر آپ ظلم نہیں کریں گے نہ اپنے حقوق خود غصب کریں گے۔ لیکن

اگر روسو عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا۔ (ص ۱۱۶)

رینی گوین (RENE GUENN) اس باب میں لکھتا ہے:۔

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے، جو کبھی نہ پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ یہ کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی..... حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ (ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ) وہ خود اپنے آپ پر حاکم ہیں...... عام رائے دہندگی (UNIVERSAL SUFFRAGE) کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے (اس اصول کی رو سے)

سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(THE CRISIS OF THE MODERN WORLD; P-106)

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کا ایک بار پھر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ مفکرین، جمہوری نظام کی جس خرابی پر اس شدومد سے تنقید کر رہے ہیں اس نظریہ کا یہ مفروضہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ (یعنی قانون سازی کا لامحدود اور غیر مشروط حق) عوام کو حاصل ہے اور عوام کا یہ حق ان کے نمائندوں کی اکثریت کی وساطت سے بروئے کار آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس نظریہ کی رُو سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ملک کے نمایندگان کی اکثریت جو قانون بنائے وہ ملک کے تمام افراد کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے اور ہر حال میں حق و صداقت پر مبنی۔ ان مفکرین کے نزدیک، یہ اس نظریہ کی بنیادی کمزوری ہے اور تباہی کا باعث۔ اس ضمن میں (H.N. MENCKEM) اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں لکھتا ہے۔

سب سے بڑی ناکامی

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب انہیں عملاً بروئے کار لانے کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور ارباب حکومت پبلک کے خدام ہیں۔ لیکن عملاً دیکھئے تو حکومت اپنا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب سمجھتی ہے....

اس باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام جمہوری نظام رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے۔ لیکن ان کا جذبہ محرکہ کبھی معقولیت پسندی نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کی وساطت سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، لامحدود عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔　(ص ۲۳۴)

۱۹۴۷ء میں، اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے قائم کی تھی کہ وہ جمہوری

U.N.O. کی تحقیق اندازِ حکومت کے متعلق سائنٹفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین و مدبّرین سے جمہوریت سے متعلق مقالات حاصل کئے اور انہیں ایک کتابی شکل میں شائع کردیا جس کا نام (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) ہے۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے یہ سوال پوچھا تھا کہ ڈیماکریسی کا مفہوم کیا ہے۔ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ لفظ بالکل مبہم ہے۔ آج تک اس کا مفہوم ہی متعیّن نہیں ہو سکا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "دورِ حاضر میں لفظ جمہوریت سے زیادہ مہمل لفظ کوئی اور ہے ہی نہیں" (صفحہ ۴۶۰)۔ اس کے بعد اس رپورٹ میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ

> یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اکثریت کے فیصلے کو بدلوا دے۔ (صفحہ ۵۰۴)

سابقہ صفحات میں ہم نے جمہوریت کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ مقصود نہیں کہ دنیا میں اس وقت جو مختلف نظامِ حکومت رائج ہیں، ہمارے نزدیک ان میں سے کوئی اور نظام جمہوریت کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ بالکل نہیں۔ جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی فکر نے اپنی ساری تاریخ میں جو نظام سب سے بہتر تجویز کیا تھا، تجربے نے اس کے متعلق بھی یہ بتایا ہے کہ وہ بڑا ہی ناکام رہا ہے۔ یہ ناکامی درحقیقت جمہوریت کی ناکامی نہیں ــــ نہ ہی اس سے یہ مقصود ہے کہ ان مدبرین و مفکرین کے نزدیک یا خود ہمارے نقطۂ خیال سے، جمہوریت کے مقابلہ میں، ملوکیت یا آمریت، کامیاب نظامِ حکومت ہے ــــ اس ناکامی کا حقیقی سبب، وہ نظریہ ہے جسے (SECULARISATION OF STATE) کہتے ہیں۔ اس نظریہ سے مفہوم یہ ہے کہ بادشاہ ہو یا ڈکٹیٹر جمہوری پارلیمان کی اکثریت ہو یا صدرِ مملکت، انہیں قانون سازی کا مطلق اختیار ہوتا ہے وہ جس قسم کا جی چاہے قانون بنالیں۔ جب جی چاہے اس میں ردّ و بدل کردیں یا اسے منسوخ کرکے اس کی جگہ کوئی اور قانون نافذ کردیں۔ ان کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی غیر متبدّل حدود نہیں ہوتیں جن سے وہ تجاوز نہ کر سکیں۔ ان کے مدوّن کردہ قانون کے غلط یا صحیح ہونے کے پرکھنے کے لئے کوئی خارجی معیار نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن نے جو نظامِ حکومت بھی آج تک وضع کیا ہے، اس کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ اور جب تک یہ وجہ موجود رہے گی کوئی نظامِ حکومت کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

سوال یہ ہے کہ اگر غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے کوئی مستقل، خارجی معیار نہ ہو اور قوم کے نمائندوں کی اکثریت کے

اس سے کیا نقصان ہوتا ہے فیصلے ملک کا قانون بن جائیں، تو اس سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ یہ سوال واقعی غور طلب ہے، اس کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے

رکھئے کہ قوم کے عام افراد ہوں یا ان کے نمائندے، نمائندوں کی اکثریت ہو یا اقلیت۔ یہ ہوں گے تو بالآخر انسان ہی۔ اور جو کمزوری ایک انسان میں ہو سکتی ہے وہ انسانوں کے گروہ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہ باور کرنا ناممکن ہے اور جو ایسا فرض کر لیتا ہے وہ اپنے آپ کو فریب دیتا ہے کہ نمائندوں کی اکثریت ان امیال و عواطف اور کشش و جاذبیت سے مبرّیٰ ہو جائے گی جو انسان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے۔ لارڈ سنل (LORD SNELL) کے الفاظ میں۔

> حکومتیں انسانوں پر مشتمل ہوں گی اور ہر انسان میں وہ کمزوریاں پائی جائیں گی جو نوعِ انسان کا خاصہ ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ قوانین وضع کرتے ہیں اور ملک کی پالیسی تشکیل کرتے ہیں وہ دوسرے لوگوں سے کسی طرح بھی زیادہ شریف یا زیادہ ہوشمند نہیں ہو سکتے۔ (THE NEW WORLD: P-17)

آلڈوس ہکسلے (ALDOUS HUXLEY) اس باب میں لکھتا ہے:۔

> تاریخ میں کوئی زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جو یہ بتائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں قوت و اقتدار آیا ہو ان میں سرکشی نہ پیدا ہو گئی ہو۔ اور ایسا باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ جو کچھ پیچھے سے ہوتا چلا آیا ہے وہ آج نہیں ہو گا یا آئندہ بھی ایسا نہیں ہوتا رہے گا۔ (SCIENCE, LIBERTY AND PEACE: P-41)

اس لئے اگر اکثریت کو بھی قانون سازی کے اختیارات بلا حدود و قیود دے دیئے جائیں تو اس کے ہاتھوں دوسرے انسانوں کے حقوق کبھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہ کچھ تو ہو گا اپنے ملک کے اندر رہنے والے انسانوں کے ساتھ، جہاں تک دوسرے ملکوں کے انسانوں کا تعلق ہے، انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا۔

انسانوں کی تمدّنی زندگی کی ابتدا، قبائلی تقسیم سے ہوئی۔ قبیلہ درحقیقت خاندان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام تھا لیکن اس تفریق و تقسیم کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا۔ ان میں باہمی مخاصمت اور عداوت کی آگ سلگتی رہتی تھی، اور ذرا سے اشتعال پر بھڑک اٹھتی تھی۔ پھر ایسا ہوتا کہ بعض قبیلے ایک دوسرے کے حلیف ہو جاتے اور اس طرح متخاصم گروہوں کا حلقہ وسیع ہو جاتا۔ نوعِ انسان نے زندگی کے دوسرے میدانوں میں جتنی جی چاہے ترقی کر لی ہو، لیکن اس تقسیم و تفریق کے اعتبار سے وہ آج بھی وہیں کھڑی ہے جہاں اس دورِ جہالت میں تھی۔ آج انسان اسی طرح قبیلوں میں بٹا ہوا ہے اس فرق کے ساتھ کہ اب قبیلہ کو قوم (نیشن) کہا جاتا ہے۔ قوم کی بنیاد کہیں نسل کے اشتراک پر ہے اور کہیں وطن کے اشتراک پر۔ یعنی ایک نسل یا ایک وطن کے انسان، ایک قوم کے فرد اور دوسری نسل یا وطن کے انسان، دوسری قوم کے افراد۔ اگر یہ تقسیم و تفریق محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی پھر بھی خیر تھی، لیکن مختلف اقوام میں وہی مخاصمت اور عداوت موجود ہے، جو مختلف قبائل میں ہوتی تھی، بلکہ اس سے کہیں زیادہ شدید اور عمیق۔ پروفیسر کوبن اس باب میں لکھتا ہے۔

قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت دیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنی خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو پھر ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لئے حق خود مختاری کی مدعی ہوں۔ THECRISIS OF CIVILISATION P-166

تاریخ قومیت کا عالم FREDRICK HERTZ اپنی کتاب NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS میں لکھتا ہے:۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے لپنے الگ نام رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی یا ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۲۸)

برٹرینڈرسل، اپنی کتاب THE HOPES FOR A CHANGING WORLD میں لکھتا ہے:۔

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے لیکن اس کے لپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

عہدِ کہن کی قبائلی تقسیم اور دورِ حاضر کی قومی تقسیم میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ اب قومیت ایک سیاسی نظریہ نہیں رہی، بلکہ اس نے ایک عقیدے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یوں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغرب نے مذہب کا لبادہ اتار پھینکا ہے اور اب وہ یکسر لامذہب ہو چکی ہے، لیکن وہ لا مذہب نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے مذہب کو تبدیل کر لیا ہے۔ اب اس کا مذہب، قومیت پرستی ہے۔ آلڈس ہکسلے کے الفاظ میں:۔

نیشنلزم ایک بت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔ THE PERENNIAL PHILOSOPHY P.184 AND 203

اسی کی وضاحت، اس نے اپنی دوسری کتاب SCIENCE, LIBERTY AND PEACE میں اس طرح کی ہے:۔

لارڈ ایکٹن نے ۱۸۶۲ء میں لکھا تھا کہ نیشنلزم کا مقصود آزادی یا خوشحالی نہیں، اس کے نزدیک مملکت ہی تمام مقاصد کا

معیار ہوتی ہے۔ اس لئے وہ مملکت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کا انجام مادی، اخلاقی ہر قسم کی تباہی ہو گا۔ ایکٹن کی یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوتی چلی جارہی ہے۔ نیشنلزم نے جس قدر مادی نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی شاید پوری کی پوری نسل بھی نہ کر سکے۔ باقی رہی اخلاقی تباہی، سو یہ تباہی لاکھوں مردوں، عورتوں، بالخصوص بچوں کے لئے ناقابلِ تلافی ہے۔ نیشنلزم کی طرف سے، جسے ہم نے وحدتِ انسانیت اور خدا کے عقیدہ کو چھوڑ کر، ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، ہمیں صرف یہی دو تحفے نہیں ملے۔ اس کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر قوم کا "مملکتی مذہب" ہے۔ یعنی خدا کے بجائے، قوم کی پرستش، جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکش تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رُو سے، عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کے بجائے علیحدگی، تکبّر، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں بلکہ وجوب ہوتا ہے۔

یہی ہکسلے، اپنی ایک اور کتاب END AND MEANS میں نیشنلزم اور اس کی تباہ کاریوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

> ہر نیشنلزم ایک بُت پرستانہ مذہب ہے، جس میں مملکت نے خدا کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے..... یہ خدا بڑے سخت فرائض عائد کرتا ہے اور بڑی عظیم قربانیاں مانگتا ہے۔ چونکہ نوعِ انسان کے دل میں نیکی کی تڑپ اور عطش ہے اس لئے وہ اس خدا کی پرستار بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی پرستش کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سے انسان کے اسفل جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے۔ نفرت اور دشمنی کے جذبات کی تسکین۔ نیز جرائم کی لذت۔

ذرا آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:۔

> لیگ آف نیشنز نے "قوم" کی جو تعریف متعین کی ہے اس کی رُو سے قوم کے معنی ہیں "ایسی سوسائٹی جسے جنگ کے لئے منظم کیا جائے"..... (جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے) اس باب میں کمیونسٹ ہوں یا نازی، فاشسٹ ہوں یا عام نیشنلسٹ، سب یکساں ہیں۔ سب کا ایمان یہ ہے کہ حصولِ مقصد کے لئے ہر قسم کا ذریعہ اختیار کر لینا جائز ہے اور سب کے نزدیک "مقصد" سے مراد ہے، انسانوں کے ایک گروپ کا دوسرے گروپ پر غلبہ و تسلّط۔ اس غلبہ و تسلّط کے لئے ہر قسم کا تشدّد اور فریب جائز ہے۔ یہ سب یہی وعظ کہتے ہیں کہ ہر فرد کو اپنا سب کچھ اسٹیٹ کے سپرد کر دینا چاہئیے۔

باردیو NICOLAS BERDYAEV اپنی کتاب SLAVERY AND FREEDOM میں لکھتا ہے:۔

اس سے زیادہ نفرت انگیز تصور اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسٹیٹ یا سوسائٹی یا نیشن کو خدا بنا لیا جائے اور پھر اس کی اس حیثیت کو اس امر کی دلیل قرار دے دیا جائے کہ اسے فرد پر غلبہ واستیلاء کا حق حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست کا تمام تر مدار جھوٹ پر ہے۔ اس لئے انسانی اخلاق کا مطالبہ ہونا چاہیئے کہ دنیا سے سیاست کے وجود کو جتنا کم کیا جاسکے کر دیا جائے۔ سیاست ہمیشہ انسان کی غلامی کا مظہر ہوتی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ شرافت وصداقت کو تو خیر چھوڑیئے سیاست تو عقل کی بھی مظہر نہیں ہوتی۔ ان بڑے بڑے مدبّرین اور سیاستدانوں کو دیکھئے۔ حرام ہے جو ان میں سے کسی نے کبھی کوئی بات عقل وشعور کی کی ہو۔

نیشنلزم کے متعلق ڈین آنج لکھتا ہے کہ

ہمارے سامنے ایک باطل مذہب ہے۔ یعنی مذہب نیشنلزم۔ یہ مذہب لا مذہبیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔
THE FALL OF IDOLS P.B.

اسی مذہب کی تباہ کاریوں کے متعلق انج لکھتا ہے کہ

نیشنلزم کا عقیدہ تمام اقوام کو جنگ جُو بنا دیتا ہے۔ اس میں محارب COMBATANT اور غیر محارب NON COMBATANT طبقہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ (صفحہ ۱۸۷)

حُبُّ الوطنی کا جذبہ

نیشنلزم کے مذہب بن جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیّت پرستی PATRIOTIOSM سب سے بڑی نیکی اور جذبہ حبّ الوطنی سب سے بلند جوہر قرار پا چکا ہے۔ اس مذہب کا "کلمہ" یہ ہے کہ MY COUNTRY RIGHT OR WRONG) "میرا ملک حق پر ہو یا باطل پر، میں بہرحال اس کا ساتھ دوں گا۔"

ROMELIN) کے الفاظ میں:۔

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفّظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اس صورت میں رکھنا چاہیئے جبکہ اس سے اس کے اپنے مفاد کے خلاف زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لئے ہر قربانی جائز۔
(QUOTED BY MURRAY IN THE INDIVIDUAL AND THE STAT P. 216)

اسی سلسلہ میں HEGEDUS اپنی کتاب THE STAT OF THE WORLD P.13 میں لکھتا ہے کہ

محبِّ وطن انسان، خواہ وہ کتنا ہی سچا محبِ وطن کیوں نہ ہو، انسانی ترقی کا بدترین دشمن اور مقصدِ حیات کا

سخت ترین غدار ہوتا ہے۔

آپ اندازہ لگائیے کہ جب صورت یہ ہو جائے کہ

(۱) دنیا کے انسان مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہوں۔

(۲) ہر قوم کو اپنے اپنے مفاد کی فکر ہو — موجودہ مفاد کے تحفّظ کی ہی فکر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مفاد سمیٹ لینے کی فکر — اور

(۳) کوئی ایسی حدود و قیود نہ ہوں جن سے اپنے مقصد کے حصول کے سلسلہ میں تجاوز کرنا معیوب سمجھا جائے تو دنیا کی حالت کیا ہو جائے گی؟ وہی حالت جس کا نقشہ W.O.WAKEMAN نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ

> قومیں ایک دوسرے کے سامنے وحشی درندوں کی طرح کھڑی ہیں اور ان کے سامنے صرف ایک اصول رہ گیا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔

QUOTED BY SPALDING IN CIVILIZATION IN EAST AND WEST

یہ نظریہ درحقیقت، میکیاوُلی تصوّرِ سیاست کا پیدا کردہ ہے جو اس وقت مغرب (بلکہ اس کے تتبع میں) ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ وہ تصوّر جس کی رُو سے میکیاوُلی حکمران طبقہ کو تلقین کرتا ہے کہ

> بادشاہ کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کے جال بچھا سکے۔ اُس کے ساتھ خوئے شیری بھی ہو تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا تھا، وہ باقی نہیں رہیں، تو اسے بلا تأمل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔ CHAPTER 18[TH]

اور اس کا متبع، فریڈرک دوم انہیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ

> کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تم اپنے عزائم کو چھپاؤ اور اپنے کیریکٹر کو ہمیشہ زیرِ نقاب رکھو..... صحیح حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے سے متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے، اختیار کر لی جائے۔ اسی لئے میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔ اپنے آپ کو ہمیشہ آزاد رکھنا چاہیئے۔ میکیاوُلی نے کہا تھا جو سلطنت اپنے مفاد سے غافل ہو جاتی ہے، آخر الامر تباہ ہو جاتی ہے۔ میں اگرچہ (طبعاً) ایسے اصول کو پسند نہیں کرتا لیکن میکیاوُلی

سے متفق ہونے پر مجبور ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس تصورِ سیاست کی رُو سے اگر کسی کے دل میں کسی اخلاقی اصول کی پابندی کا خیال بھی پیدا ہو جائے تو اسے حکومت کے قابل نہیں سمجھا جائے گا۔ وال پول نے اسی لئے کہا تھا کہ

> نیک آدمی کبھی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتا۔

QUOTED BY SUSAN STEBBINGS
IN IDEALS AND ILLUSIONS P.14

اور لارڈ گرے کا عقیدہ تھا کہ "سلطنتوں کے معاملات اخلاقی ضابطوں کی رُو سے طے نہیں پایا کرتے۔" (ایضاً صفحہ ۱۴) یہی وجہ ہے کہ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اب دنیا میں،

> پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانتدار، رحمدل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاہدہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا کارِ ثواب ہے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS, P-730)

اسی حقیقت کو اٹلی کے مدبّر (COVOUR) نے سمٹا کر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ

> اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

(FOREIGN AFFAIRS-YEAR 1952)

ماحصلِ بحث | جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں لکھا ہے، اسے مختصر الفاظ میں دہرانا چاہیں تو بات یوں سامنے آتی ہے کہ

(۱) انسانوں نے مِل جُل کر رہنا ہے۔

(۲) مِل جُل کر رہنے سے ان کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور ٹکراؤ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔

(۳) اس مقصد کے لئے کہ مختلف افراد کے مفاد میں ٹکراؤ نہ ہو اور اگر ٹکراؤ ہو تو اس سے جھگڑے پیدا نہ ہوں، سیاسی نظام کا تصوّر پیدا ہوا۔

(۴) انسانی فکر نے آج تک جس قدر سیاسی نظام وضع کئے ہیں ان میں کوئی بھی اس مقصد کے لئے کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

(۵) ان نظاموں میں آخری نظام قومی جمہوریت ہے۔ لیکن یہ نظام بھی بُری طرح ناکام ثابت ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اوّل تو اس سے ملک کے اندر مختلف پارٹیوں میں باہمی کشمکش رہتی ہے۔ اور دوسرے مختلف ملکوں اور قوموں میں نفرت اور رقابت کے جذبات دنیا کو جہنّم بنائے رکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مغربی مفکّرین نے ان مشکلات کا کوئی حل بھی سوچا ہے۔ اور اگر سوچا ہے تو وہ کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے راستے میں کیا موانع ہیں؟

مفکّرینِ مغرب کیسا نظام چاہتے ہیں

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ نظامِ جمہوریّت کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں "اقتدارِ اعلیٰ" عوام کے ہاتھ میں سمجھا جاتا ہے اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت کے فیصلے حرفِ آخر تصوّر کئے جاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر کوبن لکھتا ہے:۔

> عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریہ کی تائید میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوّت سے قائم کی جائے گی یا باہمی رضامندی سے۔ اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوّت صحیح کہہ دے وہ صحیح ہو' اس لئے یہی درست ہے کہ حکومت کو باہمی رضامندی پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر صحیح ہے' نہ ہی صداقت پر مبنی۔ اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی ...... فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔
>
> روسو کہتا ہے کہ منشائے عمومی (GENERAL WILL) ہمیشہ صحیح ہوگا ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ (جب منشائے عمومی اس وقت منشائے عمومی کہلا سکے گا جب وہ صحیح بات کہے تو) پھر اوں کیوں نہ کہا جائے کہ جو بات اخلاقی معیار کے مطابق صحیح ہے وہی صداقت ہے (خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے)۔ (ص۲۶)

اخلاقی معیار

پروفیسر کوبن کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار "اخلاقی بنیادیں" ہیں' نہ کہ اکثریت کے فیصلے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب لاک نے جمہوریت کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے پیشِ نظر بھی ایک " ابدی قانون" کا عملی نفاذ تھا جسے وہ " قانونِ فطرت" سے تعبیر کرتا تھا۔ چنانچہ اس باب میں اس نے کہا تھا کہ

> کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے۔ قانونِ فطرت وہ ابدی قانون ہے جو

تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے. خواہ وہ قانون ساز ہوں یا قانون کے متبع.

(C.F. MABBOTH THE STATE AND THE CITIZEN; P-23)

قانونِ فطرت

لاک کے نزدیک قانونِ فطرت خدا کا بنایا ہوا ہے اور انسان اس کے ماتحت اس وقت رہا کرتے تھے جب وہ تہذیب و تمدن کے نام سے ناآشنا تھے اور "نیچر" کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اُس وقت لوگ، عقل (REASON) سے کام لیتے تھے، جذبات سے نہیں. لیکن بعد میں جب لوگ جذبات کے پیچھے لگ گئے تو ان کی زندگی قانونِ فطرت کے مطابق نہ رہی. اب اُسی قانون کی بازیابی اور اس کی عملی تنفیذ، انسانی معاشرہ کا فریضہ ہے. لیکن اتنا کچھ لکھنے کے بعد، لاک یہ کہتا ہے کہ یہ قانون اکثریت کی منشا رسے مل سکتا ہے.

آپ نے دیکھا کہ یہ اتنا بڑا مفکر، کس طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی نقطہ کے گرد ناکام چکر کاٹ رہا ہے؟ وہ انسانی فیصلوں کی غلطیوں اور مفاد پرستوں کی چیرہ دستیوں سے گھبرا کر پکار اٹھتا ہے کہ "کسی حکومت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے. اسے فطرت کے ابدی قانون کا پابند رہنا ہوگا." اور جب اس سے پوچھا

لاک کی غلطی

جاتا ہے کہ فطرت کا وہ ابدی قانون کہاں سے ملے گا تو اسے اس کے سوا کچھ اور نہیں سوجھتا کہ "یہ قانون اکثریت کے فیصلوں میں ملے گا." بارش سے بچنے کے لئے پرنالے کے نیچے پناہ لینا اسے ہی کہتے ہیں. لیکن یہ لوگ ہیں بھی سچے.

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

بہر حال، ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغرب کے مفکرین اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کے فیصلوں کو بہر حال و بہر کیف صحیح سمجھنا، غلط ہے. کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے کسی خارجی معیار کی ضرورت ہے. لاک کے نزدیک یہ خارجی معیار " قانونِ فطرت" ہے. پروفیسر کوبن اسے " اخلاقی معیار" سے تعبیر کرتا ہے. مشہور اطالوی مدبر، میزینی (MESSENI) نے اس باب میں کہا تھا.

> اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے. یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے. لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے. ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے. وہ ایک انسان ہو یا زیادہ، بات ایک ہی ہے. اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے تغلّب سے محفوظ رکھ سکے اگر

ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور نا قابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسان کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں. خدا کے سوا جو حکومت قائم ہو اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے خواہ اس کا نام

خدا کا قانون

بونا پارٹ رکھ لیں یا انقلاب. اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا..... یاد رکھیے جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں. حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے. اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو.

(QUOTED BY GRIFFTH IN "INTERPRETERS OF MAN": P-46)

یعنی میزینی کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار، قوانینِ خداوندی ہونے چاہئیں جن کا نافذ کرنا حکومت کا فریضہ قرار پائے. ظاہر ہے کہ قوانینِ خداوندی مذہب کے ہاں سے مل سکتے ہیں. لیکن یورپ میں جو مذہب (عیسائیت) رائج ہے، پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں، اس کی حالت یہ ہے کہ

قوانینِ خداوندی عیسائیت سے نہیں مل سکتے

عیسائیت کی رُو سے زندگی کا حقیقی مسکن یہ دنیا نہیں بلکہ آنے والی دنیا ہے. اُخروی دنیا خیرِ محض کی مظہر ہے. اس کے برعکس یہ دنیا شر و فساد کی دنیا ہے. اس دنیا کی حیات، ابدی ہے. یہ دنیا محض عبوری حیثیت رکھتی ہے. انسان کے لئے یہ دنیا اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقام ہے. اس دنیا میں کوئی شے بالکلیہ خیر اور طیب نہیں. یہاں جو کچھ نظر آتا ہے اسی صورت میں اچھا ہے جبکہ وہ ان نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بن سکے جس کا وعدہ اگلی دنیا میں کیا گیا ہے.

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS: P-127)

ہسپانوی پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) اس باب میں لکھتا ہے :-

عیسائیت میں عدل کا تصوّر بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا. یہ اس کے تصوّرِ اخلاق سے یکسر باہر کی چیز ہے..... عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے.

(QUOTED BY BRIFAULT IN "THE MAKING OF HUMANITY" P-334)

مشہور مفکر، پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (ADVENTURES OF IDEAS: P-18)

انہی حقائق کے پیشِ نظر، تہذیب کا مشہور (امریکی) مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے۔

آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی شے قابلِ اطمینان نہیں۔" اطمینان کی آرزو باطل اور باطل آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔" یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔
(صفحہ ۴۴۶)

ظاہر ہے کہ اس قسم کے مذہب سے کبھی وہ خدائی قوانین نہیں مل سکتے تھے جنہیں میزبینی نے صحیح اور غلط کا ناقابلِ تغیر معیار قرار دیا تھا۔ اب یورپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کسی اور دروازے پر دستک دے۔

منشورِ حقوقِ انسانیت

یہ دروازہ مجلس اقوامِ متحدہ .U.N.O کا تھا جس نے "انسانیت کے بنیادی حقوق" کے متعلق تحقیق و تعیین کے لئے کمیشن بٹھایا اور اس کمیشن کی سفارشات کے مطابق ۱۹۴۸ء میں "منشورِ حقوقِ انسانیت" (DECLARATION OF HUMAN RIGHTS) شائع کیا۔ اس میں ان حقوق کی فہرست دی گئی جو اقوامِ متحدہ کے نزدیک، ہر حکومت میں ہر فردِ انسانیہ کو حاصل ہونے چاہئیں۔ اقوامِ متحدہ کے اس کارنامے کو عصرِ حاضر کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے دنیا کے ستائے ہوئے انسان کی ڈھارس بندھ سکتی تھی کہ اسے کسی طرح کچھ حقوق کی مستقل ضمانت تو ملی۔ لیکن اس کی یہ توقع بھی غلط نکلی۔ ابھی مذکورہ صدر منشور زیرِ ترتیب ہی تھا کہ (UNESCO) (یعنی انجمن اقوامِ متحدہ ہی کے ایک ادارہ) نے دنیا کے مشہور اربابِ فکر و نظر کے پاس ایک سوالنامہ بھیجا کہ وہ ان حقوق کے متعلق اپنی آراء سے مطلع کریں۔ ان کے جوابات مسٹر (JACQUES MARITAIN) کے تعارف کے ساتھ ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کئے گئے تھے۔ ان حقوق کی حیثیت کے متعلق، سب سے پہلے خود مسٹر میری ٹین لکھتے ہیں:۔

یہ حقوق بھی غیر متبدّل نہیں

یہ حقیقت بدیہی ہے کہ تمام حقوق، انسانی حقوق ہیں۔ اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابلِ ترمیم و تبدّل قرار دیا جائے۔ (صفحہ ۱۵)

اس کے بعد ماڈرن کوارٹرلی، لندن کا ایڈیٹر (JOHN LEWIS) اپنے مقالہ کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے:۔

اس حقیقت کو اب ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کے متعلق یہ تصور کہ یہ حقوق مطلق ہیں اور فطرتِ انسانی

کے اندر مضمر ہوتے ہیں اور ان کی ابتدا اس زمانے سے ہوتی ہے جب انسان نے ہنوز معاشرہ کی طرح بھی نہیں
ڈالی تھی، ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔　　(صفحہ ۵۱)

شکاگو یونیورسٹی کا پروفیسر (GERARD) لکھتا ہے:۔

انسانی حقوق صرف اس کوشش کا نام ہیں کہ انسان اور اس کے معاشرہ کے باہمی تعلقات کو متعین کر دیا جائے۔
یہ حقوق نہ تو مطلق ہوتے ہیں نہ ایسے کہ انہیں ہمیشہ ناقابلِ تغیّر و تبدّل قرار دیا جائے۔　　(صفحہ ۲۰)

یعنی جو کچھ اتنی کاوشوں اور کوششوں کے بعد انسان کو ملا، اس کے متعلق بھی اسے اطمینان نہیں کہ وہ اسے مستقل طور پر ملتا رہے گا۔ اور اس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں ہوگا۔ حقوق کے تحفظ کے متعلق مسٹر (MARITAIN) نے لکھا ہے:۔

انسانیت کے حقوق کی تعریف نہیں بلکہ روزمرّہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوقِ انسانیت کے احترام کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسی کو "فلسفۂ زندگی" کہتے ہیں۔　　(صفحہ ۱۷)

اسی حقیقت کو پروفیسر جوڈ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

مستقل اقدار کی تلاش

اچھی زندگی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان مستقل اقدار کو حاصل کر سکے بنا بریں میں کہہ سکتا ہوں کہ مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں ایک انسان کے لئے مستقل اقدار کا حصول ممکن ہو جائے۔ سوسائٹی کی ترقی کا یہی ایک پیمانہ ہے۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS; P-806)

یعنی بات سمٹ سمٹا کر یہاں پہنچی کہ انسانی معاشرہ کی اس مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کے باہمی معاملات مستقل اقدار کے مطابق طے ہوں اور یہی اقدار غلط اور صحیح کا معیار قرار پائیں۔ یہ ہے وہ آخری منزل جس تک انسان اپنے ہزاروں سال کے ناکام تجارب کے بعد پہنچا ہے۔ لیکن اس منزل میں پہنچ کر بھی انسان ششدر و حیران کھڑا ہے کیونکہ اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ مستقل اقدار ملیں گی کہاں سے؟ وہ اپنے ذہن سے کچھ اقدار متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایک کی تردید دوسرا کر دیتا ہے۔

آیئے! اب دیکھیں کہ اسلام، انسان کے اس سب سے اہم اور مشکل مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلامی نظام کی ساری عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان صرف اس کے جسم سے ہی عبارت نہیں، بلکہ جسم کے علاوہ اسے ذات بھی عطا ہوتی ہے۔ یہ انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے۔ یہی شے انسان کے لئے وجۂ تکریم اور باعثِ تعظیم ہے۔ اسی جہت سے، ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کے لحاظ سے یکساں عزت

کا مستحق ہے۔ اس میں حسب، نسب یا باپ اور خاندان ن پوزیشن کا کوئی سوال نہیں۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) قرآن کا انقلابی اعلان ہے۔ یعنی "ہم نے تمام فرزندانِ آدم (انسان) کو یکساں طور پر واجب التکریم بنایا ہے۔ اس اعتبار سے نہ کسی انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے کسی دوسرے انسان پر کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ ہی کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے مقابلہ میں ذلیل ہے۔ یہ اسلامی نظام کا پہلا اور بنیادی اصول ہے۔

ذات کی ایک بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ذات، کسی دوسری ذات کے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ یا آلہ کار نہیں بن سکتی[1]۔ اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) جب ذات ہر انسان کو یکساں طور پر عطا ہوئی ہے، اور

(۲) کوئی ذات کسی دوسری ذات کا آلہ کار نہیں بن سکتی،

تو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم و محتاج بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظام کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ .... (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین اور فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے محکوم اور فرماں پذیر بن جاؤ۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی رُو سے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے تو پھر کیا اس کا منشا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظامِ حکومت قائم نہ ہو؟ انسان فوضویت (انارکی) کی حالت میں زندگی بسر کرے؟ قطعاً نہیں۔ وہ انسانی معاشرہ کو آئین و ضوابط کے مطابق متشکل کرتا ہے اور انہیں قوانین و دساتیر کے ماتحت زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ وہ کہتا یہ

---

[1] ارسطو نے غلامی کے جواز میں یہی دلیل پیش کی تھی کہ بعض لوگ پیدائش کے لحاظ سے محض آلات (TOOLS) ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ ان آلات کو استعمال کرنے والے کاریگر۔ آلات کا فطری مقام یہی ہے کہ وہ کاریگروں کے مقاصد کو بروئے کار لائیں۔

قرآن نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم قرار دے کر، ان باطل تصورات کا خاتمہ کر دیا اور غلامی جیسی لعنت کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا۔ تفصیل اس اجمال کی "عورت" سے متعلق باب میں ملے گی جہاں یہ بتایا جائے گا کہ غلام اور لونڈیوں کا تصور کس قدر خلافِ اسلام ہے۔

ہے کہ حکومت کا حق کسی انسان کو نہیں، بلکہ خدا کو ہے۔ اِنِ الحکم الا اللہ (۱۲/۴۰) "حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے"۔
لا یشرک فی حکمہٖ احداً (۱۸/۲۶) "وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں"۔

لیکن خدا تو ایک حقیقتِ مجرّدہ ہے۔ اسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی آواز سُن سکتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنے معاملات کے فیصلے اس سے کس طرح کرا سکتے ہیں۔ ہم اس کی محکومیت کس طرح اختیار کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے اس نے بتایا کہ محکومیت ان قوانین کی اطاعت سے اختیار کی جائے گی جنہیں اس نے بذریعہ وحی، قرآن کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (۶/۱۱۵)

(اے رسول ان سے کہہ دے کہ) کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم چاہوں، حالانکہ اس نے ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

چونکہ یہ قوانین کسی انسان، یا انسانوں کی کسی جماعت کے وضع کردہ نہیں، اس لئے ان کی اطاعت، کسی انسان کی اطاعت نہیں، نیز چونکہ یہ قوانین تمام انسانوں پر یکساں طور پر نافذ ہوتے ہیں ـــــــ کوئی انسان، خواہ اس کی پوزیشن کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، ان کے دائرۂ اطلاق سے باہر نہیں رہ سکتا ـــــــ اس لئے اسلامی نظام میں، حاکم اور محکوم کا امتیاز ہی نہیں ہوتا۔ جسے عرفِ عام میں "حکومت" یا "مملکت" کہا جاتا ہے، وہ اسلامی نظام میں، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی مشینری سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔

اب آگے بڑھئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(i) انسان عبارت ہے اس کے جسم اور اس کی ذات سے۔

(ii) انسانی جسم میں ہر آن تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن انسانی ذات تغیرات سے ناآشنا ہے۔ اس پر خارجی تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہے۔

چونکہ اسلامی نظام، پورے کے پورے انسان (MAN AS A WHOLE) کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اس لئے یہ ثبات و تغیر، یعنی غیر متبدل اور قابلِ تغیر و تبدل عناصر کا آمیزہ ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں...... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے

متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔

اس مقصد کے لئے، قرآنِ کریم نے وہ اصول دیئے ہیں جو انسانی ذات کے غیر متبدّل تقاضوں کی تسکین کرتے ہیں۔ یہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل رہتے ہیں۔ انہی کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ٥ (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی بات، عدل اور سچائی کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں (مستقل اقدار و اصول) کو کوئی بدلنے والا نہیں (اس لئے کہ یہ اصول کسی اندھی فطرت کے وضع کردہ نہیں۔ بلکہ) اس خدا کے متعین فرمودہ ہیں جو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یہ غیر متبدّل اصول[1] (یا مستقل اقدار) وہ چار دیواری (BOUDARY LINES) ہے جس سے تجاوز کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، وہ ہر زمانے کے انسان کو آزادی دیتا ہے کہ وہ، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، اپنے لئے جزئی قوانین خود مرتب کرے۔ یہ جزئی قوانین، تبدیلیٔ حالات کے ساتھ بدلتے رہیں گے، اور وہ اصول، جن کے اندر رہتے ہوئے یہ قوانین مرتب کئے جائیں گے، ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے۔ یہ جزئی قوانین نمائندگانِ امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے (۴۲/۳۸)۔ اس حد تک، اسلامی نظام، جمہوریت کا آئینہ دار ہوگا۔ قرآن مشاورت کی مشینری سے کوئی بحث نہیں کرتا۔ وہ صرف اس اصول کو دیتا ہے۔ اس کے مطابق، اپنے اپنے حالات کے مطابق جو مشینری بھی وضع یا اختیار کر لی جائے، وہ ٹھیک ہوگی۔

یہ غیر متبدّل اصول، (یا مستقل اقدار) کس قسم کی ہیں، اس کے متعلق ہم آئندہ کسی باب میں تفصیلی گفتگو کریں گے۔ اس مقام پر اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب کوئی شخص اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرے گا، تو اسے حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہوگا کہ، افراد آئیں اور افراد جائیں۔ حکومت بنے اور حکومت بگڑے۔ ان اصولوں میں کوئی تغیر و تبدّل نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح، دیگر اقوامِ عالم کو بھی اس کا یقین اور اطمینان ہوگا کہ یہ قوم، ان اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کر سکتی۔ آج دنیا کی حالت یہ ہے کہ امریکہ میں صدر کا انتخاب ہو یا روس میں سربراہ کی موت، ساری دنیا کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے کہ نہ معلوم نئی برسرِ اقتدار پارٹی کی پالیسی کیا ہوگی۔ اس لئے کہ ان کے ہاں کوئی اصول ایسے نہیں جو غیر متبدّل ہوں۔ ان کا آئین

---

[1] قرآن نے اصولوں کے علاوہ، بعض قوانین بھی دیئے ہیں جو اصولوں کی طرح غیر متبدّل ہیں۔ یہ قوانین بیشتر انسان کی عائلی زندگی سے متعلق ہیں جسے قرآن بڑی اہمیت دیتا ہے۔

تک بھی بدلا جا سکتا ہے. لیکن اسلامی نظام میں حکومت کی تبدیلی یا کسی بڑے سے بڑے ذمہ دار فرد کی موت، مملکت کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ یہ پالیسی ان مستقل اقدار کے تابع رہتی ہے جو انسانوں کی نہیں بلکہ خدا کی متعین کردہ ہیں اور جنہیں بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اِن کے ہاں آئین و قانون سازی کا اختیار غیر محدود نہیں۔ وہ ہمیشہ ان اصولوں کے تابع رہتا ہے۔ اسی لئے اس نظام میں "اقتدارِ اعلیٰ" صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے، جو تمام نوع انسان کے لئے آخری، مکمل، اور غیر متبدّل ضابطہ حیات ہے۔

اب سیاسی نظام کے دوسرے ستون کی طرف آیئے. یعنی نیشنلزم جس نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے. قرآن کریم کا پیش کردہ

عالمگیر انسانیت کا تصوّر

بنیادی تصوّر یہ ہے کہ انسانیت ایک غیر منقسم وحدت ہے. اور اسے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا سب سے بڑا جرم. وحدتِ خالق کا تصوّر قرآنی تعلیم اور نظام کا سنگِ بنیاد ہے. اس نے ساری دنیا کو پکار کر کہا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) "یاد رکھو! پوری نوعِ انسانی ایک اُمّت، ایک قوم، ایک عالمگیر برادری ہے." اس کی تخلیق، اور اس میں زندگی کی نمود اور اٹھان کی مثال ایک فرد کی سی ہے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) "تمہاری تخلیق اور بعثت بس ایک فرد کی تخلیق و بعثت کی مانند ہے." جو تعلیم خدا کی طرف سے آتی رہی اس کا مقصدِ عظیم نوعِ انسانی کی وحدت کو برقرار رکھنا تھا. وہ اس تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا جرم یہی عائد کرتا ہے کہ يَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ (۲/۲۷) "جسے خدا نے ملائے رکھنے کا حکم دیا تھا یہ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں."

قرآنی تعلیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف نظریات و تصوّرات ہی پیش نہیں کرتا. وہ ان تصوّرات کو عملاً متشکّل کرنے کے لئے پروگرام بھی تجویز کرتا ہے. اس نے وحدتِ انسانیت کے لئے جو عملی پروگرام دیا اس کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے کی

اس کا عملی پروگرام

گئی. قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں نے اپنے اپنے "قومی گھر" بنا رکھے تھے. اسی طرح مختلف مذاہب نے اپنے اپنے جدا جدا مرکز قائم کر رکھے تھے. ساری دنیا میں ایسا "گھر" کوئی نہیں تھا جسے نوعِ انسانی کا عالمگیر مرکز کہا جا سکے. چنانچہ اس مقصد کے لئے حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ وہ ایک ایسے مرکز کی بنیاد رکھیں جو "عالمگیر انسانیت کا گھر" قرار پا سکے. سورۂ آلِ عمران میں ہے: إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِينَ (۳/۹۶) "یہ حقیقت ہے کہ وہ پہلا گھر جو تمام انسانیت کے مفاد کے لئے بنایا گیا تھا (وہی کعبہ تھا جو) مکّہ کی بابرکت زمین میں تعمیر ہوا تھا اور جسے تمام اقوامِ عالم کی راہ نمائی کے لئے روشنی کے مینار کا کام دینا تھا." اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۳/۹۶) "جو اس کی پناہ میں آجائے ساری دنیا کے خطرات سے

محفوظ ہو جائے۔"

ظاہر ہے کہ "گھر" سے مراد مٹی اور پتھر کا مکان نہیں۔ اس سے مراد ایک ایسا عالمگیر نظام ہے جو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے متشکل کیا جائے۔ اس نظام کا مرکزِ محسوس کعبہ ہے۔ جس طرح (مثلاً) جھنڈا، تخت، دارالخلافہ وغیرہ ایک سلطنت کے شعار (SYMBOLS) ہوتے ہیں۔ اسی طرح کعبہ بھی نظامِ خداوندی کی مرکزی حیثیت کی علامت (SYMBOL) ہے۔ ان چیزوں کو قرآن نے کہا ہی "شعائر اللہ" ہے۔ لہٰذا جب یہ کہا کہ کعبہ کو تمام نوعِ انسانی کا "گھر" قرار دیا گیا تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے نظام کا تصوّر دیا جو عالمگیر انسانیت کو محیط ہو۔ دوسری جگہ ہے: وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (۲/۱۲۵) "جب ہم نے اس گھر کو نوعِ انسان کے لئے مرجع اور امن کی جگہ بنایا"— اس سے بھی واضح ہے کہ کعبہ سے مراد اس نظام کا مرکز ہے جو وحدتِ انسانیہ کے بنیادی تصوّر پر متشکل ہے۔

ان مقامات میں قرآن نے کہا ہے کہ جو انسان اس نظام کی پناہ میں آجائے گا وہ ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ خطرات سے محفوظ ہو جانا بھی کم نعمت نہیں۔ لیکن یہ بہرحال ایک سلبی پہلو (NEGATIVE ASPECT) ہے۔ قرآن اس سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ (۵/۹۷) "اللہ نے کعبہ کو واجب الاحترام گھر بنایا تاکہ وہ انسانیت کے قیام کا مرکز بن سکے"۔ یعنی اس نظام کی اگلی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس کی رُو سے پوری کی پوری انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ دنیا میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں ہوگا۔

کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

سورۃ الحج میں اس کی مزید تصریح کر دی کہ اس نظام کا مرکز ایک کھلے شہر (OPEN CITY) کی حیثیت رکھے گا اور دنیا کا ہر باشندہ اس کا شہری (CITIZEN) ہو سکے گا۔ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲/۲۵) "ہم نے اسے تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں قرار دیا ہے، خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے"۔

اس مرکز کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (۲۲/۲۷) تم تمام عالمِ انسانیت میں اعلان کر دو کہ لوگ اس مقام پر جمع ہوں تاکہ ان کے اُلجھے ہوئے معاملات دلیل و حجت سے طے پا جائیں (حج کے یہی معنی ہیں) اور لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸) "اور وہ اپنے مفاد کو اپنے سامنے مشہود شکل میں دیکھ لیں"۔ اقوامِ عالم اپنے اپنے مراکز، اپنے اپنے قومی مفاد کے تحفظ کے لئے بناتی ہیں۔ لیکن نظامِ خداوندی کا مرکز، تمام عالمِ انسانی کے مفاد کی خاطر بنایا گیا ہے۔

اس مرکز میں جمع ہونے کی دعوت عام ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ○ (۳/۹۷) "تمام نوعِ انسانی پر واجب ہے کہ ان میں سے جو یہاں تک پہنچنے کی راہ پائیں، اللہ کے لئے اس گھر کا حج کریں۔ یہ دعوت عام ہے۔ لیکن جو اس دعوت کو قبول نہ کرے تو اس سے اس کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ اللہ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اللہ تمام اقوامِ عالم سے بے نیاز ہے۔" اس سے بھی ظاہر ہے کہ نوعِ انسانی کو دعوت دینے میں اس نظام کا کوئی اپنا مفاد مضمر نہیں۔ یہ دعوت عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلّی کے تحفظ و بقا کے لئے تدابیر سوچنے اور پروگرام متعین کرنے کے لئے ہے۔ لیکن اس میں ایک شرط ہے اور وہ شرط بنیادی ہے یعنی یہ کہ اس میں شریک ہونے والے

انسانیّت کی خاطر

بھی کسی ذاتی منفعت کا خیال دل میں لے کر نہ آئیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلّی کے جذبے سے آئیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو قرآن نے "لِلّٰهِ" سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ ہے وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ (۲/۱۹۶) ان اجتماعات کو "اللہ کے لئے" پورا کرو۔ "اللہ کے لئے" سے مراد ہے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے جسے اللہ نے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے قرآنِ کریم میں متعین کیا ہے۔ اگر اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے دل میں قومی، گروہی، وطنی مفاد یا کسی غیر خدائی پروگرام کی تکمیل کا جذبہ ہو تو یہ شرکت "للّٰہ" نہیں رہے گی۔ یہ توحید نہیں شرک ہو جائے گا۔ اس لئے دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی کہ اس مرکز میں جمع ہونا ہے تو حُنَفَاءَ لِلّٰهِ ...... غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ (۲۲/۳۱) کے انداز سے جمع ہو۔ یعنی خود غرضی کے ہر جذبہ کو دل سے نکال دو۔ ہر سمت سے کٹ کر، سیدھا رُخ اللہ کی طرف کر کے، یہاں جمع ہو۔ اس میں کسی اور جذبہ کو شریک نہ ہونے دو۔ اسی بناء پر سورۂ توبہ میں کہا گیا ہے کہ "مشرکین" کعبہ کے قریب نہیں آسکتے (۹/۲۸)۔ اور اس کا (سب سے پہلی بار) اعلان بھی خود حج کی تقریب پر کیا گیا تاکہ نوعِ انسانی اس فیصلے سے مطلع ہو جائے۔ وَأَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللّٰهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ ...... (۹/۳) اس اعلان کے بعد اگر کسی قوم کا نمائندہ دوسروں پر ظلم و زیادتی کے ارادے سے اس اجتماع میں شرکت کرے تو نہ صرف یہ کہ اسے باہر نکال دیا جائے گا بلکہ اسے اس کی سخت سزا بھی دی جائے گی۔ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۲/۲۵)

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنی نظام کی اوّلین خصوصیت کیا ہے؟ یہ نظام قومی، وطنی، نسلی، لسانی، مذہبی وغیرہ گروہ بندیوں کے تصور سے بلند ہو کر عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلّی کی خاطر قائم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس

بین الاقوامی ملّت

کا قیام عمل میں آتا ہے اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ...... (۳/۱۱۰) "تم ایک بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا

ہے"۔ سورۃ بقرہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ کعبہ کو تمہارے نظام کا مرکز تجویز کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد ہے کہ وَ کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ...... (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے ۔ یعنی ایسی اُمت جو افرادِ انسانیہ کے لئے یکساں فاصلے پر ہو ۔ تاکہ تم تمام انسانوں (کے اعمال) کی نگرانی کر سکو اور تم پر تمہارا رسول (مرکزِ ملت) نگران ہو۔ اس سے اس امت کے حصہ میں (حضرت ابراہیمؑ کی طرح) نوعِ انسانی کی امامت آجائے گی۔ (اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۲/۱۲۴)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ کا فریضہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسا نظام متشکل کریں جس میں خدا کی طرف سے متعین کردہ مستقل اقدارِ انسانی معاشرہ میں عملاً نافذ ہو سکیں۔ اور اس طرح کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود کی طرف شاداں و فرحاں گامزن ہو جائے۔ حج اس نظام کے عملی پروگرام کی ایک کڑی ہے جس میں امتِ مسلمہ تمام ایسی اقوام کو جو اس مقصد میں ان سے تعاون کی خواہاں ہوں، دعوت دیتی ہے کہ وہ اس نظام کے مرکز میں جمع ہو کر فلاح و بہبودِ انسانیت کے کاموں میں عملی تائید کا ثبوت دیں۔ اس طرح قرآن اپنے نظام کو عالمگیر بنانے کی راہیں کشادہ کرتا چلا جاتا ہے تاکہ "ساری زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے"۔ (۳۹/۶۹)

آپ نے غور کیا کہ اس نظام میں قرآن کس طرح شروع سے اخیر تک "النَّاس" کا ذکر کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ دنیا میں پہلا نظام ہے جو نوعِ انسان کے عالمگیر مفاد کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ اس نظام کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وَ لَوْ لَا

مذہبی آزادی

دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ ...... اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ؕ (۲۲/۴۰) "اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرے کہ بعض لوگوں کے ذریعے دوسرے لوگوں کو ظلم و تعدی سے باز رکھے تو یقیناً راہبوں کی خانقاہیں، عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کی عبادت گاہیں اور (مسلمانوں کی) مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے منہدم کر دی جائیں۔ اس مقصد کے لئے اللہ ایسی جماعتوں کو تیار کرتا ہے جو سینہ سپر ہو کر تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی حفاظت کریں۔ جو جماعت اس طرح "اللہ کی مدد" کرتی ہے۔ اللہ (کا قانون) اس کی ضرور مدد کرتا ہے۔ اللہ (کا قانون) بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے"۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآنی نظام عالمگیر انسانیت کا نظام ہے جو قومیت، وطنیت اور مذہبیت کے تنگ دائروں سے نکال کر "عالمینیت" کی حدود فراموش فضاؤں میں لے جاتا ہے۔ اسی لئے اس نظام کا دینے والا اللہ رب العالمین (۱/۱)، جس رسول کی وساطت سے یہ نظام ملا وہ رحمۃ للعالمین (۲۱/۱۰۷) اور اس نظام کا ضابطہ ذکریٰ للعٰلمین (۶/۹۱) ہے۔

قرآنی نظامِ حکومت کی عمارت "عدل اور احسان" کے غیر متبدل اصول پر استوار ہوتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔

عدل و احسان

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (۱۶/۹۰) "خدا تمہیں عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے"۔ عدل کے معنی ہیں کسی کو اس کا پورا پورا حق دے دینا۔ اور احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی کو پورا کر دینا۔ یعنی اس نظام میں کسی کے حق میں کسی صورت میں بھی کمی نہیں کی جائے گی، لیکن اگر کسی وقت ایسا ہو کہ کسی کو اس کا حق مل جانے پر بھی اس کی ضرورت میں کمی رہ جاتی ہے تو اس کمی کو پورا کرنا قرآنی نظام کے ذمے ہوگا۔ عدل کا لفظ بڑا جامع ہے۔ اس سے مراد محض "عدالتی عدل" نہیں۔ اس کا مفہوم دائرۂ زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اس ضمن میں قرآن میں دو اصول بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۵۳/۳۸) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔ یعنی یہ نہیں ہوگا کہ جرم کوئی کرے اور اس کی سزا کوئی اور بھگتے۔ ذمہ داری کسی کی ہو اور اٹھائے کوئی اور، فریضہ ایک کا ہو اور اسے سرانجام دے دوسرا۔ اس معاشرے میں یہ نہیں ہوگا۔ نہ ہی یہ کہ محنت ایک کرے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جائے۔ اس میں ہر شخص کو وہ کچھ ملے گا جس کے لئے وہ سعی و عمل کرے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)

عدل کے معاملے میں اپنے اور بیگانے حتیٰ کہ دوست اور دشمن کسی میں بھی تمیز نہیں ہوگی۔ ہر ایک سے عدل کیا جائے گا۔ سورۂ مائدہ میں ہے:۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو اور ہر ایک سے عدل کرو۔ یہی تقویٰ کا تقاضا ہے۔

حتیٰ کہ اگر عدل کا فیصلہ تمہاری اپنی ذات کے خلاف جاتا ہے تو بھی عدل کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (۴/۱۳۵)

اے جماعتِ مومنین! تم نظامِ عدل کو قائم رکھو اور اللہ کی خاطر اس کے نگران رہو۔ خواہ یہ چیز خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف جائے۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ اس لئے کہ اللہ نے تم پر جو ذمہ داری عائد کی ہے اس کا تقاضا اولین ہے۔ دیکھنا ایسا نہ ہو کہ تمہارے دل کے رجحانات یا میلانات

عدل کے راستے میں حائل ہو جاؤ یا تم گول مول سی (دو رخی) بات کر جاؤ۔ یا پہلو تہی کر کے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرو۔ یاد رکھو! جو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ کی نگاہ میں ہے۔

اس نظام پر قیامِ عدل کا فریضہ عالمگیر حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ یہ نظام اپنے دائرہ عمل و نفوذ میں ہی عدل کا ذمہ دار ہے۔ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں کہیں بھی ظلم اور ناانصافی ہو' اسے روکنے کے لئے سینہ سپر ہو جائے۔ اس کے لئے اگر اسے تلوار بھی اٹھانی پڑے تو اٹھائے۔ قرآن کہتا ہے کہ تلوار بنائی ہی اس مقصد کے لئے گئی ہے یعنی حق اور عدل کی حفاظت کے لئے۔ سورۂ حدید میں ہے :-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57/25)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین اور میزانِ عدل بھی نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ ان سب کے ساتھ ہم نے فولادی شمشیر بھی نازل کی جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے۔ اور نوعِ انسان کے لئے نفع بخشی کا سامان۔

جنگ کی اجازت

جنگ کے سلسلے میں دوسرے مقام پر ہے کہ جنگ اس وقت تک ناگزیر ہو گی جب تک جنگ کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (47/4) "تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔"

جنگ کے سلسلے میں جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے' اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں جنگ کی اجازت حسبِ ذیل مقاصد کے لئے دی جا سکتی ہے۔

(i) ہر مذہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لئے۔

(ii) نظامِ عدل کے قیام اور حفاظت کے لئے۔ یعنی دنیا سے ظلم اور ناانصافی مٹانے کے لئے۔

(iii) دنیا سے خود جنگ کا خاتمہ کرنے کے لئے۔

'مذہبی آزادی' کے سلسلے میں اتنی مزید وضاحت کی ضرورت ہے کہ قرآن کی رُو سے دین کے معاملے میں کسی قسم کی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (2/256) "دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔" اس کا واضح اعلان ہے۔ ایمان دراصل کسی دعوے کو دل کی رضامندی سے تسلیم کر لینے کا نام ہے۔ اس لئے زبردستی اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ نہ کسی کو دین کے اندر جبراً داخل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو جبراً اس کے اندر رکھا جا سکتا ہے۔ جس

کا جی چاہے دین اختیار کرے اور جب جی چاہے اسے چھوڑ کر الگ ہو جائے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) "جس کا جی چاہے اسے مانے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ دین میں زبردستی سے یہی مراد نہیں کہ کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان کیا جائے۔ قرآن اسے بھی زبردستی قرار دیتا ہے کہ کسی کی عقل و فکر کو معطل کر کے کوئی بات منوائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار اس کی وضاحت کرتا ہے کہ ہم نے نبی اکرمؐ کو قرآن کے سوا اور کوئی معجزہ نہیں دیا۔ خدا رسولؐ سے کہتا ہے: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) "کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا تا آنکہ وہ ایمان لے آئیں؟"

آیڈیالوجی کا فرق

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے قرآن کے نظامِ حکومت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کو ایک قوم (عالمگیر برادری) قرار دیتا ہے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس لئے وہ رنگ، نسل، زبان اور وطنیت کی بنا پر انسانوں کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کرنے کے خلاف ہے۔ وہ ساری دنیا کو ایک ملک اور تمام انسانوں کو ایک وحدت بتاتا ہے اور ان میں تفریق کا صرف ایک معیار قرار دیتا ہے۔ یعنی آیڈیالوجی کا فرق۔ بالفاظِ دیگر دنیا کے تمام وہ انسان جو وحی کی رُو سے متعین کردہ مستقل اقدار کو زندگی کا نصب العین قرار دیں، اس کے نزدیک ایک قوم کے افراد ہیں (خواہ وہ دنیا کے کسی حصے کے رہنے والے اور کسی نسل سے متعلق ہوں)۔ اور وہ لوگ جو اس نصب العین کے خلاف کوئی اور نصب العین اختیار کریں وہ دوسری قوم کے افراد۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کفر اور ایمان کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲)۔ اس کے علاوہ اور کوئی معیارِ قومیت قرآن کی رُو سے قابلِ قبول نہیں۔

لیکن اس تقسیم کے معنی یہ نہیں کہ جو لوگ اس کے نصب العین کو اختیار نہیں کرتے (یعنی جو مومن نہیں) وہ انہیں "اچھوت" سمجھتا ہے۔ بالکل نہیں۔ وہ انہیں جملہ حقوقِ انسانیت کا حامل قرار دیتا ہے۔ اور ان کے ان حقوق کی حفاظت کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ خواہ وہ (غیر مسلم) اس کی حدودِ مملکت کے اندر ہوں یا اس سے باہر۔ جیسا کہ نظامِ ربوبیت سے متعلق عنوان میں بتایا جا چکا ہے، وہ غیر مسلموں کی پرورش اور نشوونما کو مملکت کا بنیادی فریضہ قرار دیتا ہے اس کے معاوضے میں ان سے کچھ نہیں مانگتا۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) "ہم تمہارے لئے سامانِ رزق فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہم پر فریضۂ خداوندی ہے۔ ہم اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اتنا بھی نہیں کہ تم ہمارے شکر گزار ہو"۔ جسے "جزیہ" کہا جاتا ہے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو

غیر مسلم اہل کتاب نبیٔ اکرمؐ کے زمانے میں رعایا بن کر رہنا چاہتے تھے وہ ان کی اطاعت شعاری کا نشان تھا (۹/۲۹)۔

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ قرآن کریم کا منتہیٰ یہ ہے کہ ساری دنیا میں ایک ہی نظام قائم ہو اور اس کا مقصد ان مستقل اقدار کا انفاذ اور تحفظ ہو جو نوعِ انسان کی خوشحالی اور ترقی کے لئے وحی کی رُو سے ملی ہیں۔

جب تک ساری دنیا میں ایسا نظام قائم نہ ہو جائے اور دنیا اقوام کے دائروں میں بٹی رہے۔ اسلامی نظام تمام معاملات میں جو نوعِ انسانی کی بھلائی کے لئے ہوں، دیگر اقوام سے تعاون کرے گا۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ (۵/۲)

نوعِ انسانی کے لئے کشاد اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کے کاموں میں تعاون کرو۔ اور ایسے معاملات میں تعاون نہ کرو جن سے انسانیت میں اضمحلال پیدا ہو جائے۔ یا جو لوگوں کو قوانینِ خداوندی کی سرکشی پر آمادہ کریں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قرآنی نظام تمام نوعِ انسانی کو امّتِ واحدہ قرار دیتا ہے اور دنیا کے تمام مومنین کو ایک قوم کے افراد تسلیم کرتا ہے تو قرآنی مملکت کے اندر مذہبی فرقوں، سیاسی پارٹیوں کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۳۱) اور رسولؐ سے کہتا ہے کہ "ایسے لوگوں سے اسے کوئی واسطہ نہیں جو فرقے پیدا کرتے ہیں" (۶/۱۶۰) باہمی اختلاف اس کے نزدیک خدا کا عذاب ہے (۳/۱۰۴) اور اس سے محفوظ رہنا اس کی رحمت (۱۱/۱۱۸)۔ باقی رہیں سیاسی پارٹیاں سو وہ ان کے وجود کو "حکمتِ فرعونی" کا کرشمہ قرار دیتا ہے (۲۸/۴)۔ اس نظام میں سب کے لئے ایک ہی آئین ہوگا جس کے اصول غیر متبدّل ہوں گے۔ اور اس آئین کی رُو سے [illegible] کی پوری امّت نظامِ عدل و ربوبیت قائم کرے گی۔ اور اس کے لئے کوئی ناجائز ذریعہ یا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ ساری دنیا کو ایک عالمگیر برادری بنانا اس کا مقصد ہوگا۔ اور تمام نوعِ انسانی میں امن قائم کر کے ان کی مضمر صلاحیتوں کے لئے سامانِ نشوونما فراہم کرنا اس کا منتہیٰ۔ وَ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔

آج نیشنلزم کا ستایا ہوا انسان ایک ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جو اس کے سینے پر سے اس کابوس کو اتار سکے چنانچہ (J.M. MURRAY) اپنی کتاب (ADAM AND EVE) میں لکھتا ہے:۔

چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ

کر لیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آسکے۔ (صفحہ ۶۶-۶۷)

مغربی مدبرین نے اس مصیبت کا حل انٹر نیشنلزم کے نظریہ میں محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی اور اس کی ناکامی کے بعد، انجمن اقوام متحدہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ نظریہ اور اس کا عملی اقدام کس حد تک اس مسئلہ کا حل بن سکتا ہے، اس کے متعلق (EMREY REVES) اپنی کتاب (THE ANOTOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے:۔

> لیگ آف نیشنز ناکام رہ گئی۔ اس لئے کہ وہ انٹر نیشنلزم کے غلط عقیدہ پر قائم ہوئی تھی۔ اس عقیدہ پر کہ مختلف قوموں کے درمیان صلح قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ بحث کے ذریعہ کر لیا کریں۔ (کس قدر غلط تھا یہ تصور)۔ ان تنازعات کا حل ممکن ہی نہیں جب تک قوموں کے تعلقات کی بنیاد میں اصلاح نہ ہو جائے (اور وہ بنیاد ہے نیشنلزم)۔ (صفحہ ۱۶۱)

اس کے بعد (REVES) لکھتا ہے:۔

> ہم انٹر نیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے)۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹر نیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کرے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (صفحہ ۱۶۴)

سابقہ صفحات میں جو کچھ اسلامی نظامِ سیاست کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈالئے، اور دیکھئے کہ مسٹر (REVES) جس عقیدہ یا تحریک کو دورِ حاضر کی مصیبتوں کا حل تجویز کرتا ہے وہ اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟

(FREDICH HERTZ) اس نکتہ کو اور وضاحت سے بیان کرتا ہے جب وہ لکھتا ہے کہ

> اب اس حقیقت کو ہر ایک محسوس کر رہا ہے کہ خالی انٹر نیشنلزم کی کوئی مشینری بھی کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی، اگر اس میں صحیح روح نہیں ہے۔ لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ روح کس طرح پیدا ہو اور قوموں میں کس طرح پھونکی جائے۔ اس کے لئے بڑے بڑے بلند آہنگ دعاوی کچھ کام نہیں دے سکتے۔ نہ ہی یہ کہہ دینا کافی ہے کہ قومیں از خود اپنے اندر اس روح کی تعلیم عام کریں۔ اس کے لئے ایک عملی اسکیم اور تربیت کرنیوالوں کی جماعت کی ضرورت ہے..... یہ تعلیم وحدتِ انسانی کے جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے ہو گی اس کے لئے اسکول بھی

صحیح مقام نہیں۔ اس کا تعلق زندگی کے تمام اہم سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات سے ہے اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا کی تمام اقوام اپنے اپنے ہاں ایک جیسے معاشی اور معاشرتی نظام قائم کرلیں۔

(خاتمہ کتاب، صفحہ ۴۱۲)

یعنی اس کے نزدیک ان مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ساری دنیا میں ایک جیسا معاشی اور معاشرتی نظام قائم ہو۔ یہ وہ حل ہے جسے قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے تجویز کیا تھا جب دنیا عالمگیر انسانیت کے نام تک سے آشنا نہ تھی۔

باب سیزدہم
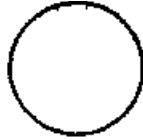
تقدیرِ اُمم

(قوموں کے عروج و زوال کے اٹل قوانین)

یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے خدا کا جو تصوّر دیا ہے اس کی رُو سے اس نے ایسے قوانین متعین کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا یہ عظیم سلسلہ سرگرم عمل ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی مقرر کر رکھے ہیں انسانی دنیا میں ایک تو افراد کی زندگی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق ایک فرد کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات کی نشو و نما دونوں پر ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں اہم اقوام کی زندگی ہے۔ قوم اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے لیکن اس کی نفسیات منفرد اور مختص ہوتی ہیں۔ قرآن نے وہ قوانین بھی دیئے ہیں جن کے مطابق قوموں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک قوم خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے۔ یعنی وہ ایسا نظام اور معاشرہ متشکل کرتی ہے جس کی بنیادیں خدا کے مقرر کردہ قوانین پر استوار ہوں، تو اس قوم کو سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں اور اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے تو وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ اس کا نام اجتماعی قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور یہ اسی طرح اٹل اور غیر متبدل ہے جس طرح افراد کے لئے قانونِ مکافات۔ قرآن کی رُو سے تاریخ اسی اجتماعی قانونِ مکافات کے ریکارڈ کا نام ہے۔ یعنی وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے فلاں نظریۂ زندگی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تو اس کا یہ انجام ہوا۔ اور فلاں قوم نے فلاں تصوّرِ حیات کے مطابق زندگی بسر کی تو اس کا مآل یہ ہوا۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے "سائنس آف ہسٹری" یا "فلاسفی آف ہسٹری" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاریخ کو ایک فلسفہ یا سائنس کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے، اتنی اہمیت کہ وہ تاریخ کو اپنے دعاوی کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ جب ہم نے کہا ہے کہ جو قوم اس انداز کی زندگی بسر کرے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی تو اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ

تاریخ کی اہمیت

ہے کہ تم تاریخِ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ جس جس قوم نے جس جس ملک اور جس جس زمانے میں یہ روش اختیار کی اس کا انجام تباہی اور بربادی ہوا یا نہیں۔ قرآنی دعاوی (یا خدا کے اٹل قوانین) کے پرکھنے کے لئے یہ ایک ایسا معیار ہے جو ساری دنیا کے لئے کھلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے متبعین کو خاص طور پر تاکید کی ہے کہ وہ تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو قرآنی دعاوی کی صداقت کے شواہد ان کے سامنے آجائیں گے اور دوسرے وہ اس بات کا اندازہ کرتے رہیں گے کہ ان کا کوئی قدم غلط راستے کی طرف تو نہیں اُٹھ رہا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ہم نے تمہاری

قرآن اور تاریخ

راہ نمائی کے لئے قرآن میں دو چیزیں دی ہیں۔ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲۴/۳۴) یعنی ایک تو وہ واضح قوانین جن کے مطابق قوموں کی موت وحیات کے فیصلے ہوتے ہیں اور دوسرے اقوامِ سابقہ کے احوال وکوائف (تاریخ) جن سے ان قوانین کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔ آپ قرآن کو دیکھئے۔ اس میں اقوامِ سابقہ کے احوال ومآل اس تفصیل وتکرار سے دیئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تاریخ کی کتاب ہے۔ لیکن وہ تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ پہلے ان قوانین کو بیان کرتا ہے جو قوموں کے عروج وزوال کو متعین کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اقوامِ گذشتہ کے حالات سامنے لا کر یہ بتاتا ہے کہ دیکھو ان قوانین نے اپنا اٹل نتیجہ کس طرح مرتب کیا۔ اور پھر اس سے توجہ فوراً اس طرف مبذول کرا دیتا ہے کہ اگر تم نے بھی اس قسم کی روش اختیار کی تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ قرآن کے نظامِ حق وصداقت کے مخالفین کے متعلق کہتا ہے کہ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا ..... كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۴۰/۸۲) "کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں اور انہوں نے ان کی طرح غلط روش اختیار کی تھی' ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں' ان کی عظمتِ گذشتہ کی داستانیں پکار پکار کر دہرا رہی ہیں۔ وہ قومیں تعداد میں بھی ان سے

قوموں کا انجام

زیادہ تھیں (جو اب اس نظام کی مخالفت کر رہے ہیں) اور قوت میں بھی بڑھ کر۔ ان کی قوت و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ ان پر یہ تباہی اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے پہلے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں تنبیہ کردیں WARNING دے دیں کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ ..... كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۰/۸۳)۔ لیکن جب خدا کے پیغامبران کی طرف ایسے واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم جس طریق پر چلے جا رہے ہیں' اس سے مطمئن ہیں۔ وہ ہمیں

مترتوں کے جھولے جھلا رہا ہے۔ تم خواہ مخواہ کہہ رہے ہو کہ ہم پر تباہیاں لا رہا ہے۔ لیکن آخر الامر انہیں اس تباہی نے آکر گھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ (۴۰/۸۴) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس وقت کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے ان سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن فَلَمْ يَكُ ...... بَاْسَنَا (۴۰/۸۵) جب غلط روش کے نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو اس وقت اس سے اجتناب کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی جو صرف انہی کے ساتھ مختص تھی۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ ...... الْكٰفِرُوْنَ (۴۰/۸۵) یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس کے مطابق تمام اقوامِ سابقہ کی موت و حیات کے فیصلے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں حق و صداقت کی روش سے انکار کرنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے وَكَمْ ...... قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (۲۱/۱۱)۔ کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار کر رکھی تھی ہم نے انہیں (ان کی غلط روش کے نتیجے میں) ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے۔ ان (تباہ ہونے والی قوم) کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے ہزار آگاہ کیا گیا، لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ لیکن فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۲۱/۱۲) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں

قانونِ مکافات کی گرفت

سامنے دیکھ لیا تو اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا کہ لَا تَرْكُضُوْا۔ بھاگو نہیں۔ تم بھاگ کر جا کہاں سکتے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا ..... تُسْئَلُوْنَ (۲۱/۱۳) چلو واپس اپنے محلات کی طرف اور اس ساز و یراق کی طرف جو تمہارے لئے اس قدر آسائشیں بہم پہنچاتا تھا۔ واپس چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ اتنا مال و دولت تم نے کہاں سے لیا تھا؟ وہ مظلوم کون تھے جن کے خونِ ناحق کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہ آرائش بنی تھی۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱/۱۴) اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہم واقعی بہت ظلم و ستم کیا کرتے تھے۔ یہ تمام ساز و سامان اسی ظلم و ستم کا نتیجہ ہے۔ فَمَا زَالَتْ ..... خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۵) وہ یہی پکارتے رہے لیکن ان کی اس وقت کی پکار انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکی۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کٹے ہوئے کھیت (اور) بجھے ہوئے شعلے ہوں۔

مذکورہ بالا آیت (۲۱/۱۲) میں کہا گیا ہے کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ "جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھا۔ جب انہیں اس کا احساس ہوا۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط نظامِ تمدن و معاشرت اپنے تباہ کن نتائج تو روزِ اوّل ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن وہ اثرات بڑے غیر محسوس ہوتے ہیں اور انہیں صرف وہی آنکھ دیکھ

سکتی ہے جس پر مفاد پرستیوں کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہ نتائج اندر ہی اندر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ ایک دن محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ "محسوس شکل میں سامنے آنے" کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی تباہی ایسے اسباب و ذرائع سے ہوتی ہے جو محسوس طور پر نظر آتے ہیں لیکن یہ اسباب ان کے غلط نظام کو تباہ کرنے کا فقط ذریعہ (INSTRUMENT) ہوتے ہیں۔ اس کا اصلی سبب (REAL CAUSE) تو ان کی غلط روش زندگی ہوتی ہے۔ وقائع نگار (جن کے نزدیک تاریخ فقط واقعات و حوادث کے ریکارڈ کا نام ہے) ان محسوس اسباب کو ان کی تباہی کا سبب قرار دے دیتے ہیں لیکن قرآن، جو تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان واقعات و حوادث (یعنی ظاہری اسباب) کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ علاماتِ مرض کی بجائے علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا حقیقی سبب وہ تھا۔

تباہی کا اصلی سبب

آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن نے اس قانون کو جس کی رُو سے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں "سنت اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں "خدا کی عادت" اور اس سے مراد ہے وہ قانون مکافاتِ عمل جو شروع سے یکساں چلا آتا ہے اور غیر متبدل ہے۔ فطرت کے تمام قوانین "سُنت اللہ" ہیں جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ سورۂ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ ..... قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۹) "یہ اللہ کی عادت ان لوگوں کے متعلق تھی جو اس سے پہلے ہو گزرے ہیں" اللہ کی عادت کیا؟ یہ اس کا فیصلہ ہے جو ایک اٹل قانون کی شکل اختیار کر چکا ہے۔" اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے: سُنَّةَ اللّٰهِ ..... تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۱) یہی قانونِ خداوندی ہے جس نے اقوامِ سابقہ کی تقدیروں کے فیصلے کئے تھے۔ تو قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔" اسی طرح سورۂ فاطر میں اقوامِ سابقہ کے احوال و ظروف اور انجام و عواقب کے سلسلے میں کہا کہ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (۳۵/۴۳) یہ لوگ جو اس نظامِ خداوندی کی مخالفت کر رہے ہیں، انہیں ان کے سوا اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ خدا کے جس قانون کے مطابق اقوامِ گزشتہ کے فیصلے ہوئے تھے اسی قانون کا ان پر اطلاق ہو جائے۔" سو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کا وہی قانون ان پر بھی منطبق ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵/۴۳) تو نہ تو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی پائے گا اور نہ ہی ایسی صورت ہو سکے گی کہ جب وہ قانون آجائے تو کوئی اُس کا رُخ کسی دوسری طرف پھیر دے۔

سُنت اللہ

ہمارے زمانے میں (HEGEL) نے (اور اس کے تتبع میں مارکس (MARX) نے تاریخ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن ان کا فلسفۂ تاریخ کیا ہے؟ ہیگل نے کہا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب شباب تک پہنچتا ہے تو اس میں

ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ

انحطاط شروع ہوجاتا ہے اور اس سے اس کی ضد ایک دوسرا تصوّر نمودار ہوجاتا ہے۔ اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ اور اس میں سے ایک اور تصوّر پیدا ہوجاتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ ساری تاریخ انہی متضاد تصوّرات کی کشمکش کی داستان ہے۔ مارکس نے بھی یہی کہا' اس تبدیلی کے ساتھ کہ یہ جنگ تصوّرات کی نہیں بلکہ نظامہائے معیشت (ECONOMIC SYSTEMS) کی ہے۔ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ پھر اس میں سے اس کی ضد ایک اور نظام نمودار ہوتا ہے جو پہلے نظام کو ختم کرکے اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ اس ربط و نظم کے ساتھ یہ سلسلۂ کشمکش کس قوّت کی بناء پر جاری و ساری ہے تو اس نے کہا کہ یہ "روحِ زمانہ" (ZEITGEIST) کی کار فرمائی ہے۔ اور جب یہی سوال مارکس سے کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس کا سبب تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔

تاریخ کے اس فلسفہ کی رُو سے نہ کائنات کے سامنے کوئی مقصد اور منزلِ مقصود ہے۔ نہ کوئی تصوّر فی ذاتہٖ خیر یا شر ہے۔ نہ کسی تصوّر یا نظام میں آگے بڑھنے اور باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ نہ ہی اس تمام کارگہِ ہست و بود کے پیچھے کوئی ایسی قوّت ہے جو اس عظیم سلسلہ کو کسی مقصد کے مطابق چلا رہی ہو۔ کچھ اندھی قوتیں ہیں جو میکانکی طور پر مصروفِ کشمکش ہیں۔ اور بیکس و بےبس انسان ان تصادماتِ بےمعنی اور تزاحماتِ بےمقصد میں خواہ مخواہ پستا چلا جا رہا ہے۔

قرآنی فلسفۂ تاریخ

لیکن قرآن نے جو فلسفۂ تاریخ پیش کیا ہے وہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش پیہم جاری ہے۔ حق' اٹل' مستحکم اور غیر متبدّل ہے اور اس کا نتیجہ تعمیر و ارتقاء۔ اس کے برعکس' باطل مرغِ بادنما کی طرح ہر آن بدلنے والا ہے اور اس کا نتیجہ تخریب و تنزّل ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے۔ اس لئے کہ باطل پر غلبہ حاصل کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے' بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ (۲۱/۱۸) ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں۔ اور اس کی ضرب ہائے پیہم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَيَدْمَغُهٗ۔ حق' باطل کا سر توڑ دیتا ہے؛ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ پس وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے؛ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۸) تم لوگ اس نظریہ کے خلاف جو کچھ بیان کرتے ہو' اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کشمکشِ حق و باطل اور آخر الامر حق کا غلبہ اور باطل کی شکست' ہوتی کس مقصد کے لئے ہے؟ اور اس کے پیچھے کون سی قوّت کار فرما ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سلسلۂ کائنات بالمقصد (WITH A PURPOSE)، پیدا کیا ہے۔ یونہی بیکار (IN VAIN) پیدا نہیں کیا۔

سورۃ الدخان میں ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ..... لٰعِبِيْنَ (۴۴/۳۸) ہم نے کائنات کی پستیوں

کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے

اور بلندیوں کو یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ..... ..... لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۹) ہم نے اسے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی وجود میں آگئی ہے اور بلا مقصد سرگرم عمل ہے۔ یہ تصوّر غلط ہے۔ کائنات کی تمام قوتیں اس لئے سرگرم عمل ہیں کہ ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ..... بِالْحُسْنٰى (۵۳/۳۱) تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں ان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ دکھائے۔ اور جو لوگ ہمواریاں اور خوشگواریاں پیدا کرتے ہیں انہیں اچھا بدلہ ملے۔

چونکہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے[۱]، اس لئے ہر وہ تصوّر، ہر وہ عمل، ہر وہ نظامِ زندگی جو حق (مستقل اقدار) کے مطابق ہوگا وہ زندہ رہے گا اور آگے بڑھے گا۔ جو اس کے خلاف جائے گا اور تعمیرِ انسانیت کے لئے مضر ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالموں کی کھیتی پنپتی ہے اور جو لوگ عدل و دیانت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ یہی ہے۔ لیکن کسی تصوّرِ حیات، نظامِ زندگی یا اس تصوّر و نظام کی حامل قوم کی کیفیات کا مشاہدہ

اقوام کی زندگی ماپنے کے پیمانے

ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کے کائناتی قوانین کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ سورۂ الحج میں ہے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جس تباہی اور بربادی سے انہیں ڈرایا جاتا ہے وہ جلدی کیوں نہیں آتی۔ اگر ہماری روش غلط ہے تو ہم عذاب میں کیوں نہیں ماخوذ ہو جاتے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔ تم اس کا یقین رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔ اس میں کبھی خطا نہیں ہو سکتی۔ لیکن بات یہ ہے کہ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ..... مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲/۴۷) خدا کے قانونِ مکافات کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہے۔ قومیں نہ ایک دن میں بنا کرتی ہیں، نہ ایک دن میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگی اور موت کے پیمانے افراد کے پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اگر کسی قوم کے غلط نظامِ معاشرہ کا تباہ کن نتیجہ جلد سامنے نہیں آتا تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کی اس غلط روش کا نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو رہا۔ میزانِ کائنات میں ان کے ہر عمل کا ذرّہ ذرّہ تُلتا ہے؛ فَمَنْ يَّعْمَلْ..... شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۷-۸) جو ایک ذرّہ کے

---

[۱] کائنات کے متعلق قرآنی نظریہ کی تفصیل آئندہ باب میں ملے گی۔

برابر بھی ٹھیک کام کرتا ہے اس کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا. جو ایک ذرّہ کے برابر غلط کرتا ہے، وہ اسے بھی دیکھ لے گا. یہاں کوئی عمل نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا. لیکن افراد کی طرح

میزانِ عمل ہر وقت موجود رہتی ہے

اقوام کی صحت اور بیماری (اور زندگی اور موت) کا اصول یہ ہے کہ جب تک اچھے کاموں کا پلڑا جھکا رہتا ہے قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے. جب غلط کاموں کا پلڑا جُھک جاتا ہے تو قوم کا تنزل شروع ہو جاتا ہے: فَاَمَّا مَنْ...... هَاوِيَةٌ (۹-۱۰۱/۶) اس لئے کہ تعمیری امور تخریبی امور کے نقصان رساں اثرات کو ساتھ کے ساتھ زائل کرتے رہتے ہیں؛ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴) اس کے برعکس اگر تخریبی امور کا پلڑا جھکتا چلا جائے تو وہ قوم آہستہ آہستہ، بتدریج ہلاکت کے جہنم کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے. ایسے غیر محسوس انداز سے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ تباہی کی جانب کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں. قرآن کے الفاظ میں سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶۸/۴۴) "ہم انہیں بتدریج اس طریق سے پکڑتے ہیں جس کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا" اگر وہ قوم اپنی ہلاکت سے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لے اور اس کی جگہ صحیح طریق زندگی اختیار کر لے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی اور تباہی کے جہنم تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے لئے بازآفرینی کا کوئی موقع نہیں رہتا. وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ...... يَرْجِعُوْنَ (۲۱/۹۵) اور وہ اس طرح ہلاک ہوتی ہے کہ فَمَا بَكَتْ...... مُنْظَرِيْنَ (۴۴/۲۹) "کہ ان کی تباہی پر نہ آسمان روتا ہے نہ زمین. نہ ہی انہیں مہلت دی جاتی ہے."

جس طرح افراد کی طبیعی زندگی سے متعلق بیماریاں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح اقوام کے نظامہائے تمدن و معیشت کی خرابیاں بھی متنوّع ہوتی ہیں. پھر جس طرح ہر مرض اور اس کی وجہ سے آنے والی موت کا درمیانی عرصہ مختلف ہوتا ہے. تپ دق سے مریض برسوں میں گھل گھل کر مرتا ہے لیکن گردن توڑ بخار چند دنوں کی بھی مہلت نہیں دیتا. اسی طرح نظامہائے تمدن و معیشت کی خرابی اور اس کی وجہ سے آنے والی ہلاکت میں بھی مہلت کا وقفہ مختلف ہوتا ہے. اسی مہلت کے وقفہ

اجل کا مفہوم

کی آخری حد کو قرآن کی اصطلاح میں اجل کہتے ہیں. سورۂ یونس میں ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ...... لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۴۹، ۳۴/۳۰) ہر قوم کے لئے ایک اجل ہوتی ہے اُس وقت سے پہلے پہلے تو ان کے لئے اصلاحِ احوال کی گنجائش ہوتی ہے لیکن جب وہ آخری وقت آجاتا ہے تو اس میں ایک گھڑی کا تقدم و تاخر بھی نہیں ہو سکتا. اس لئے کہ (طبیعی امراض کی طرح) اجتماعی زندگی اور موت کے لئے بھی اٹل قانون مقرر ہے اور یہ سب کچھ اس قانون کے مطابق ہوتا ہے. یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۱۰/۴۹) "ہر قوم یا ہر نظام کے لئے ایک اجل ہوتی ہے" تو دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) "ہر اجل کے لئے

ایک قانون مقرر ہے۔ قوموں کا محو و ثبات اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے (یَمۡحُوا اللّٰهُ ..... وَيُثۡبِتُ) اور یہ سب کچھ خدا کی اس مشیت کے مطابق ہوتا ہے جس کی رُو سے افراد اور اقوام کی موت اور زندگی کے لئے قوانین مرتب ہوئے ہیں۔ وَعِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡكِتٰبِ (۱۳/۳۹) "قانون کی اصل و بنیاد اس کے پاس ہے"۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے قوموں کی موت و حیات نہ یونہی ہنگامی اور اتفاقی طور پر واقع ہوتی ہے اور نہ ہی "فطرت کی کسی اندھی قوت" کی رو سے محض دھاندلی سے۔ یہ سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ لِّيَهۡلِكَ ..... عَنۡۢ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) تاکہ جو ہلاک ہو وہ بھی دلیل و بُرہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ یہاں نہ زندگی بخشش کے طور پر ملتی ہے نہ ہلاکت اور تباہی دھاندلی سے ہوتی ہے

موت و حیات علیٰ بصیرت

وَمَا كَانَ اللّٰهُ ..... يَظۡلِمُوۡنَ (۲۹/۴۰) "خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا وہ قوم خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے"۔ اور اس کی وجہ سے تباہ ہوجاتی ہے۔ خدا کو (معاذ اللہ) کسی پر ظلم کرکے لذت نہیں ملتی کہ وہ دوسروں کو عذاب میں مبتلا کرکے (ان کے تڑپنے اور پھڑکنے کا تماشا دیکھے) وہ کہتا ہے کہ مَا يَفۡعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمۡ اِنۡ شَكَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ (۴/۱۴۷) اگر تم خدا کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم رہو اور زندگی کے لمحات کی قدر کرو، تو اللہ نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ جو قوم یہ سمجھتی ہے کہ رَبِّيۡۤ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) "خدا نے ہمیں یوں ہی بے جرم و خطا ذلیل کر دیا"۔ وہ ان سے للکار کر کہتا ہے کہ كَلَّا — ہرگز نہیں۔ تم غلط کہتے ہو۔ خدا نے بلاوجہ تمہیں ذلیل نہیں کردیا۔ بَلۡ لَّا تُكۡرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ (۸۹/۱۷) "تمہاری حالت یہ تھی کہ تم کسی ایسے انسان کی عزت نہیں کرتے تھے جو معاشرے میں تنہا رہ جائے"۔ وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۝ (۸۹/۱۸) نہ تم ایک دوسرے کو ترغیب دیتے تھے کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے اس کی روٹی کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس تمہاری حالت یہ تھی کہ وَتَاۡكُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَكۡلًا لَّـمًّا (۸۹/۱۹) تم باپ دادا سے ملی ہوئی دولت کو سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے تھے۔ وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) اور دولت سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ چاہتے تھے کہ دوسروں کا مال و متاع بھی تمہارے قبضے میں آجائے۔ تم نے ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس کا لازمی نتیجہ تمہاری ذلت و خواری تھی۔ یہ وجہ تھی کہ تم ذلیل ہوگئے۔ خدا نے تمہیں یونہی بلاوجہ ذلیل نہیں کردیا۔ خدا ایسا قطعاً نہیں کیا کرتا۔ جب تک کوئی قوم صلاحیت بخش نظام پر کاربند رہتی ہے ہلاکت سے محفوظ رہتی ہے۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ ..... مُصۡلِحُوۡنَ (۱۱/۱۱۷) ہلاکت انہی کی ہوتی ہے جو صحیح قالب چھوڑ کر اپنے لئے غلط پیکر اختیار کرلیتے ہیں: فَهَلۡ يُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ۔ (۴۶/۳۵)

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

سوال یہ ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے مراد کیا ہے؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس قوم کا ایک ایک فرد موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، اور اس طرح کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کے ابتدائی ادوار میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ پوری کی پوری قوم طبیعی طور پر تباہ ہو جاتی تھی اور اس طرح ان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا، لیکن قرآن کہتا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے دراصل مراد یہ ہے کہ اس قوم سے قوت و سطوت اور غلبہ و حکومت چھن جاتے ہیں۔ اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ اسے قانون استبدال و استخلاف اقوام (LAW OF SUCCESSION AND SUBSTITUTION OF NATIONS) کہا جاتا ہے۔

ہلاکتِ امم سے کیا مراد ہے؟

مثلاً سورۂ محمد میں ہے: هٰٓاَنْتُمْ ..... الْفُقَرَآءُ (۴۷/۳۸) دیکھو تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم (اپنی فاضلہ دولت کو) نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے دے دو تو تم میں وہ لوگ ہیں جو ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ساری کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے مفاد کی خاطر جمع رکھی جائے۔ سو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص دولت کو اس طرح سمیٹ کر دوسروں کو ان کی نشوونما سے محروم رکھنا چاہتا ہے وہ دراصل اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ خدا نے جب تم سے کہا تھا کہ اس دولت کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دو تو یہ تمہارے ہی بھلے کی بات تھی۔ اسے تمہاری دولت کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ بہرحال تم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا ..... اَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) "اگر تم صحیح نظامِ زندگی سے پھر گئے (جس میں معاشرہ کا فریضہ تمام نوعِ انسان کی نشوونما ہوتا ہے) تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے۔"

یہاں قرآن نے اتنا ہی کہا ہے کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی تمہاری جیسی نہیں ہوگی۔ دوسرے مقام پر کہا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہوگی۔ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ..... مِنْهُمْ (۷۰/۴۰-۴۱)۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی جگہ لیتی ہے وہ جانے والی قوم سے بہرحال بہتر ہوتی ہے۔

قوموں کا باہمی تصادم ایک تو مادی سطح پر ہوتا ہے۔ اس میں جس قوم کے پاس مادی قوت زیادہ ہو اسے غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی کے پاس بھی صحیح نظام نہیں ہوتا۔ "جنگل کا قانون" ان کا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ٹکراؤ حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَكَذٰلِكَ ..... يَكْسِبُوْنَ (۶/۱۳۰) "اس طرح ہم ظالموں کے ایک گروہ کو ظالموں کے دوسرے گروہ پر حاکم بنا دیتے ہیں"۔ یا ایک ہی قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ ..... بَاْسَ بَعْضٍ (۶/۶۵) یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوم پر مستبد حکام عذاب

بن کر مسلط ہو جاتے ہیں اور عوام ان کے نیچے پستے چلے جاتے ہیں۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ نیچے سے عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حکام کے خلاف بغاوت برپا کر دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لیڈر اور عوام مل کر الگ الگ پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور یہ پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ ان تمام تصادمات کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن جس مقام کو ابھار کر سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے پاس قوت اور دولت کی بھی کمی نہیں۔ تعداد بھی ان کی بہت ہے۔ انہیں غلبہ اور اقتدار بھی حاصل ہے لیکن چونکہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے اس لئے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ روم میں ہے۔ اَوَ لَمْ یَسِیْرُوْا ...... یَظْلِمُوْنَ (۳۰/۹) کیا یہ لوگ زمین پر چلے

غلط اور صحیح نظام کا ٹکراؤ

پھرے نہیں جو یہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ ان سے قوت میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ انہوں نے زمین کو زراعت کے قابل بنایا اور اسے ایسا آباد کیا کہ ان لوگوں نے بھی ویسا آباد نہیں کیا۔ (لیکن ان کا نظام غلط تھا۔ اس لئے ہمارے پیغمبر ان کے پاس آئے لیکن انہوں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور تباہ ہو گئے)۔ سو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ یہ لوگ وحشی اور ظالم تھے۔ یہ عقل و بصیرت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا نظامِ معاشرہ کس قدر کمزور بنیاد پر استوار ہے۔ چنانچہ وہ عاد ثمود

علم و بصیرت کے باوجود تباہی

(اقوامِ گزشتہ) کے متعلق کہتا ہے کہ وَ قَدْ تَّبَیَّنَ ...... کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ (۲۹/۳۸) ان کی تباہی ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے ہویدا ہے۔ ان کی ذاتی مفاد پرستیاں ان کے غلط نظام کو ان کی نگاہوں میں نہایت درخشندہ اور تابندہ بنا کر دکھاتی تھیں۔ اور اس طرح انہیں صحیح راستے پر چلنے سے روکتی تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے

دوسرے مقام پر ہے وَلَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ ...... فِیْہِ (۴۶/۲۶) ہم نے ان اقوام کو ایسا تمکن عطا کیا تھا جو تمہیں بھی نہیں دیا۔ وَجَعَلْنَا لَھُمْ ...... اَفْئِدَۃً اور ہم نے سمع و بصر اور قلب بھی عطا کیا تھا۔ ان کے ذرائع علم بہت وسیع تھے اور دانش و بینش سے بھی بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ ...... یَسْتَھْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) لیکن چونکہ وہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے اور معاشرہ کو اپنے خود ساختہ اصولوں کے مطابق چلاتے تھے۔ اس لئے ان کے سمع و بصر اور قلب ان کے کسی کام نہ آئے۔ اور انہیں اس تباہی نے آلیا جس پر وہ ہنسا کرتے تھے۔ یہ ہے وہ مقام جسے قرآن اُبھار کر سامنے لاتا ہے۔ یعنی ایک قوم کے پاس دولت کی فراوانیاں ہیں۔ سامانِ زیست کی کمی نہیں۔ قوت و سطوت، شوکت و حشمت، جاہ و جلال سب کچھ ہے۔ اس کے ساتھ دنیاوی علوم کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ذاتی مفاد پرستی کے جذبات اس قدر شدید

ہیں کہ وہ ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کئے ہیں، اور انہیں نظر ہی نہیں آتا کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں اس کا انجام کیا ہے۔ ان کے سامنے صحیح نظامِ خداوندی پیش بھی کیا جاتا ہے لیکن (چونکہ وہ ان کے عاجلانہ مفاد کے خلاف جاتا ہے اس لئے) وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

تدبّر کی فسوں کاری سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

سلطنتِ روما کا زوال

تاریخِ تہذیب کا مشہور مؤرخ برفا (BRIFFAULT) سلطنتِ روما کی تباہی کے اسباب وعلل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے:-

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس نظامِ باطل کو کیسے ہی تدبّر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم وضبط اور ادھر اُدھر کی جزئی مرمّت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متموّل بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبّر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن حسنِ انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ (صفحہ ۱۵۹)

آگے چل کر یہی مؤرخ لکھتا ہے:-

اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم وفنون کے وسیع پیمانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں قلبِ ماہیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے گہرے ہوتے ہیں .... قوّت، تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر وقیمت پائی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (صفحہ ۲۵۹)

اس قسم کے غلط نظام کے مآل وانجام کے متعلق وہ کہتا ہے:-

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی

سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اُس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر یہ گناہ کی اجرت موت ہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

یہ تو ایک قدیم تمدن کی تباہی کے اسباب و علل کا تجزیہ تھا۔ تہذیبِ مغرب جس کی چمک دمک اچھے اچھے دیدہ وروں کی نگاہ میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے' اس کے انجام و مآل کے متعلق خود مغرب کے مفکرین جس بُری طرح واویلا مچا رہے ہیں' اس پر ان کی آئے دن شائع ہونے والی تصانیف و مقالات شاہد ہیں۔ (RENE GUENON) اپنی تصنیف (THE CRISIS OF MODERN WORLD) میں لکھتا ہے:-

تہذیبِ مغرب کا مآل

عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے۔ حتّٰی کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر غرق ہو گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اس سے زیادہ مصنوعی ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے..... اس عہد کے انسان نے نہ صرف اپنی ذہنی کاوشوں کو مشینوں کی ایجاد اور ساخت کے لئے وقف کر رکھا ہے بلکہ وہ خود رفتہ رفتہ مشین بن چکا ہے۔

یہ ایجادات جن کا شمار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان قوتوں کو بروئے کار لا رہی ہیں جن کی اصل حقیقت کا علم ان انسانوں کو نہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں..... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں..... دورِ حاضر میں مادی قوانین کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مادہ اس انسان کو برباد کر دے گا جو خود مادہ سے بلند ہوئے بغیر اس کی تسخیر چاہتا ہے۔ اس لئے بعید نہیں کہ موجودہ دنیا خود ان ایجادات ہی کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

پروفیسر آئن سٹائن' اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں لکھتا ہے:-

ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوعِ انسان کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبیعی زندگی میں آرام و عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے..... اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس

کی ذات نہیں ہے. عقل، ذرائع و اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے.

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں معاشرہ کی حالت. فرد کی حالت اس سے بھی زبوں تر ہے. ڈاکٹر ینگ اپنی عمر بھر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

> عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے. اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں. یعنی ان حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی و معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا. یہ تو ہے اس کی خارجی حالت. اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے، تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں. (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL)

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق حکیم الامت (اقبالؒ) نے بہت پہلے کہا تھا کہ

> ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا		اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
> جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا		زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

"زندگی کی شبِ تاریک" میں نورِ سحر، ان مستقل اقدار کے خورشید جہانتاب سے آئینہ پاش ہوتا ہے، جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو آج قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں. جب تک دین کا نظام ان اقدار کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، تاریکیاں چھٹ نہیں سکتیں.

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کے نہ ہونے سے قومیں اس قدر دولت و حشمت، قوت و ثروت، عقل و دانش اور علم و بصیرت کے باوجود تباہیوں کے جہنم میں جا گرتی ہیں ؟ یہ سوال بڑا اہم ہے. لیکن قرآن نے اس کا جو جواب دیا ہے جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے. وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو!

> ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۵۳)
>
> یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ نے جو نعمت کسی قوم کو دے رکھی ہو، وہ اس سے کبھی نہیں چھینتا تاوقتیکہ وہ قوم اپنی ذات (نفسیاتی دنیا) میں تبدیلی نہ کرے. یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا' دیکھنے والا ہے.

داخلی تبدیلی

قرآن نے اس چھوٹی سی آیت میں قوموں کے عروج و زوال کا وہ فلسفہ بیان کر دیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتا. وہ کہتا ہے کہ خارجی دنیا دراصل، انسان کی داخلی دنیا کا عکس

ہوتی ہے۔ جب تک اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی نہ ہو اس کی خارجی دنیا میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر جس قسم کی تبدیلی اس کی داخلی دنیا میں ہوگی اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں ہو جائے گی۔ اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی اس چیز سے ہوتی ہے جسے قرآن اپنی اصطلاح میں "ایمان" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی صحیح زاویۂ نگاہ۔ راست نصب العینِ حیات، وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر یقینِ محکم۔ اس سے انسان کی داخلی قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس سے ایسے محیّر العقول نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کا تصور بھی ویسے نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ "شے" ہے جس کے فقدان کا رونا روتے ہوئے برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ

ایمان کا فقدان

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو تو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔ ضبطِ نفس ہمیشہ معلّمینِ اخلاق کا سب سے پہلا سبق رہا ہے۔ لیکن زمانہ سابقہ میں اس کا کوئی واضح مفہوم سامنے نہیں ہوتا تھا (اس کا مفہوم یہی ہے کہ خارجی قوتوں کو کس طرح صحیح اقدار کے تابع صرف کیا جائے)۔

(AUHORITY AND THE INDIVIDUAL)

ڈاکٹر ینگ (جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے) اس باب میں لکھتا ہے:-

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے حل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا　　جو زندہ مذہب انسان کو مہیا کرتا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی — عقیدہ، امید، محبت، نگہ خود بین۔ (ص۲۶۴)

عصرِ حاضر کے ان محققین و مؤرخین کی یہ تمام تحقیقات تشریح و توضیح ہیں قرآن کی اس آیت کی جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ نیز اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ...... بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱) قرآن قوموں کے عروج و زوال کا راز ان کے تغیرِ نفس میں بتاتا ہے اور تغیرِ نفس پیدا ہوتا ہے وحی کی اقدار پر یقینِ محکم سے۔

اُوپر کا طبقہ پہلے بگڑتا ہے

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قوموں میں خرابیوں کی ابتداء ان کے اوپر کے طبقے سے شروع ہوتی ہے۔ اور وہاں سے پھیل کر یہ نیچے کے طبقے کو متاثر کرتی ہیں:

وَ کَذٰلِکَ...... لِیَمْکُرُوْا فِیْھَا (۶/۱۲۳) یہ بڑے بڑے مجرمین اس امر کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں کہ ان کے قائم کردہ غلط نظام کے بندھن ڈھیلے نہ ہونے پائیں۔ یہ "اکابر مجرمین" وہ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں: وَ اتَّبَعَ

الَّذِیْنَ..... مُجْرِمِیْنَ (۱۱/۱۱۶) یہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اس طرح ظلم و استبداد اور غصب و نہب کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو کاروانِ ملّت کے قافلہ سالار بنتے ہیں لیکن قافلہ کو تباہیوں کے گھر میں جا کر اتار دیتے ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں ہے: اَلَمْ تَرَ..... بِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۸-۲۹) "کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناسپاس گزاری کرتے ہیں اور قوم کے قافلہ کو اس منڈی میں لے جاتے ہیں جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ یعنی اسے تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا اتارتے ہیں ــــ اور وہ کیسی بُری منزل ہے۔"

لیکن قرآن لیڈروں کو موردِ الزام قرار دے کر، عوام کو بری الذمہ نہیں ٹھہرا دیتا، وہ انہیں بھی برابر کا مجرم قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا منشاء یہ نہیں کہ عوام بھیڑوں کی طرح سر نیچا کئے چرواہے کی آواز پر چلتے جائیں۔ وہ عوام کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کریں اور صرف اسی راستے پر چلیں جو ان کے نزدیک عافیت اور سلامتی کا راستہ ہو۔ قرآن نے اس حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لیڈر اور ان کے متبعین (FOLLOWERS) دونوں جہنم میں جمع ہوں گے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کریں گے۔ عوام لیڈروں سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور صحیح راستے پر چلتے (۳۴/۳۱)۔ لیڈر اس کے جواب میں کہیں گے کہ قصور سارا تمہارا اپنا ہے اور ناحق الزام ہم پر دھرتے ہو۔

جہنم میں عوام اور لیڈروں کا مکالمہ

صحیح راستہ تمہارے سامنے تھا۔ اگر تم اس پر چلنا چاہتے تو تمہیں کون روک سکتا تھا؟ ہم نے تمہیں کبھی نہیں کہا کہ تم صحیح روشِ زندگی چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگو۔ مجرم تو خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو (۳۴/۳۲)۔ اس کے جواب میں عوام کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم زبان سے تو ہمیں نہیں کہتے تھے کہ ہم جرائم کے مرتکب ہوں۔ لیکن تم دن رات اس قسم کی سازشوں اور تدبیروں میں مصروف رہتے تھے جن سے بچ نکلنا سادہ لوح عوام کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس طرح تم بالواسطہ ہمیں مجبور کر دیتے تھے کہ ہم قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر تمہاری تجویز کردہ راہوں پر چل نکلیں (۳۴/۳۳)۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ متبعین خدا سے درخواست کریں گے کہ ہمارے یہ بڑے بڑے لیڈر جنہوں نے اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہ کیا ہے انہیں دوچند عذاب دیجئے۔ ایک حصہ ان کے اپنے جرائم کا اور ایک حصہ ان جرائم کا جو انہوں نے ہم سے کرائے (۳۳/۶۷)۔

ان اور اسی قسم کے دیگر کئی ایک مقامات میں لیڈروں اور عوام کے اسی قسم کے مکالمات کے تمثیلی بیان سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی میں عوام اور اکابر دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اکابر اس لئے کہ وہ اپنی مفاد پرستیوں کی خاطر عوام کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ اور عوام اس لئے کہ وہ ان غلط کار اکابرین کی ہوس پرستیوں کی خاطر

آلہ کار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں. لیڈروں کی قوت درحقیقت عوام ہی سے ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے متاثر ہو کر، تباہی اور بربادی کی زنجیروں کی مختلف کڑیاں بنتے ہیں، اس طرح "ایک قوم" دوسری قوم کی نقالی سے تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے. سورۂ اعراف میں ہے کہ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا (۷/۳۸) جب کبھی ایک قوم جہنم میں داخل ہوگی تو وہ اپنی بہن دوسری قوم پر لعنت کرے گی (کہ ہمیں اس نے تباہ کیا) حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا ...... مِّنَ النَّارِ (۷/۳۸) یہاں تک کہ جب تمام اقوام تباہی کے جہنم میں اکٹھی ہو جائیں گی تو بعد میں آنے والی قومیں اپنی پیشرو قوموں کے متعلق کہیں گی کہ اے ہمارے پروردگار! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا سو انہیں دوگنا عذاب دے: قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ (۷/۳۸). اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے دگنا عذاب ہے. اس لئے کہ اگر پیشرو قومیں اس لئے دُگنے عذاب کی مستحق ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا تو ان کے پیچھے لگنے والی قومیں اس لئے دوسرے عذاب کی سزاوار ہیں کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے کیوں لگیں؟ (جیسا کہ ہم وحی اور عقل کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں) قرآن کے نزدیک اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینا اور دوسروں کی اندھی تقلید کئے جانا، ایسی روش ہے جو افراد اور اقوام دونوں کو سیدھا جہنم کے گڑھے میں جا گراتی ہے. اس لئے قرآن کی رُو سے ہر قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے کام لے اور جو راہ قوانینِ خداوندی نے متعین کی ہے اس پر چلے. اس سے وہ شادابیوں اور سرفرازیوں کی جنت کے راستے پر چل نکلے گی. لیکن اگر اس نے اپنی دانش و بینش سے کام لینا چھوڑ دیا تو اس کا یہی جرم اس کی تباہی کے لئے کافی ہوگا. قرآن تو اچھی روش پر بھی بلا سوچے سمجھے چلنے کی اجازت نہیں دیتا (۲۵/۷۳) چہ جائیکہ کسی دوسری قوم کی تقلید محض اس لئے کی جائے کہ اسے دنیا میں زیادہ قوت و اقتدار حاصل ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) عارضی غلبہ و اقتدار اور دولت و ثروت (کچھ عرصہ کے لئے) غلط نظام سے بھی حاصل ہو جاتا ہے. لیکن اس کا انجام بہرحال تباہی اور بربادی ہوتا ہے! وَكَمْ أَهْلَكْنَا ..... نَحْنُ الْوَارِثِينَ (۲۸/۵۸) اور کتنی بستیاں ایسی تھیں جنہیں ہم نے سامانِ زیست کی فراوانیوں کے باوجود تباہ و برباد کر دیا" (اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ غلط بنیادوں پر استوار تھا) یہ دیکھو ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے اور ان کے وارث ہم ہی ہوئے." فَهِيَ خَاوِيَةٌ ..... قَصْرٍ مَّشِيدٍ (۲۲/۴۵) "ان کے رفیع الشان محلات کھنڈرات بن گئے. ان کے کنوئیں ویران ہو گئے. ان کا نام و نشان مٹ گیا." وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ (۲۳/۴۴) "اور ان کی فقط داستانیں باقی رہ گئیں." قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ..... الْمُجْرِمِينَ (۲۷/۶۹) ان سے کہو کہ تم مختلف ممالک کی سیر کرو اور ان کے کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے یہ پوچھو کہ غلط رو قوموں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

تابع اور متبوع قومیں

اس طرح قرآن اقوامِ گزشتہ کے احوال و کوائف سامنے لاکر (تاریخی شواہد کے مطالعہ سے) اس حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے کہ غلط نظامِ زندگی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ان تاریخی نوشتوں سے وہی قومیں سامانِ عبرت حاصل کرسکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے أَفَلَمْ يَسِيرُوا ..... يَسْمَعُونَ بِهَا (۲۲/۴۶) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى ..... فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) اس لئے کہ انسان کی (ماتھے کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینے کے اندر ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، کسی قوم کے عروج و زوال اور اس کی موت و حیات کا فیصلہ اس نظام کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ قوم اپنے لئے اختیار کرتی ہے۔ ایسے نظام کی اساس و بنیاد، اس کے اجزائے ترکیبی، اور مابہ الامتیاز خصوصیات کیا ہیں، جو قوموں کے عروج و بقار کا ضامن بنتا ہے، اس کے متعلق سابقہ ابواب میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قرآنِ کریم نے جو بنیادی اصول دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ سامنے لایا جائے اور وہ اصول یہ ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

وہی نظریۂ حیات، وہی اصولِ زندگی، وہی نظامِ معاشرہ، دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کی منفعت بخشی، کسی خاص گروہ، خاص پارٹی، خاص ملک، خاص قوم تک محدود نہ ہو، بلکہ وہ ساری کی ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔

یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظامِ زندگی استوار کرتا ہے۔ اور یہی اصول قوموں کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔

ہم نے پچھلے صفحات میں کہا ہے کہ اگر کوئی قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلے۔ دولت اور قوت میں بڑھی ہوئی ہو۔ دنیا کے ایک بڑے حصے پر اس کی حکومت مستحکم ہو۔ اسے علوم و فنون سے بھی بہرۂ وافر ملا ہو۔ دانش و بینش میں بھی کسی سے کم نہ ہو۔ لیکن ان تمام اسباب و عناصر کے باوجود، اگر اس کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے، تو اسے نہ اطمینان نصیب ہوسکتا ہے اور نہ ہی استحکام۔ جب تک وہ نظام موجود رہتا ہے لوگ مضطرب و ہراساں

رہتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی وہ نظام، اپنی بنیادی خرابیوں کی وجہ سے، خود بخود زوال وانحطاط کی طرف بڑھتے چلے جاتا ہے. عصرِ حاضر کی تہذیب، قرآن کے اس دعوے کی کس طرح زندہ شہادت ہے. اس کا اجمالی ذکر آیندہ باب میں ملے گا.

○
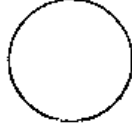
باب چہاردہم

انسان اور خارجی کائنات

افراد ہوں یا اقوام (بالخصوص اقوام) ان کی موت اور حیات کے فیصلے کے لئے ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ خارجی کائنات کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ یا ردِّ عمل کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس نے انسان کو ہمیشہ وقفِ اضطراب رکھا ہے۔ قرآن نے اسے بڑی اہمیت دی ہے اور اس کا صحیح جواب نہایت واضح اور بین الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جب انسانی شعور نے پہلے آنکھ کھولی تو اس نے اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر آتشباری کرنے والا ایک عظیم اور مہیب گولا، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، ادھر اُدھر ساحل نا آشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں، کف بردہاں اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی خوف سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدھے، کبھی بادل کی لرزہ خیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی وحشت انگیز آندھی، کبھی بلاخیز جھکڑ، کبھی کوہِ آتش فشاں کی مرگ سیاں کی یلغار، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدھام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سر و سامان نہتا ابنِ آدم۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردِّ عمل اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ جو بلا سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کر دے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے یہ اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ اس طرح فطرت کی مختلف قوتیں اس کا "اللہ" اور یہ ان قوتوں کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر، حتیٰ کہ وبائی امراض سب دیوی دیوتا تصور کر لئے اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت سماجت اور مدح و ستائش سے انہیں خوش کرنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اس ماحول میں) انسان کا اوّلین ردِّ عمل خارجی کائنات کے متعلق۔ رفتہ رفتہ اس ردِّ عمل نے مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ

انسان کا پہلا ردِّ عمل

یا تصور، مذہب کی شکل اختیار کرلے، تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب، کائنات کے متعلق انسان کے اس اوّلیں ردِ عمل کے مظاہر ہیں۔

یہ دنیا تو ہم پرستی کی دنیا تھی۔ دوسری طرف جہانِ علم و بصیرت کی طرف آئیے تو وہاں (بدقسمتی سے) انسانیت ایک اور حادثے سے دوچار ہوئی جس نے اسے تو ہم پرستی کی جہالت سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ جہاں تک تاریخی نوشتے ہماری راہ نمائی کرتے ہیں علم و حکمت کا اوّلیں گہوارہ خطۂ یونان تصور کیا جاتا ہے۔ اور سقراط کو وہاں کے حکماء کا ابوالآباء قرار دیا جاتا ہے۔ سقراط کا نظریہ یہ تھا کہ مطالعہ کے قابل صرف انسان کی ذات ہے۔ خارجی کائنات نہیں۔ افلاطون جو سقراط کا شاگرد لیکن خود ایک الگ مکتبِ فکر کا امام ہے، اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیائے محسوسات (خارجی کائنات) درحقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ حقیقی دنیا، عالمِ امثال (WORLD OF IDEAS) کی ہے، جو کہیں، آنسوئے افلاک، واقع ہے۔ اور یہ مرئی کائنات اس کا عکس ہے۔ اس نظریہ سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ یعنی جب یہ عالمِ محسوسات، درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتا بلکہ محض فریب اور سراب ہے (بلکہ عالمِ خواب) تو اس کے متعلق جو علم، انسانی حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل ہوگا وہ بھی کچھ حقیقت نہیں رکھے گا۔ حقیقی علم وہی ہوگا جو انسان کو ــــ چشم بند و گوش بند و لب بہ بند کے بعد ــــ اپنی دنیا میں جذب ہو جانے سے حاصل ہو۔ یہی علم قابلِ اعتماد اور یقینی ہوگا۔ محسوسات کا علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوگا۔

افلاطونی نظریہ

یہ تھا کائنات اور علمِ محسوسات کے متعلق افلاطون کا وہ نظریہ جس پر یونانی تصوّف کی عمارت استوار ہوئی۔ یہ تصوّف وہاں سے نکل کر ساری دنیا کو متاثر کر گیا۔ اس نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ اس فلسفہ کی رُو سے پرا کرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ کائنات، برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھل گئی یہ خواب معدوم ہو جائے گا۔ یہ عظیم کارگہ کائنات ایشور کی لیلا (ناٹک کا کھیل) ہے جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے یہی فلسفہ ہے جو ایرانی مغبچوں کے ہاتھوں "شرابِ معرفت" بن کر چھلکا اور عیسائیت کی خانقاہوں تک کو کیف آلود کر گیا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا کہ کائنات کو باطل قرار دے دیا گیا اور دنیا ایک قابلِ نفرت شے تصور کر لی گئی جس سے دُور بھاگنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا۔

یہ تصوّف کا نظریہ ہے

یہ تھا کائنات کے متعلق ذہنِ انسانی کا ردِ عمل اس زمانے میں جب قرآن نازل ہوا۔ یعنی دنیائے مذاہب کائناتی

قوتوں کو معبود بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز تھی اور جہانِ فکر اور عالمِ تصوّف کائنات کو باطل قرار دے کر اس سے نفرت میں روحانی ترقی کا راز پا رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن سے پہلے بعض قرآن ایسے ملتے ہیں جن میں کائنات کی صحیح پوزیشن بھی سامنے آجاتی ہے۔ یہ وحی پر مبنی تعلیم کا اثر تھا جو مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتی رہی۔ لیکن چونکہ نزولِ قرآن کے وقت وحی کی تعلیم اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں موجود نہ تھی۔ اس لئے فکرِ انسان کی عمومی حالت وہی تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

قرآن کا تصوّر

قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے مذہب کی دنیا کو للکارا۔ اس نے پہلے ہی پارہ میں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا۔ واضح رہے کہ قصۂ آدم کسی فرد (بابا آدم) کی داستان نہیں، آدم، خود آدمی ہے اور اس کا قصہ آدمی کی اپنی کہانی۔ اس نے کہا کہ آدمی کا مقام یہ ہے فطرت کی تمام قوتیں (جنہیں قرآن ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے) کے سامنے سجدہ ریز ہیں[1]۔ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (۲/۳۴) اس ایک (انقلاب انگیز) اعلان سے قرآن نے مسجود کو ساجد اور ساجد کو مسجود بنا دیا۔ اس نے انسان سے کہا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (۱۴/۳۳) خدا نے چاند اور سورج کو تمہارے تابع تسخیر کر دیا کہ وہ تمہاری خدمت میں مدام مصروفِ خرام رہیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ (۱۴/۳۳) اس نے دن اور رات کو بھی تمہارے لئے تابع فرمان بنا دیا؛ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۱۴/۳۲) اس نے دریاؤں (اور سمندروں) کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ المختصر یہ کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اسے تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرو اور اس کے ذریعے ان تمام قوتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح، مقامِ آدم کو بے نقاب کر کے، کائنات اور خود انسانی دنیا کا نقشہ بدل دیا! اس کی اس حقیقت کشا تعلیم سے ذہنِ انسانی کے تراشیدہ، دیوی دیوتا، جن، بھوت، پریت سب اس کے حضور خدمت کے لئے دست بستہ کھڑے ہو گئے؛ اور پتھروں کے آگے ماتھا رگڑنے والا انسان، کس طرح آسمان کی بجلیوں تک کا مخدوم و مسجود بن گیا!

طلسمِ افلاطون کی شکست

دوسری طرف قرآن نے دنیائے تصوّف کو للکارا اور ایک غلغلہ انگیز نعرہ سے طلسمِ افلاطون کی دھجیاں فضائے بسیط میں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے کہا کہ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا "کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کو؛ اور جو کچھ ان کے

---

[1] تفسیر ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

درمیان ہے ہم نے باطل پیدا نہیں کیا؛ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا...... (۳۸/۲۷) یہ ان لوگوں کا وہم اور قیاس ہے جو حقیقت کا انکار کرتے ہیں: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷) اور جو حقیقتِ ثابتہ کا انکار کرکے کائنات کو باطل بتاتے ہیں ان کی سعی و عمل راکھ کا ڈھیر ہوکر رہ جاتی ہے اور آخرالامر ان کے حصے میں ندامت و پشیمانی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کائنات کے متعلق غلط زاویۂ نگاہ کو کفر (اور اس کے برعکس صحیح زاویۂ نگاہ کو ایمان) قرار دے کر اس سوال کو کتنی اہمیت کا حامل بتایا ہے! جو شخص کائنات کو باطل قرار دے، وہ قرآن کی رو سے مومن نہیں، کافر ہے۔ خدا نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا: خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ. اس نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اس کا وجود، فریب اور دھوکا نہیں۔ یہ فی الحقیقت موجود ہے اور ایک مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے؛ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۹/۴۴) "اس میں ایمان والوں کے لئے بڑی نشانی ہے۔"

کائنات کو ایشور کی لیلا قرار دینے والوں سے اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۴۴/۳۸) "ہم نے کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔" وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۹) ہم نے انہیں بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ خیال کہ کائنات یونہی بطور کھیل تماشا کے پیدا کر دی گئی ہے ان لوگوں کا وہم ہے جو علم و حقیقت سے بے خبر ہیں۔

علم کی تعریف

کائنات کے متعلق زاویۂ نگاہ میں اس قدر تحیر انگیز انقلاب پیدا کرنے کے بعد ضروری تھا کہ علم بالحواس (SENSE PERCEPTION) کے متعلق انسانی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) "تمہارے سمع، بصر اور فواد، سب سے یہ پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اُس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی جسے صحیح سمجھا گیا تھا؟"

یہ آیت بڑی غور طلب ہے۔ اس میں علم اسے کہا گیا ہے جس کی شہادت سمع و بصر اور فواد دیں۔ سمع و بصر، انسانی حواس (SENSE) ہیں جن کا کام یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے متعلق معلومات فراہم کرکے فؤاد (MIND) تک پہنچا دیں۔ اور پھر فؤاد (MIND) ان سے استنباط کرے۔ علم کی اس تعریف (DEFINITION) میں علم بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) اور فکری و تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) دونوں آجاتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک "سمع و بصر و قلب" کی اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس نے صاف الفاظ میں

کہہ دیا کہ جو لوگ اس سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں، اور جہنمی ہیں۔ سورۂ اعراف میں

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے جہنمی ہیں

ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (۷/۱۷۹) شہری اور صحرائی آبادیوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ یعنی لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ٥ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ لوگ حقائق کائنات سے بے خبر رہتے ہیں۔

ان کے برعکس وہ ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جن کے متعلق کہتا ہے کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (۳/۱۹۰) یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں، ان اربابِ دانش و بینش کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ

کائنات میں غور و فکر کرنیوالے

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ (۳/۱۹۱) جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ اور تخلیق ارض و سما میں انتہائی غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے مسلسل تجربات اور پیہم مشاہدات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۱) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس عظیم سلسلۂ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَكَ یہ تجھ سے بہت بعید تھا کہ تیرا تخلیقی پروگرام بلا مقصد ہوتا۔ تیرے متعلق ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض ہماری کوتاہ علمی اور ریسرچ (تحقیق) کی کمی ہے جو ہم کائنات کی بہت سی چیزوں کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اور اس لئے ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم عدمِ علم کی بنا پر اشیائے کائنات کے تخریبی پہلو سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۱) اس لئے کہ جو قومیں اشیائے فطرت کے متعلق تحقیق نہیں کرتیں اور اس لئے ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں وہ دنیا میں ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ (۳/۱۹۲) اور ایسی قوموں کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۲)

اس مقام پر ان لوگوں کو جو اشیائے کائنات کے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد رموزِ فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں،

یہی مومن و متقی ہیں

قرآن نے صاحبانِ "عقل و بصیرت" کہا ہے۔ دوسرے مقام پر انہیں "مومنین" سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۴۵/۳) یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں۔ وَ فِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴۵/۴) "اور تمہاری پیدائش میں اور دیگر جانداروں کی افزائشِ نسل میں، ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو (کائنات کے بالحق ہونے پر) یقین رکھتے ہیں"۔ یہی لوگ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں: وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴۵/۵) اور دن رات کی گردش میں اور بارش میں جسے خدا بادلوں سے برساتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ اور ہواؤں کے رُخ کی تبدیلی میں، اربابِ عقل و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔

کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا گیا کہ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتْلُوْھَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ۔ یہ وہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں خدا حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کے بعد بھی حق پر ایمان نہیں لاتے ان سے پوچھو کہ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ، بَعْدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤْمِنُوْنَ (۴۵/۶) یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے بعد اور کس

انہی سے ایمان حاصل ہوتا ہے

چیز پر ایمان لائیں گے؟ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو گوشے ہیں۔ ایک اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک علیم و خبیر ہستی اپنے محکم، اٹل اور تعمیری قوانین کی رُو سے چلا رہی ہے۔ دوسرے قرآنی تعلیم میں تدبّر و تفکّر جس نے اس زمانے میں انسان کے لئے تسخیرِ کائنات کا اعلان کیا، جب ساری دنیا، یا تو کائناتی قوتوں کو معبود بنائے ہوئے تھی اور یا اسے فریبِ نظر اور قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دُور بھاگتی تھی۔ ایسے ماحول میں اس قسم کی انقلاب آفریں آواز بلند کرنا کسی انسانی ذہن کا کام نہیں۔ اس "آواز" کا سرچشمہ یقیناً وہی خدائے علیم و بصیر ہو سکتا ہے جو انسان اور کائنات دونوں کے صحیح مقامات سے باخبر ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مطالعہ فطرت اور قرآن میں غور و تدبّر کے بعد بھی خدا پر ایمان نہیں لاتا تو پھر کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس سے وہ خدا پر ایمان لا سکے۔

ایمان، وہ تصورِ حیات ہے جو انسانی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ آتا ہے۔ تقویٰ کے متعلق یوں سمجھئے کہ یہ وہ مسلک اور منہاج ہے جس کے مطابق مومن اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ مومنین کے لئے خارجی کائنات کے

شواہد و مظاہر پر غور و فکر کس قدر ضروری ہے اس کے متعلق ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ یہ غور و فکر متقیوں کے لئے بھی ویسا ہی ضروری ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ○ (۱۰/۶) یقیناً اختلافِ لیل و نہار اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا ہے ان میں تقویٰ شعار قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن نے "سَمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی ہے۔ سمٰوٰت (اجرامِ فلکی) پر غور و فکر کا ایک شعبہ تو وہ ہے جسے علم الافلاک (ASTRONOMY) کہتے ہیں۔ لیکن قرآن اس سے بھی آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمین میں ہی نہیں بلکہ اجرامِ فلکی میں بھی ذی حیات مخلوق ہے اور اس کے متعلق غور و فکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سورۂ

آسمانوں میں ذی حیات مخلوق

شوریٰ میں ہے؛ وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ (۴۲/۲۹) اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض اور سمٰوٰت کو پیدا کیا اور ان دونوں (یعنی ارض اور سماوات) میں ذی حیات مخلوق کو پھیلا دیا۔ غور فرمایئے کہ آسمانی کروں میں زندہ مخلوق کی نشاندہی بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے کرائی ہے۔

قرآن کی رُو سے علم کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی علم وہ ہے جس کی شہادت انسان کے حواس دیں اور اس کی تائید اس کا قلب (MIND) کرے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کے نزدیک عالم کون ہے؟

عالم کی تعریف

قرآن میں "علماء" کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ سورۂ شعراء میں اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۱۹۷) یہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں "خدا کے بندوں میں" سے علماء کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے؛ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (۳۵/۲۷) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ (۳۵/۲۷) اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (۳۵/۲۸) اور اس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ بساطِ فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم کا جن میں طبیعیات (PHYSICS) نباتیات (BOTANY) حیوانیات

(ZOOLOGY) طبقات الارض (GEOLOGY) فضائیات (METEOROLOGY) اور عالمِ انسانیت کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (۳۵/۲۸) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر اس کی منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں سائنسٹ، اور کائناتی مفکر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کائناتی مظاہر پر غور و فکر کریں۔ اسی طرح قرآن کے حقیقتِ ثابتہ ہونے کا یقین بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو

نفس و آفاق میں آیات

خارجی کائنات اور دنیائے انسانیت میں غور و فکر کریں۔ اس کا ارشاد ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں عالمِ آفاق اور عالمِ انفس میں دکھائیں گے تا آنکہ یہ بات اُبھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یعنی جوں جوں کاکُلِ زمانہ کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے حقائق، مشاطگیٔ علم و تحقیق سے کھلتے جائیں گے قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۱/۵۳) قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے اور یہ چیز اس امر کی کافی دلیل ہے کہ حقائقِ کائنات کے متعلق جو کچھ خدا کہے گا وہی یقینی طور پر درست ہوگا؛ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶) قرآن کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ لہٰذا جو لوگ انفس و آفاق کی ان نشانیوں پر غور و فکر کریں گے انہیں ان میں تجلّیاتِ خداوندی بے نقاب نظر آجائیں گی۔ جو قومیں ان آیات اللہ سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتی ہیں، یوں سمجھ لو کہ انہیں "خدا" کو اس طرح بے نقاب دیکھ لینے پر یقین نہیں ہوتا: اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ (۴۱/۵۴)۔ حالانکہ انہیں اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ جس شے کی بھی اس طرح ریسرچ شروع کر دیں اس میں خدا کا قانونِ ربوبیّت جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے گا۔ اس لئے کہ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱/۵۴) خدا کا قانون ہر شے کو محیط ہے۔ وہ کسی ایک شے کے ساتھ مختص نہیں۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات میں مومنین اور متقین کے لئے ہر جگہ آیات اللہ ہیں۔ اس سے یہ

صرف تسخیرِ فطرت ایمان نہیں

نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان اور تقویٰ کے معنی اشیائے کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق ہے اور جو قومیں تسخیرِ فطرت کرتی ہیں وہ مومن اور متقی ہوتی ہیں. مومن اور متقی وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق (نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ) کے لئے صرف کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں. مومن ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں. یعنی تسخیرِ فطرت اور اتباعِ قوانینِ خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں. اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے ایک کی بھی کمی

مومن ہونے کی شرائط

ہے تو وہ مومن اور متقی نہیں کہلا سکتی: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں." جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کر لیتی ہیں لیکن امورِ زندگی کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتیں وہ بھی کافر ہیں. انہیں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے کی وجہ سے طبیعی دنیا کے مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ ان قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف نہیں کرتیں اس لئے آخر الامر وہ بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہیں. جس طرح وہ جو سرے سے تسخیرِ فطرت ہی نہیں کرتیں. یہی وہ قومیں ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے: فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ (۴۶/۲۶). ان کے سمع و بصر اور فؤاد ان کے کسی کام نہ آئے کیونکہ وہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے، وہ تباہ و برباد ہو گئے. لہٰذا قرآن کی رو سے صورتِ حالات یوں ہوئی کہ

حاصلِ مبحث

(۱) جو قومیں سمع و بصر و فؤاد سے کام لے کر تسخیرِ فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں وہ مومن و متقی ہیں. ان کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ و تابناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب.

(۲) جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں، مومن اور متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں. وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔ اس دنیا میں مستقبل بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی.

(۳) اور جو قومیں سرے سے تسخیرِ فطرت کرتی ہی نہیں وہ مومن و متقی ہونا تو کجا مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں. اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ (۱۰/۸). ان کے لئے اس دنیا میں بھی ذلت و خواری ہے اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی. اس لئے کہ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲) جو یہاں کا اندھا ہے

وہ وہاں کا بھی اندھا ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا　　جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا

جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

باب پانزدہم
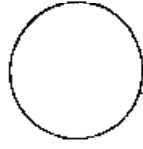
مُستقل اقدار

(PERMANENT VALUES)

سابقہ ابواب میں یہ حقیقت سامنے آچکی ہے کہ دین کی عمارت، مستقل اقدار کے گرد گھومتی ہے. یا یوں کہئے کہ دین وہ مستقل اقدار دیتا ہے جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بن جاتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں اور کامرانیوں کی ضامن. زیرِ نظر باب میں ان اقدار کا اجمالی سا تعارف کرایا جاتا ہے." اجمالی سا" اس لئے کہ ان کی تفصیل کے لئے پورے کا پورا قرآن سامنے لانا ہوگا.

مستقل اقدار میں بلند ترین قدر خود انسانی ذات ہے اس لئے سلسلۂ کلام کا آغاز اُسی کے تعارف سے کیا جاتا ہے.

۱۔ انسانی ذات

جیسا کہ پہلے باب میں بتایا جاچکا ہے، قرآن، انسانی ذات کو "نفس" کہہ کر پکارتا ہے اور اسے الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) قرار دیتا ہے. اگرچہ اس سلسلہ میں (پہلے اور دوسرے باب میں) تفصیل سے لکھا جاچکا ہے لیکن غیر از محل نہ ہوگا اگر ہم اس میں سے کچھ اشارات کو یہاں دہرادیں تاکہ اس تکرار سے بات زیادہ واضح اور دل نشین ہوجائے. جب قرآن تخلیقِ انسانی کے مختلف مراحل کا ذکر کرنے کے بعد (جس کا تعلق اس کی جسمانی اور طبعی ساخت سے ہے اور جو دیگر حیوانات میں بھی مشترک ہیں) کہتا ہے کہ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹) "خدا نے اس میں اپنی توانائی پھونک دی" تو اس سے مراد یہی انسانی ذات ہے جس سے سلسلۂ ارتقاء کی یہ کڑی (انسان) اپنی سابقہ کڑیوں (حیوانی زندگی سے بکسر جدید) الگ اور متمیز ہوجاتی ہے." ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴)" پھر ہم نے اسے بالکل دوسری مخلوق بنادیا" سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے. انسانی زندگی سے مقصود نفسِ انسانی کا نشوو ارتقاء (DEVELOPMENT) ہے جس کا طریقہ دین سکھاتا ہے؛ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۹۱/۹-۱۰)" جس نے اس کی نشوونما کی وہ پھُولا پھلا، جس نے اسے دبا دیا وہ تباہ و برباد ہوگیا" انسان کے ہر عمل (کام) کا اثر انسانی ذات پر ہوتا ہے. اعمال حسنہ (یا خیر)

وہ ہیں جن سے اس (ذات) میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اور اعمالِ سیئہ (شر) وہ ہیں جن سے اس میں ضعف و اضمحلال واقع ہوجاتا ہے۔ استحکامِ خودی سے انسان حیاتِ جاوید حاصل کرسکتا ہے۔ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی (۵۶/۴۴) "اس (جنت کی زندگی) میں وہ سوائے پہلی موت کے جو جسم پر وارد ہوتی ہے، موت سے دوچار نہیں ہوں گے۔"

"الوہیاتی توانائی" کی اصطلاح ذرا وضاحت طلب ہے۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی کا ظہور ہوتا ہے لیکن یہ توانائی مادی اسباب و علل یا طبعی قوانین کی رُو سے نمود میں آتی ہے۔ اسے مادی توانائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جانداروں کے جسم میں بھی اس توانائی کی نمود ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے جسم میں۔ لیکن انسان کی صورت میں، ایک اور توانائی بھی ہے جو اس کے اختیار و ارادہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ توانائی مادی توانائی سے کہیں زیادہ قوی ہے کیونکہ مادی توانائی اس کے تابع کام کرتی ہے۔ اس توانائی کو مادی توانائی سے متمیز کرنے کے لئے خدا نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور "رُوْحَنَا" کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات کہتے ہیں۔ اس کے لئے ہم نے "الوہیاتی توانائی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ واضح رہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ یہ توانائی خدا کی عطا کردہ ہے۔ اسے مادی توانائی سے متمیز کرنے کے لئے الوہیاتی توانائی کہا جاتا ہے۔ (ورنہ یوں تو مادی توانائی بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے اور اسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ظہور میں آتی ہے)۔

انسانی ذات بلند ترین مستقل قدر ہے۔ باقی اقدار اس کی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور جب اس میں پختگی پیدا ہوجاتی ہے تو یہی اقدار سورج کی کرنوں کی طرح اس میں سے خود بخود پھوٹتی اور ابھرتی چلی آتی ہیں۔

واضح رہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ انسانی جسم کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانی جسم (یعنی انسان کی طبیعی زندگی اور اس کے ساز و سامان) اپنی اقدار رکھتے ہیں۔ جن کا تحفظ ضروری ہے لیکن یہ اقدار مستقل نہیں، اضافی ہیں۔ جب طبیعی زندگی اور انسانی ذات کے مفادات میں تصادم ہوجائے تو انسانی ذات کے مفاد کے تحفظ کے لئے طبیعی زندگی اور اس کے مفاد کو قربان کردینا چاہیئے۔ تفصیل ان اشارات کی آگے چل کر آئے گی۔

سو پہلی اور بنیادی قدر ہے، انسانی ذات۔

۲۔ احترامِ آدمیت

چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ اس لئے ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام قرار پاجاتا ہے۔ "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔" لہٰذا احترامِ آدمیت ایک مستقل قدر ہے جسے کسی مفاد اور مقصد کی خاطر کسی حالت میں بھی قربان نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے ذات، پات، حسب نسب اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات بھی ختم ہوجاتے ہیں۔ قرآن تمام نوعِ انسان کو مخاطب کرکے کہتا ہے خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱) "ہم نے

تم سب کو نفسِ واحدہ (ایک (LIFE-CELL)) سے پیدا کیا ہے. نیز پیدائش کے اعتبار سے مرد اور عورت کو بھی ایک دوسرے پر کوئی تفوق نہیں. چنانچہ مذکورہ صدر آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً (۴/۱)" اس نے اس خلیۂ زندگی (LIFE CELL) کو دو حصّوں میں تقسیم کرکے اسے جوڑا بنا دیا (یعنی (OVUM) مادہ خلیہ اور (SPERMATAZOON) نر کا خلیہ) اور ان سے مردوں اور عورتوں کی کثیر تعداد دنیا میں پھیلا دی." البتہ بعض خصوصیات مردوں میں ایسی رکھ دی گئی ہیں جو عورتوں میں نہیں. اور بعض خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں. اور اس طرح ایک جنس کو دوسری جنس پر (مردوں کو عورتوں پر اور عورتوں کو مردوں پر) فضیلت دے دی گئی ہے (۴/۳۲). تفصیل ان امور کی آئندہ باب میں ملے گی.

لہٰذا دوسری مستقل قدر "احترامِ آدمیت" ہے.

۳۔ مدارج بہ اعتبارِ عمل

پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق متعین ہوں گے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) "ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے. جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا.

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳)

اے نوعِ انسانی ہم نے تمہیں نر اور مادہ (کے خلیہ) سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا (تم نے اپنے لئے قبائل اور خاندان بنا لئے) مقصد اس سے صرف یہ ہے کہ تم پہچانے جا سکو (ورنہ جہاں تک عزت و تکریم کا تعلق ہے اس اصول کو یاد رکھو کہ) تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اس کے قوانین کی نگہداشت اور اپنے فرائض کی پابندی کرتا ہے.

تیسری مستقل قدر یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار انسان کے جوہرِ ذاتی ہیں، نہ کہ اضافی نسبتیں.

۴۔ عدل

تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں سمجھنا. ہر ایک کے لئے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج متعین کرنا. محنت کے

اپنی مرضی کے تابع چلائے۔ اور نہ ہی مذہب کی دنیا میں (اور تو اور) کسی نبی تک کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے۔ ہر فرد کی آزادی اور اس آزادی کا احترام ایک بنیادی اور مستقل قدر ہے جسے کسی حالت میں بھی پامال نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰۔ قانون کی اطاعت

لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی معاشرہ اور کوئی نظام قائم نہیں ہو سکتا اور نہ باقی رہ سکتا ہے جب تک افراد پر کچھ پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ پابندیاں قانون کی رو سے عائد ہوں گی۔ اور اس قانون کی اصولی حدود وحی کی رُو سے (خدا کی طرف سے) متعین ہوں گی۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی جس آیت (۳/۷۸) کا پہلا ٹکڑا اوپر دیا گیا ہے یعنی "مَا كَانَ لِبَشَرٍ ..... مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اس کا باقی حصہ یہ ہے: وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۹) پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ "کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب ربانی (خدا کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔ اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے (جو تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے) جس کی تم ایک دوسرے کو تعلیم دیتے ہو اور اسے اپنے دلوں پر منقوش کرتے رہتے ہو۔

اس سے دو باتیں واضح ہیں، ایک یہ کہ کسی انسان کو ــــ خواہ اسے جزئی قوانین وضع کرنے یا قانون نافذ کرنے کے اختیارات بھی کیوں نہ سونپ دیئے جائیں یا اسے خدا کی طرف سے نبوت بھی کیوں نہ مل جائے ــــ اس کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنی مرضی منوائے۔ وہ صرف قانون کی اطاعت کرائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ اس قانون کے اصول و مبانی بھی انسانوں کے خود وضع کردہ نہیں ہوں گے خدا کی طرف سے متعین شدہ ہوں گے۔ لہٰذا اطاعت درحقیقت قوانینِ خداوندی کی ہوگی، نہ کہ انسانوں کے خود ساختہ ضوابط کی۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (۷/۳) "جو کچھ تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا اور کسی سرپرست کا اتباع نہ کرو۔"

اس قانون کا اطلاق ہر فردِ معاشرہ پر یکساں طور پر ہوگا اور کوئی بڑی سے بڑی ہستی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ رسول جس کی وساطت سے قوانینِ خداوندی دوسرے انسانوں کو ملتے ہیں وہ بھی اسی حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کرتا ہے کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۶/۵۰) "میں اس کے سوا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے اور کسی چیز کا اتباع نہیں کرتا۔" اور

اس طرح "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" (۶/۱۶۳) "میں ان میں سب سے پہلے نمبر پر ہوں جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں" یعنی رسولؐ سب سے پہلے خود اس قانون کی اطاعت کرتا ہے اور پھر دوسروں سے اسی کی اطاعت کراتا ہے. یوں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم اور غلام نہیں ہوتا. متنازعہ فیہ امور کے فیصلے کتابِ خداوندی کی رُو سے ہوتے ہیں جس کا اطلاق سب افراد پر یکساں ہوتا ہے. وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴) "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا ــــ جو حکومت خدا کی کتاب کے مطابق قائم نہیں ہوتی ــــ تو یہی لوگ کافر ہیں."

قانونِ خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا مستقل قدر ہے.

---

۱۱. ہر کام کا نتیجہ

قانون کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کا کوئی عمل (کام) بلا نتیجہ نہ رہنے پائے. اچھے کام کا اچھا نتیجہ مرتب ہو کر سامنے آجائے اور بُرے کام کی سزا مل جائے "اچھے کام" سے مراد ہے قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنا' اور "بُرے کام" کے معنی ہیں اس قانون کی خلاف ورزی کرنا) معاشرہ اس مقصد کے لئے پولیس اور عدالت کا انتظام کرتا ہے لیکن جس خدا نے مستقل اقدار کو متعین کیا ہے اس کا انتظام یہ ہے کہ کسی کا کوئی کام' خواہ وہ پولیس کی نظروں سے اوجھل کیوں نہ رہ جائے' کسی حالت میں بھی اپنا صحیح نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ سکے. اس کا کہنا یہ ہے کہ کائنات کی یہ عظیم القدر اور حیرت انگیز مشینری اس مقصد کے لئے سرگرمِ عمل ہے ــــ کہ ہر عمل اپنا صحیح نتیجہ مرتب کرتا ہے: وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۴۵/۲۲) "اللہ نے ارض و سما کے سلسلے کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو" اس کا نام خدا کا "قانونِ مکافاتِ عمل" ہے. جس کی گرفت سے (محسوس اعمال تو ایک طرف) دل کی لغزشیں اور نگاہ کی خیانتیں بھی نہیں بچ سکتیں. يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ ○ (۴۰/۱۹) "وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک کو جانتا ہے." اس لئے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (۹۹/۷-۸) "جو شخص ایک ذرہ برابر بھی قانون کے مطابق کام کرتا ہے اس کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آجاتا ہے اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اس کے عواقب سے دوچار ہوتا ہے. اس باب میں اور تو اور خود رسول کی بھی استثنا نہیں ہوتی. سورۂ یونس میں رسول اللہ سے کہا گیا کہ تم اعلان کردو کہ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ. میں تو صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے. اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ (۱۰/۱۵) اگر میں اس (وحی) کی خلاف ورزی کروں تو مجھے بھی خدا کا عذاب پکڑے گا اور میں اس کی گرفت

سے بہت ڈرتا ہوں۔ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ (۸۵/۱۲) اس قانون کی رُو سے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی کی محنت رائگاں چلی جائے۔ اَنِّىْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳/۱۹۵) میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا' وہ عورت ہو یا مرد۔' وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (۴/۱۲۴) "کسی کے اجر میں ذرا کمی نہیں کی جاتی"۔ نہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو یونہی بلا سعی و عمل کچھ بخش دیا جائے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (۵۳/۳۹) کسی انسان کو بجز اس کی سعی و عمل کے کچھ نہیں ملتا۔

لہٰذا ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرنا مستقل قدر ہے۔

۱۲۔ انسانی نظامِ عدل

یہ عدل (ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہونا) تو خدا کے کائناتی نظام کے مطابق کارفرما ہوتا ہے۔ جہاں تک انسانوں کے وضع کردہ عدالتی نظام کا تعلق ہے اس کے لئے الگ مستقل اقدار دیئے گئے ہیں۔ مثلاً

(i) حق کو جانتے بوجھتے کبھی نہ چھپایا جائے: وَ (لَا) تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۴۲)

(ii) نہ ہی حق اور باطل میں التباس (CONFUSION) پیدا کیا جائے: وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)

(iii) شہادت کو کبھی نہ چھپایا جائے: وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ (۲/۲۸۳)

(iv) کسی قسم کے لالچ یا ذاتی منفعت یا کسی کی رو رعایت یا بغض و عداوت کے خیال کے بغیر محض حق کی خاطر سچی شہادت دی جائے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝ (۴/۱۳۵)

"اے مستقل اقدار پر یقین رکھنے والو! تم ہمیشہ عدل کے علمبردار بن کر رہو۔ شہادت صرف اللہ کے لئے (نہ کہ مدعی یا مدعا علیہ کے لئے) دو۔ خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف کیوں نہ جائے۔ یا تمہارے ماں باپ یا دیگر اعزہ و اقربا کے خلاف۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب (ان میں سے کسی کی رعایت نہ کرو اس لئے کہ) اللہ کا حق ان کے مقابلے میں بہرحال فائق ہے۔ دیکھنا! کبھی ایسا نہ ہو کہ تمہارے ذاتی جذبات اور رجحانات انصاف کے راستہ میں حائل ہو جائیں۔ اگر تم نے شہادت توڑنے مروڑنے یا اس سے پہلوتہی کی کوشش کی تو سمجھ رکھنا چاہیئے کہ خدا کا قانونِ مکافات تمہارے ہر کام سے باخبر ہے۔ (تم اس کی عدالت کو دھوکا نہیں دے سکتے' نہ ہی اس سے بچ کر کہیں جا سکتے ہو)"۔

(۷) نہ ہی مجرموں کی طرف سے وکالت کی جا سکتی ہے: وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا (۴/۱۰۵)" تو خیانت کرنیوالوں کے (CAUSE) کو (PLEAD) کرنے والوں میں سے مت ہو" وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (۴/۱۰۷)" جو لوگ اپنی ذات یا اپنے لوگوں کے خلاف بددیانتی برتیں ان کی طرف سے وکالت مت کر۔"

نہ ہی مجرمین کا پشت پناہ بنا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے خدائے تعالیٰ سے کہا، فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۸/۱۷)" میں کبھی مجرمین کا پشت پناہ نہیں بنوں گا۔" لہٰذا دنیا میں نظامِ عدل قائم کرنا اور اس کے قیام و بقا میں پوری پوری مدد دینا مستقل اقدار ہیں۔

۱۳۔ قانون کے مطابق چلانا

معاشرہ میں ہر شخص کا اور خود قرآنی معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ ہر ایک کو قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دے اور قانون کی خلاف ورزی سے روکے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰)" تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے باہر لایا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم سب کو قانونِ خداوندی کے مطابق چلنے کا حکم دو اور قانون کی خلاف ورزی سے روکو۔"

لہٰذا ایسا معاشرہ قائم کرنا ایک مستقل قدر ہے۔

۱۴۔ لاقانونیت نہ پھیلائی جائے

لاقانونیت پھیلانا یا قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنا (جسے قرآن کی اصطلاح میں فساد کہتے ہیں) بہت بڑا جرم ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا (۲/۲۰۵)" (تم ایسے شخص کو بھی دیکھو گے کہ) جب وہ صاحبِ اقتدار ہو گا تو ملک میں لاقانونیت پھیلا دے گا۔" وہ پہلے خود آئین و قانون کو پسِ پشت ڈال کر آمرِ مطلق DICTATOR بن کر لوگوں کو اپنی مرضی کے ڈنڈے سے ہانکے گا اور اس کی دیکھا دیکھی باقی لوگ بھی قانون سے سرکشی برتنا شروع کر دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کے دل سے قانون کا احترام اٹھ جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے سخت ترین سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ (۵/۳۳)

دنیا میں صحیح نظامِ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ مستقل اقدار کو معاشرہ میں نافذ اور رائج کرے۔ لیکن مستقل اقدار

۱۵۔ مشاورتی نظامِ حکومت

بالعموم بنیادی اصول (FUNDAMENTAL PRINCIPLES) یا حدود (BOUNDARY LINE) کی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان اصولوں کی عملی جزئیات ہر زمانے کے لحاظ سے نظامِ معاشرہ کو خود متعین کرنی ہوتی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ کام بھی کسی ایک فرد کے سپرد نہ کیا جائے بلکہ نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورے سے سرانجام پائے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "اس معاشرہ کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔" حتیٰ کہ خود رسول کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا۔ اس سے بھی کہہ دیا گیا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) "معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔" لہٰذا نظامِ مملکت میں باہمی مشاورت بھی ایک مستقل قدر ہے لیکن یہ مشاورت مغرب کا جمہوری نظام نہیں جس میں ۵۱ ووٹ والوں کا ہر فیصلہ ۴۹ ووٹ والوں کے لئے واجب التسلیم ہوجاتا ہے۔ یہ مشاورت مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی معاملات طے کرنے کے لئے ہوگی۔

۱۶۔ امورِ مملکت نااہلوں کے سپرد نہ کئے جائیں

صحیح معاشرہ میں اربابِ حل و عقد درحقیقت متاعِ ملت کے امین ہوتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ امانت صرف انہی کے سپرد کی جائے جو اس کی حفاظت کے اہل ہوں۔ اسے نااہلوں کی تحویل میں نہ دیا جائے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ... (۴/۵۸) "اللہ تمہیں اس امر کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ تم امانات کو ان کے سپرد کردو جو ان کے اہل ہوں۔ اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کی رُو سے فیصلہ کرو۔"

یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔

۱۷۔ رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے

معاشرہ یا نظامِ مملکت کے قیام کے بنیادی مقاصد میں سے یہ بھی ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا اس کے ذمے ہو۔ یعنی یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ہر فرد کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچتی رہیں: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا..... (۱۱/۶) "زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔" قرآن کا کہنا یہ ہے کہ جو مملکت قوانینِ خداوندی کے نفاذ کے لئے وجود میں آتی ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتی ہے جنہیں خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ مملکت تمام افراد کو اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ نَحْنُ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱) "ہم تمہارے اور تمہاری اولاد کے رزق کے ذمہ دار ہیں"۔ رزق میں جسمانی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع سب آجاتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کے لئے "زکوٰۃ" کا جامع لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنی "نشوونما" ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ یعنی "تمام نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا" قرآنی معاشرہ کا اوّلین فریضہ ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں گے"۔

لہٰذا، تمام افراد کے رزق کی ذمہ داری نظامِ معاشرہ کے لئے ایک مستقل قدر ہے جسے کسی حالت میں بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۸۔ ذرائع رزق

جو نظام اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے یہ ضروری ہے کہ ذرائع رزق اس کی تحویل اور نگہداشت میں رہیں۔ اس لئے قرآن نے ذرائع رزق (SOURCES OF PRODUCTION) کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ انہیں تمام انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲/۲۹) "خدا وہ ہے جس نے وہ سب کا سب جو زمین میں ہے تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے"۔ یعنی اس لئے پیدا کیا ہے کہ تم سب اس سے متمتع ہو۔ اس لئے نہیں کہ چند افراد یا کوئی مخصوص گروہ ان پر قابض ہو کر بیٹھ جائے۔ دوسری جگہ ہے: وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۷/۱۰) "یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں متمکن کیا ہے اور اس میں تم سب کے لئے سامانِ معاش رکھا ہے"۔ اس سامان کو سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ یعنی یہ سامانِ زیست لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ کوئی فرد رزق سے محروم نہ ہونے پائے۔

لہٰذا، وسائلِ رزق کا تمام نوعِ انسان کے لئے کھلا رہنا بھی ایک مستقل قدر ہے۔

۱۹۔ زائد از ضرورت

نہ صرف یہ کہ ذرائع رزق اور وسائلِ پیداوار کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا جاسکتا بلکہ یہ بھی کہ جو کچھ کسی کے پاس، اس کی جائز ضروریات سے زائد ہو اُسے بھی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھا جائے تاکہ معاشرہ اسے اس مقصد کے لئے حسبِ ضرورت صرف میں لاسکے: يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) "تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے

کھلا رکھیں. ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو سب کا سب"۔ لہٰذا یہ بھی ایک مستقل قدر ہے۔

ان مستقل اقدار پر یقین رکھنے والوں کی کیفیت یہ ہوگی کہ وہ زائد از ضرورت مال و اسبابِ زیست کو دوسروں کی پرورش کے لئے کھلا رکھیں گے اور ان سے کسی معاوضہ کے خواہاں نہیں ہوں گے۔ حتیٰ کہ شکریہ تک کے بھی نہیں۔ وہ ان سے کہہ دیں گے کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) "ہم تمہارے لئے جو سامانِ رزق مہیا کرتے ہیں تو اس سے ہمارا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں۔ ہم خالصتہً لوجہ اللہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم تم سے نہ کسی معاوضے کے متمنی ہیں نہ شکریہ تک کے خواہاں"۔

۲۰۔ ربوبیت

ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ دوسروں کی پرورش (ربوبیت) ایک مستقل قدر ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ اور اس سے خود ہماری ذات (PERSONALITY) مستحکم (STRENGTHEN) ہوجاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (۲/۲۶۵) "(انفاق) سے ان کا اثباتِ نفس ہوجاتا ہے۔

۲۱۔ حفاظتِ عصمت

قرآن کی رُو سے عصمت کی حفاظت بھی ایک مستقل قدر ہے۔ عصمت کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف نکاح (MARRIAGE) کے معروف طریقہ کی رُو سے ہو۔ اس طریقہ کے علاوہ جنسی تعلق کو زنا کہا گیا ہے، جس کے قریب تک جانے سے روکا گیا ہے؛ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (۱۷/۳۲) "اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ یہ بے حیائی کا کام ہے اور نہایت بُرا راستہ"۔ جو اس فعل کا مرتکب ہو اسے سزا دی جائے گی (۲۴/۲)۔ نکاح بالغ عورت اور بالغ مرد کی باہمی رضامندی سے معاہدہ کا نام ہے۔ عورتوں کی رضامندی کے بغیر زبردستی ان کا مالک بن جانا نکاح نہیں کہلا سکتا: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (۴/۱۹) "یہ تمہارے لئے حلال نہیں (حرام ہے) کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ"۔ نکاح سے مقصود محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں۔ اس سے مطلوب، باہمی مودّت اور محبت کے تعلقات استوار کرنا ہیں۔ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ..... (۳۰/۲۱) "اُس نے تمہارے لئے خود تمہاری جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرسکو۔ اور اس نے تم میں محبت اور رحمت کے جذبات پیدا کر دیئے"۔ اگر میاں بیوی میں یہ کیفیت باقی نہ رہے تو وہ معاہدۂ نکاح کو فسخ کرسکتے ہیں (اسے طلاق کہا جاتا ہے)۔

جس شخص کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہوسکے وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (۲۴/۳۳)۔ جنسی بے راہ روی سے افراد کی صلاحیتوں میں اضمحلال

واقع ہوجاتا ہے۔ وَلَا یَزْنُوْنَ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸) اگر کوئی قوم اپنے ہاں زنا کو عام کردے تو کچھ عرصہ کے بعد (جو محققین کی رائے میں تین پشتوں کا وقفہ ــــ یعنی تقریباً سو سال کا عرصہ ہے) اس میں قومی زوال اور انحطاط شروع ہوجاتا ہے۔

لہٰذا، حفاظتِ عصمت بھی ایک مستقل قدر ہے جس کا دامن کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاسکتا۔

شروع میں کہا جاچکا ہے کہ تمام انسانوں کی پیدائش "نفسِ واحدہ" سے ہوئی ہے (۴/۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل

۲۲۔ نوعِ انسانی امّتِ واحدہ ہے

(ORIGION) کے اعتبار سے تمام انسان ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ لہٰذا، تمام نوعِ انسان کا ایک عالمگیر برادری اور ایک قوم کی حیثیت سے رہنا مقصودِ حیات ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا..... (۱۰/۱۹) "نوعِ انسان امّتِ واحدہ (ایک قوم) تھی۔ اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلافات شروع کردیئے"۔

قوموں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں کو ایک امّت (عالمگیر برادری) بنانے کا طریق یہ ہے کہ ان سب کے لئے ایک ضابطۂ قوانین ہو (جسے آجکل (ONE WORLD GOVERNMENT) کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے) قرآن نے اپنے آپ کو تمام عالمِ انسانیت کے لئے مشترکہ ضابطۂ قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ...... (۱۰/۵۷) "اے نوعِ انسانی یقیناً تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے تمہارے پاس ایک ضابطۂ قوانین آگیا ہے"۔

لہٰذا، تمام نوعِ انسانی کا ایک ضابطۂ حیات کے مطابق ایک امّت بن کر رہنا بھی مستقل قدر ہے۔

۲۳۔ انسانیت کے لئے نفع بخش

فلاح و بہبود کے کاموں کو پارٹیوں، گروہوں، ملکوں اور قوموں کے دائروں میں محدود کردینا مستقل اقدار کے بنیادی تصوّر کے خلاف ہے۔

قرآن کی رُو سے بقائے دوام صرف اسی عمل کو حاصل ہے جو تمام عالمِ انسانیت کی نفع بخشی کے لئے کیا جاتے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) "زمین میں استمرار اور دوام صرف اسی کو حاصل ہوگا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو"۔

اس کے لئے وہ پہلا قدم یہ تجویز کرتا ہے کہ تمام انسان (بلاتمیز رنگ و نسل اور بلا تفریق قوم و ملک) تمام ایسے امور میں باہمی تعاون سے کام لیں جو انسانیت کے لئے کشادہ اور مستقل اقدار کی نگہداشت میں ممدّ و معاون ہوں۔ اور ایسے کاموں

تعاون میں کبھی ایک دوسرے کی مدد نہ کریں جو انسانیت کے لئے ضعف و اضمحلال اور قانون سے سرکشی کا موجب بنیں؛ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲) لیکن جس طرح ایسے انسانوں میں جو قانون کا احترام کریں اور ان میں جو اس سے سرکشی برتیں، ایک بیّن فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح

۲۴۔ معیارِ تفریق قرآن تمام انسانوں کی تفریق و تقسیم اس معیار کی رُو سے کرتا ہے کہ جو انسان خدا کی متعیّن کردہ مستقل اقدار کا اقرار کریں اور ان کا احترام اپنا نصب العین حیات بنائیں وہ ایک قوم کے افراد ہیں اور جو ان سے انکار کرکے اپنے خود ساختہ مسلک کے مطابق چلنا چاہیں وہ دوسری قوم کے افراد۔ اوّل الذکر کو "**مومن**" کہا جاتا ہے (یعنی ماننے والے) ثانی الذکر کو "**کافر**" (انکار کرنے والے)۔ انسانوں کی بس یہی تقسیم ہے جو مستقل اقدار کے معیار کے مطابق عمل میں آتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور معیارِ تفریق و تقسیم نہیں۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی IDEOLOGY کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے قومیت کا معیار آئیڈیالوجی ہے۔ رنگ، نسل، خون، زبان، وطن، کا اختلاف انسانوں میں وجہ تفریق نہیں بن سکتا۔ تقسیم کا یہ معیار بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے۔ چنانچہ سورۃ تغابن میں ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴/۲) "اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ سو تم میں بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن"۔

۲۵۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ مستقل اقدار کو کسی سے زبردستی نہیں منوایا جاسکتا۔ ماننا یا انکار کرنا، انسان کے دل کے فیصلے کا نام ہے۔ جو فیصلہ، رضا و رغبت نہ ہو اسے اس شخص کا فیصلہ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ فیصلہ وہی ہے جو اپنی مرضی سے کیا جائے گا۔ اس لئے دین (مستقل اقدار کے ضابطہ) کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی جاسکتی؛ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲/۲۵۶) "دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں سیدھی راہ اور غلط راہ (وحی کی رُو سے) واضح ہو چکی ہے۔ اس لئے جونسی راہ کسی کا جی چاہے اختیار کرلے۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (۱۸/۲۹) "ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے"۔ جو حق کو اختیار کرے گا اس کے خوشگوار نتائج سے متمتع ہوگا۔ جو انکار کرکے دوسری روش اختیار کرلے گا اس کے تباہ کن عواقب اس کے سامنے آئیں گے۔ ان انکار کرنے والوں (کافرین) کے خلاف محض اس بنا پر کہ انہوں نے اس روش سے انکار کیوں کیا ہے (یعنی اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب کیوں اختیار کرلیا ہے) کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ نہ صرف یہ کہ ان کے خلاف کچھ نہیں کیا جائے گا، انہیں مذہب کی شخصی آزادی PERSONAL LIBERTY دی جائے گی اور ان کے معابد کی حفاظت قرآنی معاشرہ کے ذمے ہوگی۔ سورۃ حج

میں ہے. وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔ (۲۲/۴۰) "اگر خدا ایک گروہ کی مدافعت (وحفاظت) دوسرے گروہ سے نہ کراتا تو عیسائیوں کے کلیسا، راہبوں کی خانقاہیں، یہودیوں کے صومعے، اور مسلمانوں کی مساجد جن میں قانونِ خداوندی کو بکثرت سامنے لایا جاتا ہے، سب منہدم ہو جاتے. لہٰذا ان (غیر مسلموں) کی پرستش گاہوں کی حفاظت اسلامی مملکت کے ذمہ ہو گی. نہ صرف ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت بلکہ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، ہر متاع کی حفاظت. نیز یہ لوگ ان تمام حقوق اور مراعات کے یکساں طور پر مستحق ہوں گے جو انسان ہونے کی جہت سے انہیں مستقل اقدار کی رُو سے ملتی ہیں.

واضح رہے کہ اس باب میں تو کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا (نہ جسمانی جبر نہ ذہنی استبداد) کہ وہ اسلام قبول کرے یا کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے. لیکن جب کوئی شخص برضا و رغبت اسلام قبول کرکے مسلم معاشرہ کا فرد بن جائے تو اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اسلامی قوانین کی اطاعت کرے. یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی معاشرہ (یا دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں اسلامی مملکت) کا فرد بن جانے کے بعد اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس قانون کی جی چاہے اطاعت کرے اور جس سے جی چاہے یہ کہہ کر انحراف کرے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں). جبر اس میں نہیں کہ وہ کونسا مذہب اختیار کرتا ہے. لیکن جب وہ اپنی مرضی سے اسلامی معاشرہ کا فرد بن جاتا ہے تو اس معاشرہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی کو بھی برضا و رغبت اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے. اگر وہ ان قوانین و ضوابط کی پابندی نہیں کرنا چاہتا تو اسے اس کی اجازت ہے کہ وہ اسلام کے دائرے سے نکل کر اور مذہب اختیار کرلے.

اَلْاَسْمَآءِ الْحُسْنٰى

سابقہ صفحات میں قرآن میں بیان کردہ مستقل اقدار میں سے بڑی بڑی اقدار کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے. اس نہج پر اگر آپ قرآن کریم کا مطالعہ کریں تو اس باب میں نئی نئی حقیقتیں آپ پر منکشف ہوں گی. اصل یہ ہے کہ مستقل اقدار کا سرچشمہ خود ذاتِ خداوندی ہے. قرآن نے جن صفاتِ الٰہیہ کو اس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے، بہ نگاہِ تعمق دیکھا جائے تو (ان میں اس قسم کی صفات مثلاً هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وغیرہ کو چھوڑ کر باقی صفات جنہیں عام طور پر ETHICAL ATTRIBUTES کہا جاتا ہے) سب مستقل اقدار ہیں. انہیں قرآن نے اَلْاَسْمَآءِ الْحُسْنٰى کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے. ان صفاتِ خداوندی کو بطور معیار سامنے رکھ کر اپنے اندر انسانی ممکنات کو مشہود کئے جانا مقصدِ دین اور مطلوبِ حیات ہے. جوں جوں انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا جائے گا

اس میں ان صفات (یعنی مستقل اقدار) کی نمود ہوتی چلی جائے گی. مردِ مومن اسے کہتے ہیں جس سے ان صفات کا ظہور از خود ہوتا جائے. بعینہٖ جس طرح ایک گہر آبدار سے روشنی کی شعاعیں بلا کاوش و بلا تکلف خود بخود باہر چلی جاتی ہیں. یہی وہ افراد ہیں جن سے قرآنی معاشرہ متشکل ہوتا ہے. آپ سوچئے کہ اگر عالمِ انسانیت میں اس قسم کا معاشرہ قائم ہوجائے جس میں مستقل اقدار کا احترام دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور انہیں کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو یہ دنیا کس طرح جنت میں تبدیل ہوجائے گی. اس جنت میں ہر شخص کو اس امر کی ضمانت (SECURITY) حاصل ہوگی کہ اس کے ساتھ مستقل اقدار سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا جائے گا." مومن" کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امن میں ہو اور دوسروں کو امن کی ضمانت دے. دنیائے انسانیت میں حقیقی امن صرف جماعتِ مومنین کے ہاتھوں قائم ہوسکتا ہے.

اضافی اقدار

یہاں تک ہم نے ان اقدار کے متعلق لکھا ہے جو اپنی مستقل حیثیت رکھتی ہیں. ہم نے جو کہاوت کسی پچھلے باب میں درج کی ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لایئے. یعنی

مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو

اس میں آپ نے دیکھا تھا کہ مال بھی ایک قدر ہے لیکن جب مال اور جان میں تصادم واقع ہوجائے تو مال کو جان کی خاطر قربان کیا جاسکتا ہے (بلکہ ایسا کرنا ضروری ہوجاتا ہے) اسی طرح جب جان اور آبرو میں تصادم واقع ہوجائے تو آبرو کی حفاظت کے لئے جان قربان کردینا ضروری ہوجاتا ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ مال اور جان اضافی اقدار ہیں. اور آبرو مستقل قدر ہے. قرآن نے مستقل اقدار کے علاوہ اضافی اقدار کا بھی ذکر کیا ہے. مثلاً سورۂ آلِ عمران میں ہے. زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ

ا. بیوی بچوں کی محبت

الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ (۳/۱۴) لوگوں کے لئے " بیوی بچوں کی محبت، سونے چاندی کے ڈھیر، اعلیٰ قسم کے گھوڑے، مویشی، کھیتی وجۂ جاذبیت بنائی گئی ہیں". گویا یہ چیزیں اپنی اپنی قیمت رکھتی ہیں. لیکن ایسے مواقع بھی آجاتے ہیں جن میں یہی اموال اور اولاد انسان کے لئے وجۂ تخریب بن جاتے ہیں.

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸) "تمہیں جاننا چاہیئے کہ تمہارا مال و اولاد باعث آزمائش ہو سکتے ہیں" یہ اس وقت ہوتا ہے جب مال اور اولاد ایک طرف ہو اور ان سے بلند اقدار دوسری طرف۔ اس وقت اگر انسان مال یا اولاد کی حفاظت کے لئے کسی بلند قدر کو قربان کر دیتا ہے تو یہ چیزیں (مال، اولاد، بیوی وغیرہ) اس کی تباہی کا باعث اور دشمن بن جاتے ہیں۔ اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ (۶۴/۱۴) "یقیناً تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی جس آیت میں بیوی بچوں اور مال و دولت کو وجۂ جاذبیت قرار دیا گیا ہے وہاں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۳/۱۴) یہ انسان کی طبعی زندگی کا ساز و سامان ہے۔ اگر کسی وقت اس میں اور انسان کی حقیقی زندگی میں ــــ جو انسانی ذات کی زندگی ہے ــــ تصادم ہو جائے تو اس وقت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انسانی ذات کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے: ءَ اُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ (۳/۱۵) ہے۔ جو شخص اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتا وہ مال کی محبت کو ان اعلیٰ اقدار پر ترجیح دیتا ہے: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰/۸) لیکن جو اعلیٰ اقدار پر ایمان رکھتا ہے وہ مال کی محبت کے علی الرغم اسے نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے دے دیتا ہے: وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى ..... (۲/۱۷۷) سورۂ توبہ میں ادنیٰ اقدار اور اعلیٰ اقدار کے تقابل کو ابھار کر سامنے لایا گیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ

۲۔ مال کی محبت

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹/۲۴) "ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے آباؤ اجداد اور بال بچے، تمہارے بھائی بند، تمہاری بیویاں یا دیگر افرادِ خاندان، تمہارا مال و دولت جسے تم نے اکٹھا کیا ہے، تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو، یا تمہارے مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، اگر یہ چیزیں تمہارے لئے اللہ اور اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہو جائیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ خدا (اپنے قانونِ مکافات کی رو سے) اس بات کا فیصلہ کر دے (کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ کیا ہے) اللہ کسی ایسی قوم کی، جو اعلیٰ اقدار کو چھوڑ کر ادنیٰ اقدار کے پیچھے پڑ جائے، کس طرح سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کر سکتا ہے؟"

قرآن نے مال کی قدر کے پیشِ نظر چور کی سزا تجویز کی ہے (۵/۳۸)۔ ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے کھا جانے کی بھی ممانعت کی گئی ہے (۴/۲۹)۔ اور رشوت دے کر اپنا کام نکالنے سے بھی سختی سے روکا گیا ہے (۲/۱۸۸)۔ یعنی جائز طریق سے مال حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کرنے کی اجازت بلکہ تاکید ہے۔ لیکن جب دوسری طرف اسی مال کی ضرورت اعلیٰ

اقدار کی حفاظت کے لئے پڑے تو اپنی ضروریات سے زائد سارے کا سارا مال دے دینے کی تلقین کی گئی ہے (۲/۲۱۹)

۳۔ جان کی قیمت

قرآن کی رُو سے انسان کی جان، مال سے کہیں زیادہ بلند قدر ہے۔ اس کی قیمت اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے نزدیک مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲) "جس نے کسی ایک فرد کو، بجز اس کے کہ اس نے کسی کو مار ڈالا ہو یا وہ ملک میں فساد برپا کرنے کا موجب ہو، قتل کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک کی جان بچالی تو یوں سمجھو اُس نے عالمِ انسانیت کی جان بچالی" لیکن اگر کوئی شخص کسی بے گناہ کو مار ڈالے یا صحیح معاشرہ کے امن کو درہم برہم کر ڈالے تو اس کی سزا موت تجویز کی گئی ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت میں یہ الفاظ بھی ہیں: بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ "بجز اس کے کہ اس نے کسی کو مار ڈالا ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کا موجب ہو" اسی کو دوسری جگہ "بِالْحَقِّ" جان لینا کہا گیا ہے: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۷/۳۳) جس جان کو خدا نے واجب الاحترام قرار دیا ہے اسے مت قتل کرو، مگر حق کے ساتھ۔ "حق" کے یہی معنی ہیں، یعنی قاتل اور مفسد کو اس کے جرم کی پاداش میں موت کی سزا دینا۔

جان کی قیمت اور اہمیت کے پیشِ نظر اس کی سخت تاکید کی گئی ہے کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے انسان کی ہلاکت ہو جائے: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵) "اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو" یہ حکم جس طرح اجتماعی ہے اسی طرح انفرادی بھی ہے۔ لہٰذا اپنی جان کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۴/۲۹) اس کے جہاں یہ معنی ہیں کہ "اپنے لوگوں کو مت قتل کرو" وہاں یہ بھی ہیں کہ "اپنے آپ کو مت قتل کرو"۔ قرآن نے یہودیوں کے خلاف جو "فردِ جرم" مرتب کی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو قتل کر دیا کرتے تھے اور انہیں گھروں سے نکال دیتے تھے (۲/۸۵)۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے جان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ لیکن جب بلند اقدار کی حفاظت کے لئے جان کی ضرورت لاحق ہو جائے تو جو برضا و رغبت اسے ہتھیلی پر رکھ کر باہر نکل آئے اور خندہ پیشانی سے جان دے دے اسے بلند ترین مراتب کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "اسے مردہ مت کہو"۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ؀ (۲/۱۵۴) "جو اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ جان، اس قدر عزیز ہونے کے باوجود، اضافی قدر ہے۔ اگر اس میں اور کسی مستقل قدر کی حفاظت میں تصادم واقع ہو جائے تو مستقل

قدر کے تحفظ کے لئے جان دے دینا باعثِ شرفِ انسانیت ہے۔ "جان صدقۂ آبرو" سے یہی مراد ہے۔

۴۔ حفاظتِ حرث و نسل

قرآن نے اس شخص (قوم یا نظام) کو بدترین مجرم قرار دیا ہے جو کھیتی اور نسل کو تباہ کرے۔ وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲/۲۰۵) لیکن جب کوئی قوم ظلم و استبداد پر اتر آئے اور اس کی انسانیت کش روش سے روکنے کے لئے جنگ کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے تو اس کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت ہے۔ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (۲۲/۳۹) "جن مظلوموں کے خلاف (سرکش لوگ) جنگ کے لئے چڑھ آئے ہیں انہیں (جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے۔" اور یہ ظاہر ہے کہ جنگ میں (ہزار احتیاط کے باوجود) حرث و نسل کی تباہی ضرور ہوتی ہے۔ گویا ظلم کو روکنا ایک ایسی ضرورت ہے جس کے لئے اس سے کم قدر کی شے کا ضیاع روا رکھا گیا ہے خود جنگ کے لئے بھی قرآن نے کہا ہے کہ اُسے اس وقت تک جائز سمجھنا چاہیئے: حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (۴۷/۴) "جب جنگ خود اپنے ہتھیار ڈال دے۔" یعنی جنگ کی اجازت دنیا سے جنگ کے وجود کو ختم کرنے کے لئے دی گئی ہے۔

۵۔ ایفائے عہد

قرآن نے ایفائے عہد کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ مومنین کا شعار یہ بتاتا ہے کہ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا (۲/۱۷۷) "جب وہ وعدہ یا معاہدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔" گویا عہد یا معاہدہ ایک ایسی قدر ہے جس کا احترام ضروری ہے۔ لیکن جس قوم کے ساتھ معاہدہ کیا جائے اگر اس کی طرف سے نقضِ عہد کا ڈر ہو تو اس وقت ان کے معاہدے کو ان کی طرف لوٹا دیا جا سکتا ہے۔ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (۸/۵۸) "لیکن اگر تمہیں کسی قوم سے خیانت کا ڈر ہو تو برابر کی شرائط پر ان کا معاہدہ ان کی طرف لوٹا دو۔" واضح رہے کہ قرآن نے از خود معاہدہ توڑنے کی اجازت نہیں دی۔ کہا یہ ہے کہ جس معاہد قوم کی طرف سے نقضِ عہد کا ڈر ہو ان سے کہہ دو کہ اس کے بعد تمہارا اور ہمارا معاہدہ باقی نہیں رہے گا۔ یوں جب تم دونوں معاہدہ کے کالعدم ہو جانے سے ایک سطح پر آجاؤ تو پھر تم دوسرا قدم اٹھا سکتے ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو معاہدہ کا احترام ایک اضافی قدر نہیں رہتا بلکہ مستقل قدر بن جاتا ہے کیونکہ قرآن نے معاہدہ شکنی کی اجازت کسی حالت میں بھی نہیں دی معاہد قوم کی طرف سے خیانت کی صورت میں معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کی اجازت دی ہے۔ اس کے بعد جب اس قوم کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے گا تو وہ معاہدہ کے خلاف اقدام نہیں ہو گا بلکہ ایسی قوم کے خلاف اقدام ہو گا جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ کرتے وقت اس امر کی صراحت کر دینی ضروری ہو گی کہ یہ معاہدہ کن حالات

میں کالعدم قرار دیا جاسکے گا۔ معاہدہ شکنی کے علاوہ قرآن اس کی بھی سختی سے ممانعت کرتا ہے کہ تم معاہدات کو فریب دہی کا حربہ بنالو۔ سورۂ نحل میں ہے، تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶/۹۲) "تم اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔" اس سے آگے ہے: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ...... (۱۶/۹۴) "اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا موجب مت بناؤ۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ایفائے عہد کی سخت تاکید آئی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو معاہدات کا احترام ایک مستقل قدر ہے۔ لیکن چونکہ فریقِ مخالف کی طرف سے معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں معاہدہ کے کالعدم قرار دینے کی اجازت ہے اس لئے ہم نے اسے اضافی اقدار کے تحت لکھا ہے۔ اس فرق کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ (مثلاً) عدل کرنا مستقل قدر ہے۔ یہ اس سے مشروط نہیں کہ جب تک فریقِ مقابل عدل کرے تم بھی عدل کرو اور جب وہ عدل کو ہاتھ سے چھوڑ دے تو تم ظلم پر اتر آؤ۔ فریقِ مقابل عدل کرے یا نہ کرے تم عدل سے ہاتھ اٹھا ہی نہیں سکتے۔ لیکن ایفائے عہد اس سے مشروط ہوتا ہے کہ فریقِ مخالف اس عہد کا پابند رہے۔ اگر وہ اس کا پابند نہ رہے تو تم بھی اس کے پابند رہنے پر مجبور نہیں ہو سکتے۔ بس اتنا سا فرق ہے جس کے لئے اسے اضافی اقدار کے تحت لکھا گیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ایک طرح مستقل قدر ہی ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں چند اضافی اقدار جن کا احترام عام حالات میں نہایت ضروری ہے، لیکن جنہیں ان سے کسی اعلیٰ قدر کی حفاظت کی خاطر قربان کیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں استیعاب مقصود نہیں۔ قرآن کریم پر مزید غور کرنے سے ان اقدار کی فہرست میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم نے مستقل اقدار اور اضافی اقدار کے باہمی تعلق اور ان میں تصادم کے وقت اوّل الذکر کی خاطر ثانی الذکر کو قربان کر دینے کے تصور کو سورۂ توبہ کی اس آیت میں نہایت جامعیت سے سمٹا دیا ہے جسے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے لیکن جسے ہم آخر میں دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۧ (۹/۲۴)

"ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے اہلِ خاندان اور مال و دولت جسے تم کماتے ہو۔ اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور تمہارے مکانات جنہیں تم (اس قدر) پسند کرتے ہو۔ اگر یہ چیزیں تمہارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے (اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ) اللہ ان لوگوں کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں کرتا جو صحیح راستے سے ایک طرف کو نکل جائیں۔"

زندگی کا صحیح راستہ یہ ہے کہ ہر شے کو اس کے اپنے مقام پر رکھا جائے۔ اور جب کبھی ادنیٰ اور اعلیٰ اقدار میں تصادم ہو تو اعلیٰ کی خاطر ادنیٰ کو قربان کر دیا جائے۔

اسی نظامِ زندگی کو اسلام کہا جاتا ہے۔ یہی مستقل اقدار، سیاست کی زبان میں بنیادی حقوقِ انسانیت (FUNDAMENTAL HUMAN RIGHTS) قرار پا جاتے ہیں۔

SEX AND CULTURE; BY J.D. UNWIN; P-322
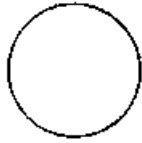
باب شانزدہم

عورت

دنیا میں کسی حیوان نے اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو انسان نے اپنے رفیقِ سفر کے ساتھ کیا ہے۔ حیوانات میں اس طبیعی فریضہ کے علاوہ جو مادہ کے لئے فطرت کی طرف سے مختص کیا گیا ہے، نر اور مادہ میں کوئی تمیز اور امتیاز نہیں ہوتا۔ لیکن مرد اور عورت کی باہمی تفریق کی خلیج اتنی وسیع اور گہری ہے گویا یہ دو مختلف جنسوں SPECIES کے افراد ہیں۔ ان کی یہ باہمی تفریق، فطرت کی پیدا کردہ نہیں، انسان کی خود پیدا کردہ ہے۔ اور اس کی بنیاد خود مرد کے ہاتھوں رکھی گئی ہے۔ فطرت کے پروگرام کے مطابق، تمام حیوانات میں انسانی بچے کی پیدائش اور پرورش کا عرصہ (جو استقرارِ حمل سے شروع ہوتا ہے) سب سے زیادہ لمبا ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں، ایک مدت تک عورت زندگی کے عام کاروبار سے قریب قریب معذور رہوتی ہے، اور باقی مدت میں اس قدر مصروف کہ اُسے عام کاموں کے لئے بہت کم وقت مل سکتا ہے۔ مرد ان تمام فرائض و مصروفیات سے آزاد اور فارغ ہوتا ہے، لہٰذا، تقسیم کار کے اصول کی رُو سے، وہ اکتسابِ رزق کرتا ہے اور عورت کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ (۴/۳۴)

عورت مرد سے فروتر ہے

فطرت نے یہ پروگرام، افزائش و تربیتِ نسل انسانی کی خاطر متعین کیا تھا لیکن مرد نے عورت کی اس مجبوری اور احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور، جس طرح ہر محتاج کے ساتھ ہوتا ہے، اسے اپنا محکوم اور زیردست بنا لیا۔ محکومی کی زنجیروں کو مضبوط تر بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ زیردست کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا جائے کہ وہ حاکم اور فرمانروا سے فروتر ہے اور فطرت نے اسے پیدا ہی اطاعت اور فرماں پذیری کے لئے کیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے "مذہب" (یعنی انسانوں کا خود تراشیدہ مذہب) بڑا مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ لہٰذا، اس باب میں بھی مرد نے مذہب کو آگے بڑھایا اور اس نے اس عقیدہ کو عام کرنا شروع

کردیا کہ عورت کا درجہ، مرد کے مقابلہ میں نہایت پست ہے۔ یہ تمام مصیبتوں کا سرچشمہ اور گناہوں کا منبع ہے۔ یہ ناقص العقل ہے اسے ہمیشہ مرد کے تابع فرمان رہنا چاہیئے۔ چنانچہ آپ بائبل کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں یہ عقائد عام ملیں گے۔ اس کی رُو سے، خدا نے مرد (آدم) کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا وہ جب تنہائی کی وجہ سے اداس اداس رہنے لگا تو اس کی دلجوئی کی خاطر اس کی پسلی سے عورت (حوا) کو پیدا کیا۔ یعنی مقصود بالذات تو مرد کی پیدائش تھی۔ عورت کو محض مرد کی دلجوئی کے لئے بطور کھلونا پیدا کر دیا۔ شیطان نے عورت کو بہلایا اور اس کی وجہ سے آدم کو جنت سے نکلنا پڑا۔ چنانچہ عورت کے

عیسائیت اور عورت

اس جرم کی سزا کے لئے خدا نے فیصلہ کیا کہ وہ دردِ زہ سے بچے جنے، اور اس کے بچے، گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آئیں اور مصیبتوں میں رہیں۔ عیسائی کلیسا میں ایک مدت تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں رُوح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ جہاں تک عورت کی "فطرت" کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا کہ چونکہ یہ مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے اس لئے یہ پسلی کی ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہوتی ہے۔ اگر اسے سیدھا کرنا چاہیں تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ عورت کے متعلق یہ تصورات عیسائیت ہی سے مخصوص نہیں۔ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں عورت کو یہی پوزیشن دی گئی ہے۔ وہ مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے اسے مرد کی مرضی کے مطابق چلنا ہوگا۔ معاشرہ میں اس کا اپنا کوئی مقام نہیں حتیٰ کہ اس کا تعارف بھی اس کی اپنی ذات سے نہیں ہوتا — وہ زید کی بیٹی، بکر کی بیوی یا عمر کی ماں کی حیثیت سے متعارف ہوتی ہے۔ وہ نہ کسی جائیداد کی مالک ہو سکتی ہے اور نہ ہی مرد کی کمائی میں صاحبِ اختیار۔ وہ باپ، خاوند یا بیٹے کی دولت یا جائیداد سے بطور استحقاق کچھ نہیں لے سکتی۔ اسے کچھ دیا جائے گا تو بطور خیرات دیا جائے گا۔ کنیادان ہندو معاشرہ کا مسلمہ ہے۔ اس دھرم کی رُو سے، وہ اپنا خاوند آپ منتخب نہیں کر سکتی، باپ اسے جس کے پلے جی چاہے باندھ دے — بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی شادی اس کے بالغ ہونے سے پہلے کر دی جائے۔ یہ شادی، مستقل بندھن ہوگا جو کسی حالت میں ٹوٹ نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ خاوند کی موت کے بعد بھی، وہ عورت اسی کی بیوی رہے گی۔ اسے یا تو خاوند کی چتا میں جل کر مرجانا ہوگا۔ اور یا ساری عمر بیوگی کی حالت میں زندگی بسر کرنا[1]

عورت کے متعلق یہ نظریات صدیوں سے چلے آرہے ہیں اور قریب قریب دنیا کے ہر حصے میں رائج ہیں (یا

---

[1] ہندوؤں نے اب ان قدیم عقائد و مسالک کو بدل ڈالا ہے لیکن یہ کچھ انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر کیا ہے۔ ان کے مذہب کی رو سے عورت کی پوزیشن وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ عیسائی ممالک میں بھی اس باب میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ مذہب کو چھوڑ کر ہوئی ہیں۔

یوں کہئے کہ آج سے کچھ عرصہ پیشتر تک رائج تھے)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت اپنے متعلق خود یہ سمجھنے لگ گئی کہ دنیا میں اس کی اپنی حیثیت کچھ نہیں۔ وہ صرف مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ مرد کی جنسی خواہشات کی تسکین کرے اور اس کی اولاد پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ عورت کے دل میں، اپنے متعلق یہ نظریہ کس قدر گہرائی تک پہنچ چکا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ

یورپ کی عورت

مغرب کی عورت اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتی ہے۔ اس کا تصور یہ ہے کہ وہ کسی میدان میں مرد سے پیچھے نہیں۔ وہ مرد کے تابع نہیں۔ وہ ہر اس تصور سے بغاوت کرتی ہے جس میں اس احساس کا شائبہ تک بھی پایا جائے کہ وہ مرد سے فروتر ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح، مرد کی نگاہوں میں وجہِ جاذبیت (ATTRACTIVE) بن کر رہے۔ اس کا تمام سامانِ زیبائش و آرائش، اس کے فروغِ حسن اور نمائشِ جسم کے متنوع طرق و اسالیب، اس کا اندازِ گفتار، اس کی طرزِ رفتار، اس کے لباس کی تراش خراش۔ غرضیکہ اس کی ہر نقل و حرکت اور وضع قطع کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ وہ مرد کی نگاہوں میں زیادہ سے زیادہ جاذب ہو سکے۔ آپ نے دیکھا کہ (بظاہر) مرد سے سرکش اور آزاد ہونے کے باوجود، عورت کے قلب کی گہرائیوں میں یہ عقیدہ ابھی تک جاگزیں ہے کہ وہ مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس باب میں بلکہ زمانہ جہالت کی عورت، عصرِ تہذیب کی دختر سے زیادہ سمجھدار تھی۔ وہ مرد کی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنتی تھی تو (کم از کم) کمانے کی مشقت سے تو فارغ تھی۔ یہ خود کماتی ہے اور اپنی کمائی کا بیشتر حصہ مرد کا کھلونا بننے میں صرف کر دیتی ہے۔ یہ پوری کوشش کرتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مرد کے دامِ نگاہ میں گرفتار رہے، اور اس کے باوجود اپنے آپ کو اس فریب میں رکھتی ہے کہ میں مرد کے چنگل سے آزاد ہوں۔ یہ سب، غیر شعوری طور پر، اسی نظریہ اور عقیدہ کا اثر ہے جو ہزارہا سال سے عورت کے رگ و پے میں سرایت کئے چلا آ رہا ہے۔

قرآن آیا اور اس نے عورت کے متعلق ان تمام نظریات و معتقدات کو باطل قرار دے دیا، جو صدیوں سے مرد نے پھیلا رکھے تھے۔ انسانی تاریخ میں یہ بہت بڑی انقلابی آواز تھی۔ اس نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ خدا نے مرد کو پیدا کیا اور عورت

قرآن کی انقلابی آواز

مرد کی پسلی سے پیدا ہوئی۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ نوعِ انسان کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے کہ خدا نے، کسی نہ کسی طرح ایک مرد (یا ایک جوڑے) کو پیدا کر دیا اور ان سے پھر نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے چل پڑا۔ قرآن بتاتا ہے کہ زندگی اپنے مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، پیکرِ انسانی تک پہنچی ہے۔ اس کی ابتدا، ایک جرثومۂ حیات LIFE CELL سے ہوئی۔

اس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ پھر وہ جوشِ نمو سے دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصّہ نر کے امتیازات لئے ہوئے (SPERMATAZOON) اور دوسرا مادہ کے خصائص کا حامل (OVUM)۔ ان دونوں کے امتزاج سے، پیدائش کا سلسلہ بذریعہ تولید آگے چلا۔ انسانی بچہ (لڑکی اور لڑکا) کی پیدائش بھی اسی طرح عمل میں آتی ہے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ پہلے مرد بنا دیا گیا اور اس کی پسلی سے عورت نکلی۔ اس کا اعلان ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومۂ حیات سے پیدا کیا"۔ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا اور اسی ایک جرثومہ (کو دو حصّوں میں شق کر کے اس) سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا اور بَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّ نِسَآءً (۴/۱) اور ان دونوں کے امتزاج سے، مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے، مرد اور عورت میں سے کسی کو ایک دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔

عورت اور مرد کی تخلیق

اس کے بعد، قرآن نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی کہ جنّت میں آدم کی لغزش کا موجب عورت ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ مرد اور عورت دونوں میں، صحیح راستے پر چلنے اور اس سے بہک جانے کا امکان یکساں طور پر موجود ہے۔ یہ دونوں لغزش کر سکتے ہیں۔ فَاَزَلَّھُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْھَا (۲/۳۶) اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ دنیا میں گناہ کی ذمہ دار عورت ہے۔ مرد بالکل معصوم ہے۔

پھر اس نے کہا کہ افزائشِ نسل انسانی کے ضمن میں پروگرام یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مرد اور عورت دونوں کے باہمی تعاون سے، یہ سلسلہ آگے چلتا ہے ـــــ نہ تنہا مرد اس کے لئے کفایت کرتا ہے، نہ تنہا عورت۔ جو چیزیں اس طرح مل کر کسی ایک مقصد کو پورا کریں، انہیں ایک دوسرے کا زوج (COMPLEMENTARY) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، مرد اور عورت، ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصیات مرد کو دی گئی ہیں اور عورت ان سے محروم ہے۔ بعض عورت کو دی گئی ہیں، اور مرد ان سے بہرہ ور نہیں۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔ فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۴/۳۴)۔ غور کیجئے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ مرد کو عورت پر فضیلت دی گئی ہے یا عورت کو مرد پر فوقیت حاصل ہے۔ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مرد کو عورت پر۔ اور دوسری خصوصیات کے اعتبار سے، عورت کو مرد پر۔ اور فطرت کا پروگرام، ان دونوں کی رفاقت سے پورا ہوتا ہے۔

زوج کے معنی

مرد اور عورت کی یہ امتیازی خصوصیات، صرف حیاتیاتی (BIOLOGICAL) ہیں۔ جہاں تک انسانی صلاحیتوں کا تعلق ہے، وہ دونوں کو یکساں طور پر حاصل ہیں۔ مرد نے عورت کو، ہزارہا سال سے، ان مواقع و ذرائع سے محروم رکھا جن سے اس

کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی، اور پھر یہ فتویٰ صادر کردیا کہ عورت ہوتی ہی ناقص العقل ہے۔ یہ غلط ہے۔ انہیں یکساں مواقع دیجئے اور پھر دیکھئے کہ یہ دونوں کس طرح کارگہ حیات میں دوش بدوش چلتے ہیں۔

یکساں صلاحیتیں

قرآن نے اعلان کیا ہے کہ

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِيْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآئِمِيْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَ الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (۳۳/۳۵)

اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرسکیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ (اَلْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ)۔ اگر مرد اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار بنتی ہے، تو عورتیں بھی اس کی رکن بن سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اس کا استعمال خدائی پروگرام کے مطابق ہو، تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَ الْقٰنِتِیْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ)۔ اگر مرد اپنے دعوےٰ ایمان کو سچ کر دکھانے کے قابل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَ الصّٰدِقِیْنَ وَ الصّٰدِقٰتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں (وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ)۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہوسکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں نشوونما پاتی جائیں وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے اور زیادہ جھکتے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں کو بھی حاصل ہے (وَ الْخٰشِعِیْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ)۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے (وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ)۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ جہاں سے انہیں روکا جائے وہ رک جائیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں (وَ الصَّآئِمِیْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورت بھی ایسا کرسکتی ہے (وَ الْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد، قانونِ خداوندی کو سمجھنے اور اسے ہر وقت اپنے سامنے رکھنے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (وَ الذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ)۔ جب یہ صلاحیتیں دونوں میں یکساں طور پر موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا، نظامِ خداوندی (اسلامی معاشرہ) میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا)۔ دوسرے مقام پر مومن عورتوں کی خصوصیت سٰٓئِحٰتٍ بھی بتائی گئی ہے (۶۶/۵) یعنی سیاحت کرنے والیاں بمقابلہ سیاحت کرنے والے مردوں کے ــــ (اَلسَّآئِحُوْنَ ۹/۱۱۲)۔

آپ قرآن کریم کی ان تصریحات پر غور کریں اور پھر دیکھیں کہ زندگی کا کون سا گوشہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت موجود ہے لیکن عورت میں نہیں. مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے لیکن عورت نہیں کر سکتی. مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی. یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال یکساں طور پر نتیجہ خیز ہوں گے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○ (۴/۱۲۴). حتیٰ کہ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ جو کچھ مرد کمائے گا وہ اس کا حصہ ہوگا. جو کچھ عورت کمائے گی وہ اس کا حصہ ہوگا. لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ (۴/۳۲)

امورِ مملکت اور عورت

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عورتیں امورِ مملکت میں حصہ نہیں لے سکتیں. لیکن یہ خیال بھی قرآن کریم کی تعلیم سے ناواقفیت پر مبنی ہے. قرآن کریم نے اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" بتایا ہے (۲۲/۴۱). اور اس فریضہ کے متعلق کہا ہے کہ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۹/۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں. یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ امورِ مملکت کی سرانجام دہی میں عورتیں برابر کی شریک ہیں۔

قطع نظر ان تصریحات کے ایک اصولی بات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے. قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں تمیز نہیں کی جا سکتی. اس کی تعلیم کی پوری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیدائش کے اعتبار سے برہمن اور شودر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ جھونپڑی میں جنم لینے والے بچے اور محل میں پیدا ہونے والے میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا. اس اصول کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ ایک شخص کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے اور ایک لڑکی. اس باب میں نہ لڑکے کی کوئی کاریگری ہے جس کی وجہ سے وہ لڑکا بن گیا. نہ لڑکی کا کوئی جرم کہ وہ لڑکی پیدا ہوئی. اب اگر اس اصول کو صحیح تصوّر کر لیا جائے کہ لڑکی' لڑکے سے (یا عورت' مرد سے) فروتر ہوتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم پیدائش کے اعتبار سے انسانوں کی ایک جنس کو افضل اور دوسری کو کمتر تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان میں یہ فرق ایسا ہے جسے کمتر فریق (یعنی عورت) لاکھ کوشش کرنے کے باوجود مٹا نہیں سکتی. آپ سوچئے کہ اس غلط تصوّر کی رُو سے کہ مرد کو محض مرد ہونے کی جہت سے' عورت پر فضیلت حاصل ہے' اسلام کی بلند ترین تعلیم کس طرح جڑ بنیاد سے اُکھڑ کر رہ جاتی ہے. یہ تصوّر ہمارا پیدا کردہ ہے. قرآن کا دامن اس سے پاک ہے۔

حیوان کے بچے کو ماں (یا ماں باپ کی طرف سے) صرف جسمانی پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی تربیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جسمانی پرورش کے بعد، وہ خود وہ کچھ بن جاتا ہے جو کچھ بننے کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے ــــ بکری کا بچہ بکری۔ شیر کا بچہ شیر۔ لیکن انسانی بچہ کو انسان بننے کے لئے، جسمانی پرورش کے علاوہ، تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تربیت گھر کے ماحول میں ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے قرآن، عائلی زندگی (FAMILY LIFE) کو بڑی

عائلی زندگی کی اہمیت

اہمیت دیتا ہے۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ "گھر" ہی کی پھیلی ہوئی شکل کا نام ہے۔ صبح کے وقت، گھر پھیل کر معاشرہ بن جاتے ہیں۔ اور رات کو معاشرہ سمٹ کر گھروں میں محدود ہو جاتا ہے۔ عربی زبان میں قوم کے لئے امت کا لفظ آتا ہے۔ قرآنِ کریم جس قسم کی قوم (جماعتِ مومنین) متشکل کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے بھی اس نے اُمت ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اُمت کا لفظ اُمٌّ سے بنا ہے جس کے معنی "ماں" ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کی تعمیر آغوشِ مادر میں ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ گھر کو نمونہ بنانا چاہتا ہے اس معاشرہ کا جسے وہ نوعِ انسان کے لئے جنتِ ارضی قرار دیتا ہے۔

فکر و نظر کی ہم آہنگی

گھر کو جنت بنانے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ میاں بیوی میں فکر و نظر اور خیالات و نظریات کی کامل ہم آہنگی ہو۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ نظریاتِ زندگی کے تضاد کے ساتھ شادی کرنا، گھر کو جہنم بنانا ہے (۲/۲۲۱)۔ اس کے برعکس، نظریات و معتقدات کی ہم آہنگی سے گھر جنت بن جاتا ہے (۲/۲۲۱)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ عورت اور مرد کو اپنے ساتھی کے انتخاب کا پورا پورا حق حاصل ہو۔ اس لئے قرآن مردوں سے کہتا ہے کہ وہ اپنی پسند کی عورتوں سے شادی کریں (۴/۳)۔ اور عورتوں کے متعلق کہتا ہے کہ مرد ان کے زبردستی مالک نہ بن جایا کریں (۴/۱۹)۔ ان حالات میں نابالغ لڑکے یا لڑکی کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے، نکاح نام ہے ایک بالغ مرد اور بالغ عورت کے برضا و رغبت، اپنی پسند کے مطابق، باہمی معاہدہ کا کہ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن کر، سکون اور محبت اور ہم آہنگی و یک نگہی کی زندگی بسر کریں گے (۳۰/۲۱) اور اس طرح معاشرہ میں ایسا خوشگوار ماحول پیدا کریں گے جس میں پرورش پا کر، ہماری آئندہ نسل متوازن شخصیت کی حامل اور شرفِ انسانیت کی پیکر بنے۔

تقسیمِ کار

چونکہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، گھر کی وحدت (UNIT) میں، تقسیمِ کار کے اصول کی رُو سے عورت کے وقت کا بیشتر حصہ، اولاد کی پرورش اور تربیت میں صرف ہو جاتا ہے، اس لئے

اکتسابِ رزق کی بنیادی ذمہ داری مرد کے سر ہوگی. اس کے لئے قرآن میں ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴/۳۴) عورتوں کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کی ذمہ داری مردوں پر ہے. واضح رہے کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ عورت اکتسابِ رزق کر ہی نہیں سکتی. جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے' قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ جو کچھ عورت کمائے اس کی وہ خود مالک ہوتی ہے (۴/۳۲). مردوں کو عورتوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذمہ دار قرار دینے سے مفہوم یہ ہے کہ گھر کے نظم و نسق میں چونکہ عورت کا بیشتر وقت بچوں کی پرورش اور تربیت میں صرف ہوجاتا ہے' اور مرد اس سے فارغ ہوتا ہے' اس لئے حصولِ معاش' بنیادی طور پر مرد کا فریضہ ہے. جہاں تک میاں بیوی کے حقوق اور فرائض کا تعلق ہے' قرآن نے

حقوق و فرائض

دونوں کو یکساں پوزیشن دی ہے. اس باب میں اس نے ایک ایسا اصول بیان کیا ہے جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے. وہ کہتا ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کے لحاظ سے عورتوں کی ذمہ داریاں اتنی ہی ہیں جتنے ان کے حقوق ہیں. باقی رہے میاں بیوی کے باہمی تعلقات' سو اس کے لئے بھی قرآن نے اسی قسم کا جامع اور مختصر اصول بیان کردیا ہے. جب کہا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷) "تم ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو جس کا بدن کے ساتھ ایسا گہرا اور براہِ راست تعلق ہوتا ہے کہ کوئی اور چیز ان کے درمیان حائل نہیں ہوسکتی.

قرآن نے نکاح کو باہمی معاہدے سے تعبیر کیا ہے جو فریقین کی دلی رضامندی سے استوار ہوتا ہے (۴/۲۱) وہ تاکید کرتا ہے کہ اس معاہدہ سے پہلے اچھی طرح دیکھ بھال کر لینی چاہیئے اور ہر ممکن طریقے سے اس کا اطمینان کرلینا چاہیئے کہ یہ معاہدہ عمر بھر تک بہ حسن و خوبی نبھ جائے گا. اس کے بعد وہ ایسی ہدایات دیتا ہے جن کی رُو سے یہ معاہدہ میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے. لیکن' اس کے باوجود' قرآن حقائق سے آنکھ نہیں چراتا. وہ تسلیم کرتا ہے کہ اس قدر احتیاط اور تاکید کے باوجود' ایسی صورت پیدا ہوسکتی ہے کہ فریقین میں اختلاف پیدا ہوجائے. ایسی حالت میں' وہ معاشرہ کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ ان کے باہمی اختلافات مٹانے کی پوری پوری کوشش کرے. اس کے لئے وہ تجویز کرتا ہے کہ فریقین کے نمائندگان پر مشتمل ایک مصالحتی بورڈ بٹھایا جائے جو ان کے اختلافات

---

[1] قرآن نے کہا ہے کہ صرف ایک بات میں مرد کا حق فائق ہے اور وہ یہ کہ طلاق کی صورت میں' عورت کو نکاحِ ثانی کے لئے کچھ وقت تک انتظار کرنا پڑتا ہے (جسے عدت کہا جاتا ہے) اور مرد کے لئے انتظار کی ضرورت نہیں. (۲/۲۲۸)

کو رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی (۴/۳۵)۔ لیکن اگر ان کی کوشش ناکام رہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ ان میاں بیوی میں نباہ کی کوئی صورت نہیں رہی، تو پھر ان کے معاہدہ نکاح کو منقطع کر دیا جائے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔[1]

چونکہ قرآن، میاں بیوی میں فکر و نظر کی ہم آہنگی، اور ان کے تعلقات میں محبت و سکون کی شیرینی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے، اس لئے اس میں، ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام کا عام اصول وحدتِ ازدواج (MONOGAMY) ہے۔ لیکن وہ اس باب میں، بعض ناگزیر حالات سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ

تعدّدِ ازدواج

بعض حادثات کی وجہ سے (مثلاً جنگ کی وجہ سے) ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں، بیوہ عورتوں (ان کے ساتھ یتیم بچوں) اور بالغ لڑکیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ وحدتِ ازدواج کے اصول کے مطابق، ان کے لئے شادی کا امکان نہ ہو۔ ایسے حالات میں، معاشرہ میں جو جنسی فوضویت پھیل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے ہنگامی حالات پر قابو پانے کے لئے، وحدتِ ازدواج کے اصول میں استثناء کی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (۴/۳) "اگر تمہیں اس کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچوں اور ان عورتوں کا مسئلہ جنہیں خاوند نہ مل سکتا ہو، منصفانہ طور پر حل نہ کر سکو گے، تو تمہیں اجازت ہے کہ تم، ان عورتوں میں سے حسبِ پسند دو دو، تین تین، چار چار تک سے شادی کر لو (یعنی جس حد تک اس ہنگامی ضرورت کا تقاضا ہو) یاد رہے کہ وہ مسلمان عورتیں، جو بیوہ ہو جائیں یا ان کی عمر شادی کے قابل ہو جائے اور ان کی ازدواجی زندگی کے لئے مسلمان مرد موجود نہ ہوں، معاشرہ کے لئے ایک ضروری مسئلہ (PROBLEM) بن جائیں گی۔ اس لئے کہ مسلمان عورت، غیر مسلم سے شادی کر ہی نہیں سکتی۔ اسے مسلمانوں کے اندر ہی شادی کرنی ہو گی۔ اور وحدتِ ازدواج کے اصول کے ماتحت اس کی گنجائش نہ ہو گی۔ اس غیر معمولی (ABNORMAL) صورتِ حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قرآن نے یہ حل تجویز کیا ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ ان لواحقین اور ان کے یتیم بچوں کے ساتھ عدل کیا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر اس کی بھی اجازت نہیں۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳)۔

---

[1] چونکہ اس کتاب میں، دین کے صرف اصول بیان کئے جا رہے ہیں اس لئے ان کی جزئیات کی تفصیلی بحث نہیں دی گئی۔ عائلی زندگی سے متعلق تفصیلی احکام میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" میں ملیں گے۔

"اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل قائم نہیں رکھ سکو گے، تو پھر اس کی اجازت نہیں۔ پھر وہی وحدتِ ازدواج کا اصول برقرار رہے گا" عدل کے لئے بنیادی شرط یہ ہوگی کہ پہلی بیوی (اور کسی کے پہلی بیوی نہ ہو تو جن عورتوں سے شادی کرنا چاہتا ہے، وہ) اس پر رضامند ہوں۔ اگر وہ رضامند نہ ہوں گی تو عدل ناممکن ہو جائے گا۔ گھر جہنم بن جائے گا۔

قرآنِ کریم میں بیک وقت، ایک سے زیادہ بیوی کے متعلق یہی ایک آیت ہے۔ لہٰذا ' ان حالات کے علاوہ اور کسی صورت اور کسی مقصد کے لئے بھی ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت نہیں۔

ایک اہم حقیقت

تعددِ ازدواج کے سلسلہ میں ایک اہم حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمارے گھروں میں جوان بہنیں، بیٹیاں یا اور ایسے رشتے کی عورتیں موجود ہوتی ہیں جن سے نکاح جائز نہیں۔ ہم ان جوان لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ دن رات گھلے ملے رہتے ہیں۔ لیکن ان مردوں یا عورتوں کے دل میں جنسی جذبہ کا شائبہ تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ اس ماحول میں زندگی کامل عفت و عصمت کی گزرتی ہے۔ اس دائرہ کے اندر جوان لڑکیوں اور غیر شادی شدہ عورتوں کو ان لڑکوں یا مردوں کی طرف سے پورا پورا اطمینان ہوتا ہے۔ انہیں ان کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے! اس لئے کہ یہ وہ دائرہ ہے جس میں ایک دوسرے سے نکاح جائز نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس قدر یہ دائرہ وسیع ہوگا اسی قدر معاشرہ میں جنسی امن و عافیت ہوگی اور اسی قدر عورتوں کو مردوں کی طرف سے سکون اور اطمینان حاصل ہوگا۔

جب وحدتِ ازدواج کو بطور اصول تسلیم کر لیا جائے، تو جب ایک مرد کسی عورت سے شادی کر لے' اس کے بعد' اس بیوی کی موجودگی میں' دنیا کی ہر عورت سے اس مرد کا نکاح ناجائز قرار پا جاتا ہے۔ اس سے آپ دیکھئے کہ وہ دائرہ کس قدر وسیع ہو گیا جس میں جنسی امن و عافیت کی فضا عام ہوتی ہے اور جس میں عورتوں کو مردوں کی طرف سے کامل اطمینان اور بے خوفی ہوتی ہے (واضح رہے کہ ہم اُس معاشرہ کا ذکر رہے ہیں جس میں زنا کو حرام قرار دیا گیا ہو) اس میں (مرد کی شادی کے بعد) نہ کوئی عورت اس مرد کی طرف اس خیال سے دیکھ سکتی ہے کہ یہ مجھ سے شادی کر لے۔ نہ وہ مرد کسی عورت پر اس خیال سے نظر ڈال سکتا ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ علاوہ بریں یہ بھی دیکھئے کہ اس شخص کی بیوی بھی کس قدر اطمینان کی زندگی بسر کرے گی۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی موجودگی میں اس کا خاوند کسی عورت کے متعلق یہ دھیان بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس سے شادی کر لے گا۔ نہ ہی وہ کسی سے ناجائز تعلق پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن اگر معاشرہ میں تعددِ ازدواج کی کھلی چھٹی ہو تو اس سے امن وسکون کی یہ ساری فضا، دھڑکنوں اور کاہشوں کا جہنم اور شکوک اور شبہات کا دوزخ بن جاتی ہے. اس مرد کی بیوی کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم یہ کس وقت دوسری بیوی لے آئے. جس عورت کا جی چاہے وہ اس مرد کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش میں لگ سکتی ہے کہ وہ اسے اپنی بیوی بنالے. مرد، ہر عورت کی طرف جاذب نگاہ سے دیکھ سکتا ہے کیونکہ اس عورت کو اپنے نکاح میں لے آنا نہ کوئی جرم ہے نہ گناہ۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس فرق سے، معاشرہ کا نقشہ کیا سے کیا بن جاتا ہے؟

قرآن کریم نے زنا کو حرام قرار دے کر اور وحدتِ ازدواج کو بطور اصول مقرر کرکے، معاشرہ کی ان تمام خرابیوں کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیا جن کی رُو سے عورت، ہر مرد سے سہمی سہمی رہتی ہے. اس سے سکون اور اطمینان کی جنت بدوش فضا پیدا کر دی. لیکن اس کے ساتھ ہی مخصوص حالات میں، تعددِ ازدواج کی ضرورت کو تسلیم کرکے معاشرہ کو ان تباہیوں سے بھی محفوظ کر لیا جن میں اس وقت یورپ اس بُری طرح گھرا ہوا ہے.

نزولِ قرآن کے وقت، دنیا کی قریب قریب ہر قوم میں غلامی کا رواج تھا. ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی بنیادی تعلیم تکریم ومساواتِ انسانیہ ہے. وہ اسے مستقل قدر قرار دیتا ہے جس سے کسی صورت میں بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا. ظاہر ہے کہ ان حالات میں وہ غلامی جیسی انسانیت سوز لعنت کو کس طرح جائز اور روا قرار دے سکتا تھا. اس زمانے میں، جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا کرتے تھے. قرآن کریم نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق حکم دے دیا کہ انہیں بہرحال چھوڑنا ہوگا. فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴). خواہ فدیہ لے کر یا خواہ احسان رکھ کر. اور جب تک وہ قیدیوں کی حیثیت سے تمہارے پاس رہیں گے ان سے انسانیت کا سلوک کیا جائے گا. کیونکہ جماعتِ مومنین تکریم آدمیت کی مستقل قدر کے خلاف کسی حالت میں بھی کچھ نہیں کر سکتی. یوں قرآن نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا.

غلام اور لونڈیاں

لیکن اُس وقت عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیوں کی بھرمار تھی. اگر قرآن انہیں فوراً نکال دینے کا حکم دے دیتا تو معاشرہ کا نظام درہم برہم ہو جاتا. اس لئے اس نے ایسے احکام وضوابط دے دیئے جن سے، رفتہ رفتہ وہ تمام غلام اور لونڈیاں یا آزاد ہو جائیں یا مسلمانوں کے افرادِ خاندان بن جائیں. قرآن کریم میں جہاں جہاں "مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ" کا ذکر آتا ہے ان سے مراد وہ غلام اور لونڈیاں ہیں جو اُس وقت وہاں کے معاشرہ میں موجود تھے. لہٰذا ان کے آزاد ہو جانے، یا معاشرہ میں جذب ہو جانے کے بعد، قرآن کی رُو سے، غلاموں اور لونڈیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. یہ تصوّر قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے.

مرد اور عورت کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں، قرآنِ کریم نے جو سب سے بڑا انقلابی تصوّر پیش کیا، وہ جنسیات سے متعلق ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہنے کو تو انسان یہی کہتا ہے کہ میاں بیوی کا جنسی اختلاط، اولاد پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے، لیکن یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس تعلق سے اوّلین مقصود حظِّ نفس ہوتا ہے۔ عورت کو مرد نے، اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا ذریعہ سمجھ اور بنا رکھا ہے، اور شادی سے مقصود یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس تسکینِ نفس کو قانونی یا معاشرتی جواز حاصل ہو جائے۔ اس تصوّر نے کہ جنسی اختلاط سے مقصود حظِّ نفس ہے، تاریخِ انسانیت میں جس قدر تباہیاں پیدا کی ہیں، ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ زر اور زمین کی طرح، زن بھی انسان کے لئے ایک مسئلہ (PROBLEM) بن گئی ہے، اور بنی رہے گی جب تک انسان، جنسیت کے متعلق صحیح نظریہ قائم نہیں کر لے گا قرآن نے جنسیت کے متعلق صحیح نظریہ پیش کیا ہے۔

آپ حیوانات میں دیکھئے۔ جنسی اختلاط سے مقصد افزائشِ نسل ہوتا ہے۔ حظِّ نفس نہیں ہوتا۔ دیگر امور کی طرح،

جنسی اختلاط سے مقصد

اس کا کنٹرول بھی فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ حیوانات میں جنسی خواہش صرف اس وقت بیدار ہوتی ہے جب فطرت کے مقرّر کردہ پروگرام کے مطابق، استقرارِ حمل کا وقت آتا ہے۔ جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو نر و مادہ دونوں میں یہ جذبہ خاموش ہو جاتا ہے۔ انہیں نہ اس پر اختیار ہوتا ہے کہ اسے جب جی چاہے از خود بیدار کر لیں۔ نہ اس پر قابو کہ اس کے بیدار ہونے کے بعد اس کی تسکین نہ کریں، ان کے سلسلہ میں، غالبؔ کے الفاظ میں، یہ وہ آتش ہے ؎

کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

حیوانات کی طرح انسانوں میں بھی، افزائشِ نسل کا ذریعہ جنسی اختلاط ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جنسی اختلاط کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، انسان اور دیگر حیوانات میں فرق یہ ہے کہ حیوانات مجبور پیدا کئے گئے ہیں اور انسان، صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ انسان اور کتا دونوں جانتے ہیں کہ سنکھیا ان کے لئے موجبِ ہلاکت ہے۔ کتا اپنی مرضی سے کبھی سنکھیا نہیں کھاتا اس لئے کہ اسے اس کا اختیار ہی نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جس چیز کو چاہے کھا لے اور جس سے جی چاہے پرہیز کرے لیکن انسان، اپنی مرضی سے سنکھیا کھا کر خودکشی کر سکتا ہے۔ انسان کو اسی قسم کا اختیار، جنسی اختلاط کے بارے میں بھی دیا گیا ہے۔

انسان کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا، اس کے لئے ہزار نفع بخشیوں کا باعث ہے۔ لیکن، دوسری طرف، اس کا یہی اختیار، اس کے لئے ہلاکت اور تباہی کا موجب بھی ہے۔ کتے کی یہ مجبوری کہ وہ سنکھیا کھا نہیں سکتا، اسے ہلاکت سے

تو محفوظ رکھتی ہے، لیکن اس سے وہ سنکھیا کے بے شمار فوائد سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ انسان اگر سنکھیا قانونِ فطرت کے مطابق استعمال کرے تو اس سے بہت سے فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ اگر اسے قانونِ فطرت کے خلاف استعمال کرے تو سنکھیا اس کی ہلاکت کا موجب بن جاتا ہے۔ یعنی انسانی اختیار و ارادہ کا صحیح استعمال اس کے حق میں موجبِ رحمت ہوتا ہے اور اس کا غلط استعمال، باعثِ ہلاکت۔

جنسی اختلاط کے معاملہ میں، حیوانات کو مجبور پیدا کرنے سے، ان کی نسل کے مسئلہ کو فطرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ فطرت کے پروگرام کے مطابق، بچے پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ــــــ وہ نہ اس میں کمی کر سکتے ہیں نہ بیشی۔ وہ اس زمانے

پیدائش پر کنٹرول

میں جسے فطرت نے ان کے لئے متعین کیا ہے، نہ اختلاط (فلہٰذا استقرارِ حمل) سے رُک سکتے ہیں، اور نہ ہی اس زمانے کے علاوہ، دیگر اوقات میں اختلاط کر سکتے ہیں۔ لیکن فطرت نے انسان کو اس بارے میں بھی آزادی دی ہے کہ وہ اپنی مصلحت کے مطابق افزائشِ نسل پر خود کنٹرول رکھے۔ یعنی جتنے بچے پیدا کرنا چاہے کرے۔ اس سے زیادہ پیدا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور نہ پائے۔

اسے اختیار تو دیا گیا تھا اس مقصد کے لئے، لیکن اس نے جنسی اختلاط کو ذریعہ سمجھ لیا اپنے حظِ نفس کا۔ پھر اس سلسلہ میں وہ تباہیاں مچائیں کہ توبہ بھلی! اس نے، جنسیات کو اس کے لئے ایسا مسئلہ (PROBLEM) بنا دیا جس کا کوئی حل ہی اس کی سمجھ میں نہیں آتا ــــــ انسانی اختیار و ارادہ کا غلط استعمال، اس کے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کر دیتا ہے، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اس سے موزوں تر مثال نہیں پیش کی جا سکتی ــــــ پہلے اس نے اپنی غلط نگہی اور جذبات پرستی کے ہاتھوں، فطرت کے ایسے سادہ سے پروگرام کو، اپنے لئے ایک مسئلہ بنا لیا، اور پھر اس مسئلہ کے حل کی

عجیب مصیبت

تلاش میں، ایسے ایسے الجھاؤ پیدا کئے کہ الف لیلہ کے شاہزادہ کی طرح، ان "بھول بھلیاں" میں ہمیشہ کے لئے کھو کر رہ گیا۔ حتیٰ کہ فرائڈ اور اس کے مکتبِ فکر نے یہاں تک کہہ دیا کہ جنسیات وہ محور ہے جس کے گرد، انسان کی ساری دنیا گردش کرتی ہے، حتیٰ کہ ماں اور بچہ کی باہمی کشش، اور (اس کے ذہن کے تراشیدہ) "خدا" اور بندے کا تعلق بھی، اس کے جنسی تاثرات ہی کا رہینِ منت ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ نظریہ پیدا کیا گیا کہ جنسی جذبہ بھی، بھوک اور پیاس کی طرح، طبیعی تقاضا ہے جس کی تسکین نہایت ضروری ہے۔ اگر اس تقاضے کو دبا دیا جائے تو اس سے ہزار خرابیاں (اور اعصابی بیماریاں) پیدا ہوتی ہیں، اور اسے جس قدر زیادہ کھل کھیلنے کا موقعہ

جنسی جذبہ طبعی تقاضا نہیں

دیا جائے، اُسی قدر انسانی شعور کی گرہیں کھلتی ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت بالکل بدیہی ہے کہ جنسی تقاضا، بھوک اور پیاس کی طرح طبیعی نہیں۔ مثلاً آپ

کسی کام میں منہمک بیٹھے ہوں۔ جب جسم کو پانی کی ضرورت محسوس ہوگی تو پیاس کا احساس بیدار ہونا شروع ہو جائے گا۔ شروع شروع میں یہ احساس خفیف سا ہوگا۔ لیکن اگر آپ پانی نہیں پئیں گے تو اس کی شدت بڑھنا شروع ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ اس حد تک بڑھ جائے گی کہ آپ کے لئے کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر آپ اس پر بھی پانی نہیں پئیں گے تو بیمار ہو جائیں گے اور آخرالامر آپ کی موت واقع ہو جائے گی۔ اسے کہتے ہیں "طبیعی تقاضا"۔ اس کے برعکس، جنسی تقاضا کا یہ عالم ہے کہ وہ کبھی بیدار نہیں ہوتا، جب تک آپ خود اپنے خیال سے اسے بیدار نہ کریں۔ اسے خیال سے بیدار کرنا پڑتا ہے اور خیال ہی سے وہ سرد بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ اگر اس تقاضا کی تسکین نہ کی جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور آخرالامر اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے تمام عمر اس تقاضا کی تسکین نہیں کی اور اس کے باوجود ان کی صحت پر کوئی مضر اثر نہیں پڑا۔ مضر اثر پڑنا تو ایک طرف ان کی صحت اور زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ اس کا مضر اثر اس وقت پڑتا ہے جب آپ اپنے خیالات کے ذریعے بار بار اس احساس کو بیدار کرتے رہیں۔ اگر آپ کے خیالات اس طرف نہ جائیں، تو اس سے انسانی صحت، اور خیالات پر بڑا خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ اس کی تائید میں، بڑے بڑے ڈاکٹروں اور نفسیات اور جنسیات کے ماہروں کی شہادات موجود ہیں ــــ اور سب سے بڑی شہادت تو انسان کا خود اپنا تجربہ ہے۔ جس کا جی چاہے اسے کر کے دیکھ لے۔ شرط یہ ہے کہ اپنے خیالات کو اس طرف نہ آنے دے۔

لہٰذا، جنسی جذبہ طبیعاتی تقاضا (PHYSICAL NECESSITY) نہیں نفسیاتی تحرک (PSYCHOLOGICAL URGE) ہے جسے انسان خود بیدار کرتا ہے۔ اگر یہ اسے، اپنے پروگرام کے مطابق، افزائشِ نسل کے لئے بیدار کرتا ہے، تو اس کا نتیجہ خود اس کے، اور انسانیت کے لئے منفعت بخش ہوتا ہے۔ اور اگر اسے محض حظِ نفس کے لئے بیدار کرتا، اور اس کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے، تو اس سے

یہ نفسیاتی تحرک ہے

انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ اور انسان کبھی نہیں سوچتا کہ وہ اتنی سی وقتی لذت کی کتنی بڑی قیمت ادا کر رہا ہے۔ غذا کا مقصد جسم کی پرورش ہے۔ اس کی لذت ثانوی چیز ہے جو شخص محض لذت کی خاطر کھائے اور اپنی صحت تباہ کرتا چلا جائے، اسے پاگل نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔ اسی طرح، جنسی اختلاط کا مقصود افزائشِ نسل ہے۔ لذت ثانوی چیز ہے۔ جو شخص محض لذت کی خاطر جنسی اختلاط کی طرف جائے اور اس طرح اپنے لئے اور عالمِ انسانیت کے لئے ہزار قسم کی پیچیدگیاں پیدا کر کے معاشرہ کو جہنم بناتا جائے، اس کی دیوانگی میں بھی کیا شبہ ہو سکتا ہے! لیکن اس کا کیا علاج کہ انسان نے ہزارہا سال سے یہ غلط روش اختیار کر کے اس دیوانگی کو کمالِ ہوش سمجھ رکھا ہے ــــ اور اس کا خمیازہ بھی بھگت رہا ہے۔

قرآنِ کریم نے انسان کے اس (خود پیدا کردہ) مشکل ترین مسئلہ کا حل چار لفظوں میں پیش کر دیا جب کہا کہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (۲/۲۲۳) "تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کے ہیں. تم اپنی کھیتی میں اپنے پروگرام کے مطابق آؤ" یہاں کھیتی کی مثال نے بات بالکل واضح کر دی. کسان کھیتی میں اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے. وہ محض جی بہلانے کی خاطر ہل نہیں چلاتا. نہ بیج بکھیرتا ہے. لہٰذا میاں بیوی کے جنسی اختلاط سے مقصد، اولاد پیدا کرنا ہے. نہ کہ حصولِ لذت. جنسی اختلاط ہونا ہی اس وقت چاہیئے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو. اور اولاد، اپنے پروگرام کے مطابق پیدا کرنی چاہیئے. باقی رہا جنسی جذبہ کا طبیعی تقاضا کی طرح نہ ہونا، سو قرآن نے اسے بھی واضح کر دیا. کھانے پینے کے معاملہ میں اس نے بعض چیز کو حرام قرار دیا ہے. لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر

اضطراری حالت

کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کچھ اور کھانے کا نہ ملے اور تمہاری حالت اضطراری ہو جائے" تو اس وقت اجازت ہے کہ تم حرام چیزوں کو بقدرِ ضرورت کھا لو (۲/۱۷۳). اس کے برعکس، جنسی جذبہ کے سلسلہ میں کہا ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا (۲۴/۳۳) "جو لوگ نکاح کا سامان نہ پائیں، انہیں چاہیئے کہ وہ ضبطِ نفس سے کام لیں" یعنی، قرآن نے کھانے پینے کے معاملہ میں تو اضطراری حالت کو تسلیم کیا ہے، لیکن جنسی تقاضے کے سلسلے میں اسے تسلیم نہیں کیا. اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، جنسی جذبہ طبیعی تقاضا نہیں محض نفسیاتی تحرک ہے جس کا بیدار کرنا انسان کے اپنے خیالات پر منحصر ہے. اور جو بات انسان کے اپنے اختیار کی ہو اس میں اضطراری حالت کا کیا سوال؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زنا کو حرام قرار دیا ہے اور کسی حالت میں بھی اس کی اجازت نہیں دی. اس

زنا حرام ہے

کے نزدیک یہ جرم بڑا سنگین ہے جس کی سزا سخت ہے. مغربی معاشرہ میں، اگر ایک بالغ (غیر شادی شدہ) جوڑا، بلا نکاح، باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط کر لیتا ہے تو اسے جرم قرار نہیں دیا جاتا. لیکن قرآن اسے بھی جرم ٹھہراتا ہے. اس لئے کہ زنا کا محرک جذبہ حصولِ لذت ہوتا ہے اولاد پیدا کرنا نہیں ہوتا. مغرب میں، مذکورہ بالا شکل میں، اگر لڑکی کو حمل قرار پا جائے اور وہ جوڑا اس کے بعد شادی کر لے، تو اس بچے کو قانوناً جائز تسلیم کر لیا جاتا ہے. اس لئے کہ (ان کے نزدیک) ایسی صورت میں، اختلاط کا مقصد خالی حصولِ لذت نہیں رہتا. پیدائشِ اولاد بھی اس میں آجاتی ہے. یعنی ان کے نزدیک بھی، محض حصولِ لذت کی خاطر جنسی اختلاط میں، اور اس اختلاط میں جس کا نتیجہ اولاد ہو، فرق ہوتا ہے. قرآن اسے بھی زنا قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں درحقیقت مقصد حصولِ لذت ہی تھا. یہ محض ایک حادثہ تھا جس کی وجہ سے حمل قرار پا گیا. اس کے نزدیک نکاح سے مفہوم ایسا معاہدہ ہے جس کی رُو سے ایک جوڑا، باہمی رفاقت کی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کرتا ہے. اس رفاقت میں ایسی نسل کی افزائش بھی آجاتی ہے جو صحیح تربیت پا کر،

شرفِ انسانیت کی اہل قرار پائے. وہ ایسے اختلاط کو جس میں مادہ تولید کو محض "بہا دیا جائے" "مقصودِ نکاح کے خلاف قرار دیتا ہے. (۴/۲۴)

فیملی پلاننگ

اس وقت دنیا ایک ایسے مسئلہ سے دوچار ہے جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے کسی صورت میں بھی "ایٹم بم" کے خطرہ سے کم نہیں. وہ مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کی آبادی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ اندیشہ ہے کہ کچھ وقت کے بعد زمین کی پیداوار کھانے والوں کے لئے کافی نہیں ہوسکے گی. دنیا کی مختلف حکومتیں پیداوار بڑھانے کے سلسلہ میں بھی بہت کچھ کر رہی ہیں، لیکن اندازہ یہی ہے کہ پیداوار میں اضافہ کی رفتار آبادی کی رفتار کا مقابلہ نہیں کرسکے گی. اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے سوچا یہ گیا ہے کہ آبادی کے بے تحاشا بڑھنے کی روک تھام کی جائے. اس مقصد کے لئے مانع حمل ادویات و آلات ایجاد کئے جارہے ہیں اور نوجوان عورتوں اور مردوں کو ان کے استعمال پر آمادہ کیا جارہا ہے. لیکن یہ تدابیر کماحقہ کامیاب نہیں ہورہیں. ایک تو یہ ہر حالت میں مؤثر ثابت نہیں ہوتیں. دوسرے ان پر خرچ بہت آتا ہے. پھر ان کے دُوررس نتائج و عواقب کے متعلق طبّی دنیا ابھی تک کسی حتمی فیصلہ پر نہیں پہنچی جس کی وجہ سے ان کی تائید و تردید میں بہت کچھ کہا جارہا ہے ـــــ یہ سب کچھ ہورہا ہے اور اس کے ساتھ آبادی برابر بڑھتی جارہی ہے. اس سوال نے دنیا کے اربابِ فکر و نظر کے لئے عجیب پریشانی پیدا کر رکھی ہے.

لیکن آپ نے غور کیا ہے کہ اس پریشانی کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ جنسی اختلاط کے متعلق یہ نظریہ کہ اس کا مقصد حصولِ لذّت ہے. مانع حمل تدابیر پیش کرنے اور ان پر عمل کرنے والے' دونوں یہ چاہتے ہیں کہ جنسی اختلاط سے حظِّ نفس تو حاصل ہوجائے لیکن اولاد پیدا نہ ہو. جب تک انسان اپنے اس غلط نظریہ میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا' اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل کبھی نہیں مل سکے گا. یعنی یہ تبدیلی کہ، جنسی اختلاط ہونا ہی اس وقت چاہیئے جب اولاد پیدا کرنا مقصود ہو. اگر یہ نظریہ اختیار کرلیا جائے تو نہ صرف آبادی کے مسئلہ کا اطمینان بخش حل مل جائے گا بلکہ "عورت" سے متعلق اور بہت سے مسائل بھی حل ہوجائیں گے.

چونکہ جنسی اختلاط سے متعلق غلط نظریہ قرنہا قرن سے متواتر چلا آرہا ہے' اس لئے اس میں تبدیلی بظاہر مشکل نظر آتی ہے. لیکن یہ ناممکن نہیں. وہ کون سا نظریہ ہے جس میں صحیح تعلیم و تربیت سے تبدیلی نہیں پیدا کی جاسکتی؟ اس وقت بھی دنیا کی ہر قوم اور ہر قبیلہ میں' جنسی اختلاط کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی پابندی ضرور ملے گی جس پر غیر شعوری طور پر عمل ہورہا ہوگا ـــــ مثلاً یہ کہ بہن اور بھائی میں ازدواجی رشتہ نہیں ہوسکتا' یا ماہواری ایام کے دوران میاں بیوی میں جنسی اختلاط جائز نہیں ـــــ ان ضوابط کی' غیر شعوری طور پر پابندی اس لئے ہورہی ہے کہ یہ باتیں بچّوں کی تعلیم

تربیت میں داخل ہیں۔ اسی طرح اگر یہ نظریہ بھی تعلیم و تربیت میں داخل ہو جائے کہ جنسی اختلاط صرف افزائشِ نسل کے لئے

صحیح تعلیم کی ضرورت

ہے، تو دو چار نسلوں کے بعد اس پابندی پر بھی غیر شعوری طور پر عمل ہونا شروع ہو جائے گا۔ بالخصوص اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، جنسی جذبہ بیدار ہی خیالات کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا، جنسیات سے متعلق کسی نظریہ میں اصلاح یا تبدیلی کے لئے، خیالات میں اصلاح یا تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلیم و تربیت کی رُو سے اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں نوجوانوں کے خیالات از خود جنسیات کی طرف منتقل نہ ہوتے چلے جائیں۔ جنسیات کے متعلق موجودہ غلط نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری فضا ایسے جراثیم سے بھرپور رہتی ہے جو جنسی جذبہ کی بیداری کے لئے زبردست محرک ہوتے ہیں۔ عورتوں میں جذبۂ نمائشِ حسن اور اس کے لئے متنوع طرق و اسالیب اور قسم قسم کے مواقع و تقاریب، بیباک جنسی لٹریچر، اور سینما کی فلمیں، پست درجے کے عشقیہ گانے۔ سب سے بڑھ کر خود زندگی کے متعلق یہ تصوّر کہ انسانی زندگی بس طبیعی زندگی ہے۔ حیوانی سطح سے اوپر کوئی اور سطح نہیں۔ نہ ہی کوئی ایسی مستقل اقدار ہیں جن کا تحفظ وجہ شرفِ انسانیت ہے۔ ان مختلف عناصر کا مجموعی اثر یہ ہے کہ نوجوانوں کو اپنے خیالات پر کنٹرول ہی نہیں رہتا۔ اور جب خیالات پر کنٹرول نہ ہو تو جنسیات پر کیا کنٹرول ہوگا؟

قرآن کریم ایسا جامع پروگرام تجویز کرتا ہے جس کے مطابق عمل کرنے سے انسان کے نظریات و تصوّرات اور خیالات و معتقدات میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور معاشرہ کی فضا ان جراثیم سے پاک اور صاف رہتی ہے جو جذبات میں غلط تحرکات کا موجب بنتے ہیں۔ مثلاً

(۱) وہ زندگی کے متعلق یہ بنیادی تصوّر دیتا ہے کہ زندگی حیوانی سطح کی نہیں۔ اس سے بلند، انسانی سطح کی ہے۔

قرآنی تصوّرات

جس کی نشوونما ان مستقل اقدار کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔ حفاظتِ عصمت بھی ایک مستقل قدر ہے۔

(۲) وہ عورت کے دل سے یہ غلط تصوّر نکالتا ہے کہ وہ مرد کے لئے پیدا کی گئی ہے اس لئے اس کا مقصدِ حیات صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح مرد کی نگاہوں میں جاذب بنی رہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ اس کی الگ، جداگانہ، منفرد حیثیت ہے اور اس کی زندگی کا منتہیٰ بھی وہی ہے جو مرد کی زندگی کا ہے۔ انسان ہونے کی جہت سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں فرق صرف ان طبیعی خصوصیات کا ہے جو افزائشِ نسل کے سلسلہ میں عورت کے لئے ضروری ہیں۔

عورت اپنی انسانی صلاحیتوں کی اسی طرح نشو ونما کر سکتی ہے جس طرح مرد کر سکتا ہے' اور ان فرائض کی سرانجام دہی کے بعد جو اس کے لئے فطرت نے مختص کر دیئے ہیں' وہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کے دوش بدوش چل سکتی ہے جب عورت کے ذہن سے یہ غلط خیال محو ہو جائے کہ اس کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ وہ مرد کی نگاہوں میں جاذب رہے' تو اس کے دل سے نمائشِ حسن کا پست جذبہ بھی نکل جاتا ہے. اور اس جذبہ کے نکل جانے سے سینکڑوں گتھیاں سلجھ جاتی ہیں' قرآن' عورت کو گھر کی چار دیواری میں محبوس نہیں رکھنا چاہتا. وہ اس غلط تصوّر کی اصلاح کرتا ہے جو اس میں نمائشِ حسن کے جذبہ کا محرّک بنتا ہے. وہ اسے مرد کا کھلونا بننے کے بجائے' سفرِ حیات میں اس کا رفیق بننا سکھاتا ہے.

زیب و زینت

واضح رہے کہ قرآن' زیب و زینت اور آرائش و زیبائش کو حرام قرار نہیں دیتا. وہ اس کے برعکس' للکار کر کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲). ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی ان چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے' اور خوشگوار اور پاکیزہ رزق کو حرام قرار دے سکتا ہے؟ "زیب و زینت" میں فنونِ لطیفہ خود بخود آجاتے ہیں' کیونکہ وہ حسنِ کائنات کی نمود و اظہار کا ذریعہ ہیں. وہ عورت کو ان مواقع پر اظہارِ زینت سے روکتا ہے جہاں وہ غیر مردوں کے دل میں جنسی جذبہ سے متعلق خیالات کی بیداری کا موجب بنے. (۲۴/۳۰-۳۱)؛ (۳۳/۳۳)

(۳) وہ مرد کے دل سے اس غلط نظریہ کو دور کرتا ہے کہ جنسی اختلاط کا مقصد حصولِ لذّت ہے. وہ اسے بتاتا ہے کہ اس سے مقصد صرف افزائشِ ہے' اس لئے اولاد پیدا کرنے کے علاوہ' اختلاطِ جنسی فطرت کی منشار کے خلاف ہے. اور اولاد پیدا کرنے کے لئے جنسی اختلاط کی جائز صورت باقاعدہ شادی ہے.

(۴) وہ بچّوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا پروگرام تجویز کرتا ہے جس سے ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما ہو. انسانی زندگی کا بلند مقصد نمایاں طور پر سامنے رہے. اور وہ حیوانی سطح کے پست درجہ پر آنے نہ پائیں.

(۵) وہ فضا کو ایسے جراثیم سے ملوّث ہونے نہیں دیتا جو جنسی بے راہ روی کے محرّک ہوں.

(۶) وہ تحفّظِ عصمت کو مستقل قدر قرار دیتا ہے' اور اس کی خلاف ورزی کو جرم ٹھہراتا ہے جس کی سخت سزا ہے. مغرب کے مفکّرین اور محقّقین اب خود' اپنی تحقیقات کے بعد' اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسانی ارتقاء کے لئے تحفّظِ عصمت نہایت ضروری ہے. اس سلسلہ میں ہم کیمبرج یونیورسٹی کے ڈاکٹر J.D. UNWIN کی تحقیقات کا ماحصل مختصر الفاظ میں پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں. اس نے دنیا کے مختلف حصّوں میں بسنے والے اسّی غیر مہذّب (قدیمی) قبائل کی جنسی زندگی کا مطالعہ کیا' اور اس کے بعد سولہ[16] مہذّب اقوام کے معاشرہ کا مطالعہ. اس تحقیق کے نتائج کو اس نے اپنی کتاب

SEX AND CULTURE میں بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔

اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بناء پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔ (P-XIV)

وہ آگے چل کر لکھتا ہے :-

اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کس وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (صفحہ ۳۰۲)

وہ اسی قبائل کی تمدنی سطح کے مطالعہ کے بعد جن نتائج پر پہنچا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

(i) جن قبائل نے شادی سے قبل زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھے۔

(ii) جن قبائل میں زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد کی تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانی درجے پر تھے۔

(iii) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت کا شدت سے تقاضا کرتے تھے اور زمانہ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو جرم قرار دیتے تھے۔ (صفحہ ۳۰۰ ؛ ۳۲۵)

ان نتائج کو پیش کرنے کے سلسلہ میں وہ لکھتا ہے کہ

نفسیاتی تحقیق سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔ (صفحہ ۳۱۷)

اس کے برعکس؛

جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلاقیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کے لئے توانائی ہی باقی نہ رہی۔ (صفحہ ۳۰۸)

وہ اپنی کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے :-

اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدتِ مدید تک، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیقِ نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوات دے اور پھر اپنے معاشرتی اور معاشی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع ایک مدتِ مدید تک، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح معاشرہ کا رُخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔ وہ تمدن و تہذیب کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا جس پر آج تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اور انسانی توانائیاں اس کی ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی جو اس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آ سکتا۔

(صفحہ ۴۳۲)

قرآنِ کریم، عورت کو معاشرہ میں صحیح مساواتی مقام دے کر، جنسی تعلقات پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جن سے انسانی معاشرہ، ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے، بلند سے بلند تر سطح تک پہنچتا چلا جاتا ہے۔ (۸۳/۱۹)